إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبیؐ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ششم

مشتمل بر تعلیمات اخلاق

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے

تالیف

سید سلیمان ندوی

باہتمام مسعود علی ندوی

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

طبع اول

سنہ ۱۳۵۷ھ
۱۹۳۸ء

Ch
19
CHECKED 1995

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد ششم

مضمون	صفحہ

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب

اخلاقی تعلیمات کی قسمین،

حقوق و فرائض

فضائلِ اخلاق
۲۴۵ - ۴۰۶

رذائل
۴۰۷ - ۵۵۲





الحمد لله الذی انزل الکتاب والحکمة والصلوٰة والسلام علی رسوله

نبی الرحمة وعلی اٰله واصحابه اولی العزم والهمة

اے تو، بہ بہین صفت سزاوار — نامِ تو گرہ کشاے ہر کار

اے کردہ ز گنج خانۂ راز — بر آدمیان درِ سخن باز

عالم ز تو شد بحکمت آباد — حکمت ز تو یافت آدمی زاد

در قربتِ حضرتِ مقدس — پیغمبرِ پاک رہبرم بس

گنجینۂ کیمیاے عالم — پیش از ہمہ پیشواے عالم

نامش بسریرِ پادشاہی — توقیعِ سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ اُن اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح مین ہے جو رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مسلمانون کو بتائی اور سکھائی گئین، یہ عجیب بات ہی کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت مین اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہی، عملی حیثیت

سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہین، اسی لئے عوام کے اس وہم کو دُور، اور قومون کی ترقی وتہذیب مین اخلاق کی صحیح اہمیّت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق مین اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے،

کتاب مین اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ **اسمائے حسنیٰ** کا پرتو ہین، بار بار اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ بات ذہن مین رہے کہ کوئی مخلوق خالق تعالیٰ کی کسی صفت مین برابر کا شریک نہین ہو سکتا، ایسا سمجھنا سر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدا تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہین، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہین ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے، مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہدیتے ہین، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا مین ہے، بندہ مین نہین لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ مین ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہدیتے ہین[1] ورنہ درحقیقت ان دونون مین کوئی نسبت ہی نہین، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لئے بہت سے اہلِ حق اور اہلِ تحقیق کے نزدیک ان دونون مین اوصاف کا اشتراک، اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ، (شوریٰ - ۲)

کتاب مین چند موقعون پر مختلف مذہبون سے اسلام کا موازنہ کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے مقصود وہ تعلیمات وہدایات ہین جو آج اُن کی طرف منسوب صحیفون مین پائی جاتی ہین، یا اُن کے موجودہ پیروؤن کی طرف منسوب کرتے ہین، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبرِ صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے، اور نبوت کے جس دور مین جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لئے بالکل مناسب تھی، یہان تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ کی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص۲۰ مطبوعہ مدینہ بجنور،

ہمیشہ کے لئے تکمیل فرمادی گئی،

کتاب مین کہین کہین فقہی مسئلے آگئے ہین، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات مین الجھا نہین گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہہ ہو تو ضروری ہی کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابون مین دیکھ لیا جائے،

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے، کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس مین اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کیگئی ہے، پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت صلعم کے طریقۂ تعلیم کی کچھ خصوصیتین گنائی گئی ہین، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانون سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کیگئی ہے،

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیقِ کار مولانا عبد السّلام صاحب ندوی نے لکھے ہین، جن کو مین نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گذار ہون،

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط، اور مصالح و حکم کی تشریح مین اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو و خطا انسان کی فطرت ہی، پھر کیونکر دعویٰ کرون کہ اس سے میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے،

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو مدت سے خواب مین نہین دیکھا تھا اس حصہ کے جب آخری ابواب زیرِ ترتیب تھے تو مین نے اُن کو خواب مین دیکھا، کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہین، اور وہ اُسکا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہین اور مسکرا رہے ہین، رحمہ اللہ تعالیٰ،

دعا ہی کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے، اور ابنائے ملت مین اس آئینۂ محمدیؐ کو دیکھکر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے، اور وہ سمجھین کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی علی نشانی اسلام کی روشنی مین اخلاق و عادات کی درستی ہی،

طالبِ رحمت
سید سلیمان ندوی

۴ ر ذیحجہ ۱۳۵۶ھ

غلط نامہ

سیرت جلد ششم

کتاب کی تصحیح مین پوری کوشش کیگئی پھر بھی کچھ غلطیان رہ گیئن مہربانی فرماکر اُن کو درست کرلین،

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۶	۱۱	کالاگ	کی لاگ	۲۰۹	۱۰	مراسم لی اصلاح کی	مراسم کی اصلاح کی،
۸۲	۶	پا	یا	۳۰۷	۱۳	نعم النساء الانصار	نعم النساء نساء الانصار
۱۰۰	۸	ہونا	×	۳۲۲	۲	مولہ	مولدہ
۱۰۱	۱۰	صَنْبْرًا	صُبْرًا	۳۴۴	۵	یُغْفِرَاللّٰہ	یَغْفِرَ اللّٰہُ
۱۱۳	۱۱	اور	×	۳۴۴	۱۶	وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْحُسِنِیْنَ	وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ
۱۸۱	۵	ریڑھ کی ہڈی	پسلی	۳۰۵	۱۹	الَّذِیْنَ کَفَرُو	الَّذِیْنَ کَفَرُوا
۱۹۳	۱۱	الجُنُب والصاحب بالجنب	والجار الجُنُب والصاحب بالجنب،	۴۰۱	۶	پر۱۹	پروا
				۴۴۷	۵	ہین	ہے
۲۰۴	۲۰و۱۴	ابوالدرداح	ابوالدحداح	۴۶۶	۱۰	سے	سکے
۲۱۲	۱۶	من کان اللہ فی حاجۃ	من کان فی حاجۃ				
۲۱۴	(حاشیہ)	کہ	×				

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی کی کتاب کا تیسرا باب **اخلاق** ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں، جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز و رشتہ دار، دوست و احباب سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اُس کے تعلقات ہیں اور اُن تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں،

[illegible] اخلاق کی دولت سے [illegible]

وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتین اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح ازخود انجام دین، توحکومتون کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والون پر اتنا ہو کہ وہ اُن کے قدم کو سیدھے راستہ سے بہکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبون نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے، اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے، آیندہ ابواب مین اسلام کی انہی کوششون کا جائزہ لینا ہے، اور محمد رسول اللہ صلعم نے اس باب مین جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے،



اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس مین شک نہین کہ دُنیا کے سارے مذہبون کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی مین جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی، اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی، اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح، اس باب مین بھی محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپنے ارشاد فرمایا،

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ، مین حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہون

(موطا مالک حسن اخلاق)

یہ امام مالکؒ کی موطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعدؒ وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہین، آپنے فرمایا،

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ، مین تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کرون[1]

چنانچہ آپنے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ مکہ ہی مین تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لئے مکہ بھیجا، انھون نے واپس آکر اُس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ مین اطلاع دی وہ یہ تھے،

رَأَیْتُہٗ یَأْمُرُ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ،[2] مین نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگون کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ [2] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ مصر،

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ مین نجاشی نے جب مسلمانون کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیار رضؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہین؛

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتون کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریان کرتے تھے ہمسایون کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستون کو کھا جاتے تھے اس اثنار مین ایک شخص ہم مین پیدا ہوا . . . . اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھرون کو پوجنا چھوڑ دین سچ بولین، خونریزی سے باز آئین، یتیمون کا مال نہ کھائین، ہمسایون کو آرام دین، عفیف عورتون پر بدنامی کا داغ نہ لگائین" [1]

اسی طرح قیصر روم کے دربار مین ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت صلعم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس مین یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کیساتھ لوگون کو یہ سکھاتے ہین کہ "وہ پاکدامنی اختیار کرین سچ بولین اور قرابت کا حق ادا کرین" [2]

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت صلعم کی تعریف مین یہ کہا ہو کہ،

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ — یہ پیغمبر ان اَن پڑھ جاہلون کو پاک صاف کرتا، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا ہو" (جمعہ-۱)

اس آیت مین دو لفظ فیصلہ کے قابل ہین، ایک پاک وصاف کرنا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہو اور دوسرا حکمت

"تزکیہ" کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہین، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی مین استعمال کیا ہو کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستون اور آلودگیون سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کرکے اس مین صیقل اور جلا پیدا کر دیا جائے، سورۂ والشمس مین ہو،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا — قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا پھر اس مین

[1] ابن حنبل جلد اصفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد ج ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت [2] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد

وَتَقْوٰىهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا، (شمس)	اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا، اور جس نے اسکو مٹی مین ملایا وہ ناکام رہا،

دوسری جگہ ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ)	بے شبہہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی،

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکّی کے لفظ سے ادا کیا ہے،

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى، اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (عبس)	پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منھ موڑا، کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا، اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا، یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اُس کے کام آتا،

ان آیتون سے اندازہ ہوگا کہ قرآنِ پاک مین اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے، جس کو اُس نے پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلعم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دین، اُن کو برائیون اور نجاستون کی آلودگیون سے پاک کرین، اور اُن کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائین، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونون آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے،

۲۔ حکمت، اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ مین کی جاچکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرانِ پاک مین جہان اُس علم و عرفان کے معنی مین ہے جو نورِ الٰہی کی صورت مین نبی کے سینہ مین ودیعت رکھا جاتا ہے، اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت مین ظاہر ہوتے ہین، وہین اس کا دوسرا اطلاق اِس علم و عرفان کے

اُن عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن مین بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہی، قرآن مین دو موقعون پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت مین کون کون باتین داخل ہین، سورۂ بنی اسرائیل مین توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم قرابتدارون اور محتاجون کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کے جان لینے اور یتیمون کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفاے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہی اس کے بعد ارشاد ہی،

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (ع) یہ حکمت کی اُن باتون مین ہی جن کو تیرے ربنے تجھ پر وحی کیا

سورۂ لقمان مین ہے کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (ع) اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتین سکھائین کہ خدا کا شکر ادا کر،

اس کے بعد حکمت کی ان باتون کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگون کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتون مین استواری اور ضبط دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز مین باتین کر، ان آیتون سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح مین اُن فطری امور خیر کو بھی، جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قومون اور مذہبون مین مسلّم ہے، اور جن کو دوسرے معنی مین اخلاق کہہ سکتے ہین، "حکمت" کہا گیا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحی محمدی کتاب اور حکمت دونون پر برابر مشتمل ہی یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مین عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ مین نہین، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہی، فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو

وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (حج) نیکی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ،

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدی کے جسم کے دو بازو ہین، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا، اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو، عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہو، اخلاق حقوقِ عباد، یعنی باہم انسانون کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے، اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہین، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہو، اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہین ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیئت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانون کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ مین نہین بلکہ اُن بندون کے ہاتھون مین رکھی ہے، جن کے حق مین وہ ظلم اور تعدّی ہوئی ہو، اور ظاہر ہے کہ اُن سے اس رحم و کرم کی توقع نہین ہوسکتی جو اُس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہو، اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو، تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیئے کہ اسی دنیا مین وہ اُس (مظلوم بھائی) سے اُس کو معاف کرالے، ورنہ وہان تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہونگے، ظالم کی نیکیان مظلوم کو مل جائین گی، اور نیکیان نہ ہونگی تو مظلوم کی بدیان، ظالم کے نامۂ اعمال مین لکھ جائین گی[1] ایک اور حدیث مین ہے کہ قیامت مین نامۂ اعمال کی تین فردین ہونگی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کریگا، دوسری وہ جس مین سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑیگا، اور تیسری وہ جس مین سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہون گے وہ شرک ہے، اور جس فرد کی کوئی پرواہ اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے، اور جس کا معاملہ خود اُس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اسکے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا، اور بخش دیگا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہین سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہو (مستدرک حاکم عن عائشہؓ)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ صفحہ ۹۶۷،

اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی مین جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؛[1] چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اُس وقت تک بندہ پر عائد نہین کی ہے جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے، اور زکوٰۃ بندہ کے اُسی مال مین فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اُس وقت تک بندہ پر واجب نہین کیا، جب تک وہ بندون کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا،

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق

بعض اُن حدیثون کی بنا پر جن مین اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونون پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت مین اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہین دی گئی ہے، اور بے سمجھ واعظون کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی مین اور اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع مین ہم یہ بتا چکے ہین کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآنِ پاک مین یہ نکتہ ہر جگہ نمایان طریقہ سے واضح کردیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اُس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتون سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے، کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف طریقون سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسرون کی امداد کا وسیلہ ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چارون ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہون، مگر ان کے بنیادی مقاصد مین اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل، اور عبادت کے جوہرِ معنی سے یکسر خالی اور معرّا ہین، وہ درخت ہین جنین پھل نہین، وہ پھول ہین جنین خوشبو نہین، اور وہ قالب ہین جن مین روح نہین، قرآنِ پاک اور تعلیمِ نبویؐ کے جو اشارات اس باب مین ہین، حضراتِ صوفیہ نے اپنی تالیفات مین اُن کی پوری تشریح کردی ہے،

امام غزالی احیاء العلوم مین لکھتے ہین،

---

[1] یہ اصولِ فقہ کا مسلّمہ مسئلہ ہے، دیکھو ہدایہ کتاب الحج صفحہ ۲۱۳، مرتبہ مولانا عبد الحیٔ مرحوم،

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو، اور فرمایا کہ بھولنے والون میں نہ ہو، اور فرمایا کہ نشہ کی حالت مین اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہین جنھون نے گو شراب نہین پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہین تو نہین جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہین، آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن مین کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دیگا، پھر فرمایا کہ نماز عاجزی، فروتنی، زاری دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے، اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ!" جس نے یہ بات نہین پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے، اور اگلی کتابون مین ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین ہر ایک کی نماز قبول نہین کرتا ہون اس کی نماز قبول کرتا ہون جو میری بڑائی کے سامنے سرنگون ہو، میرے بندون پر اپنی بڑائی نہین جتاتا، اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے: اور آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ نماز اسی لئے فرض کی گئی، اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ خدا کی یاد کیجائے: تو اگر دل مین یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یاد الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جسکی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔[1]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثون نے اپنی کتابون مین بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) مین ان تمام روایتون کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت مین الفاظ یہ ہین، کہ جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہین[2]۔ اسی قسم کے الفاظ روزون کے متعلق آپ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ روزہ رکھکر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[3]۔ ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے؛

اخلاق حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل

[1] جلد اول باب فضیلۃ الخشوع [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ، [3] صحیح بخاری و جامع ترمذی، و ابو داؤد و ابن ماجہ کتاب الصوم،

کے اندر کی بات ہے، جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں، اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر اُن کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا،

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ	بے شبہہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نمازمیں
خَاشِعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ	خضوع وخشوع کرتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں
وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ	کرتے، اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں
لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ،	کی حفاظت کرتے ہیں۔ . . . . . .
وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ،	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (مومنون) اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں،

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، اُن میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفاے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے،

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے، تقویٰ ہے، وحیِ محمدی نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے وہ ہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں،

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم طرف
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	کرو، بلکہ اصل نیکی اسکی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور مال کی خواہش کے
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ	کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو، اور
وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ	غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا، اور نماز ادا کرتا رہا اور

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَ	زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدہ کو پورا کرتے
الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ	ہین، اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی مین ثابت قدم
الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط	رہتے ہین، یہی وہ ہین جو راستباز ہین، اور یہی
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، (بقرہ-۲۲)	تقویٰ والے ہین،

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اُسی طرح اُن کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفاے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہین،

اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف،

محمد رسول اللہ صلعم کی پاک تعلیم مین خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہون، اور وہی باتین خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہین،

چنانچہ سورۂ فرقان مین ارشاد ہوا،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ	اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہین، جو زمین پر دبے پاؤن
هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا	چلتے ہین، اور جب ناسمجھ لوگ اُن سے بات کرین تو
سَلٰمًا، وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا	وہ سلام کہین، اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی
وَّقِیَامًا، وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ	خاطر قیام اور سجدہ مین رات گذارتے ہین، اور جو کہتے
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا،	ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنّم کا عذاب دور
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا، وَالَّذِیْنَ	کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے، اور جہنم بُرا ٹھکانا
اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ	اور مقام ہے، اور جو خرچ جب کرتے ہین، تو نہ
بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ	فضول خرچی کرین اور نہ تنگی کرین، بلکہ ان دونون
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	کے بیچ سے وہ سیدھے گذرین، اور جو خدا کے ساتھ
الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ج	کسی اور خدا کو نہین پکارتے، اور جو کسی جان کا بے گناہ

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا . . . . . .
. . . .
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا
بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا، وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ
اِمَامًا، (فرقان ۶)

خون نہین کرتے جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری
کرتے ہین، کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا. . . .
اور جو جھوٹے کام مین شامل نہین ہوتے، اور جب کسی لغو
بات پر سے گذر رہے ہون تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے
ہین، اور جب خدا کی نشانیان اُن کو سنائی جائین تو وہ
اندھے اور بہرے نہ ہو پڑین اور یہ دعا مانگتے ہین کہ اے
ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچون سے آنکھ کی ٹھنڈک
بخش اور ہم کو پرہیزگارون کا پیشوا بنا،

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت مین عفو و درگذر میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا، اور مکر و زور مین شریک نہ ہونا وغیرہ، اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہین،

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہین، محمد رسول اللہ صلعم کی زبانی اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہین،

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ
كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ
يَغْفِرُوْنَ، وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ
يَنْتَصِرُوْنَ، وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہین اور جو بڑے بڑے
گناہون اور بے حیائی کے کامون سے پرہیز کرتے ہین
اور جو غصہ کی حالت مین معاف کرتے ہین اور اپنے پروردگار
کی پکار کا جواب دیتے ہین، نماز ادا کرتے ہین، اور اُن کے
کام باہم مشورہ سے ہوتے ہین، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے
اس مین سے کچھ خدا کی راہ مین دیتے ہین، اور جب اُن پر
چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہین، اور برائی کا بدلہ ویسی ہی

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ، اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ،

(شوریٰ ۴)

برائی ہو، تو جو کوئی معاف کرے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والون کو پیار نہین کرتا، اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہین ملامت تو اُن پر ہے جو لوگون پر از خود ظلم کرتے ہین اور زمین مین ناحق فساد مچاتے ہین اُن کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے، اور بے شبہہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کرے اور سہ لے تو یہ ہمت کے کام ہین

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ،

(آل عمران ۱۴)

جنت ان پرہیزگارون کے لئے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونون حالتون مین خدا کی راہ مین کچھ خرچ کرتے ہین اور جو غصہ کو دباتے ہین اور لوگون کو معاف کرتے ہین اللہ خدا اچھے کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے،

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ،

(قصص ۶)

یہ وہ ہین جن کو دُہرا ثواب ملیگا، اس لئے کہ انھون نے صبر کیا، اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہین، اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ خدا کی راہ مین خرچ کرتے ہین، اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہین تو اس سے کنارہ کر لیتے ہین اور کہدیتے ہین کہ ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمھارے لئے تمھارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم ناسمجھون کو نہین چاہتے،

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا، (دھر ۱)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہین،

ان آیتون کی اور اسی قسم کی دوسری آیتون کی جو تشریح آنحضرت صلعم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی، وہ احادیث

مین محفوظ ہے، ہم ان حدیثون کو مختلف عنوانون کے نیچے یہان لکھتے ہین، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلعم کے تعلیمی نصاب مین اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہی؟

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام مین

اسلام مین اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نماز مین جو دعا مانگتے تھے، اُس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا،

وَاھْدِنی لاحسن الاخلاق لایھدی لا حسنھا	اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر،
اِلّا انتَ واصرفْ عنّی سیئاتھا لایصرفْ	تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہین دکھا سکتا، اور
عنّی سیئاتھا الا انتَ، (مسلم باب الدعاء فی الصلٰوۃ)	برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو نہین پھیر سکتا لیکن تو،

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسنِ اخلاق ہی،

ایمان سے بڑھ کر اسلام مین کوئی چیز نہین لیکن اُس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہی، فرمایا،

اکمل المؤمنین ایمانًا احسنھم خلقًا،	مسلمانون مین کامل ایمان اس کا ہی جسکا اخلاق سب سے اچھا ہے،

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان مین ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مین ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھرایا گیا ہی وہ حسنِ اخلاق ہی کہ یہی وہ پھل ہی جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہی،

اسلام مین نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہی وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی اُن کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا،

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہی جو دن بھر روزہ
قائم اللیل وصائم النھار،	رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے،

یہ حدیث چند ہم معنی لفظون کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی مین ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازون مین رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزون مین دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل

ہوسکتا ہی، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہوسکتا ہی، حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہی،

اسلام مین اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانون مین درجہ اور رتبہ کا فرق نمایان ہوتا ہی، فرمایا،

خیارکم احسنکم اخلاقًا (بخاری کتاب الادب) — تم مین سب سے اچھا وہ ہی جس کے اخلاق سب سے اچھے ہون،

ایک اور حدیث مین ہی،

ما من شئی یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فانّ صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلوٰة، — (قیامت کی) ترازو مین حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسنِ اخلاق والا، اپنے حسنِ خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کرسکتا ہی،

یہ حدیث ترمذی مین انہی الفاظ کے ساتھ ہی، لیکن حدیث کی دوسری کتابون (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) مین مختصرًا صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو مین نہین، اس حدیثِ نبوی نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان مین حسنِ اخلاق سے زیادہ گران کوئی چیز نہین ایک اور حدیث مین ہی کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس مین حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے،

خیر ما اعطی الناس خلق حسن، — لوگون کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزین عطا ہوئین اُن مین سب سے بہتر اچھے اخلاق ہین،

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ مین ہی، اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتون سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث مین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

احبّ عباد الله الی الله احسنهم اخلاقًا، (طبرانی) — اللہ کے بندون مین اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہون،

اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہی اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہی، فرمایا،

ان احبّکم الیّ واقربکم منّی فی الآخرة مجالس — تم مین میرا سب سے پیارا اور نشست مین مجھ سے سب سے نزدیک

محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الیّ وابعدکم منّی فی الاٰخرۃ مساویکم اخلاقاً۔ (ابن حنبل و طبرانی و ابن حبان) | وہ ہین جو تم مین خوش خلق ہین، اور مجھے ناپسند اور قیامت مین مجھ سے دور وہ ہون گے جو تم مین بداخلاق ہین،

آنحضرت صلعم کے عہد مبارک مین دو صحابی بیویان تھین، ایک رات بھر نماز پڑھتین، دن کو روزہ رکھتین اور صدقہ دیتین، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیون کا دم ناک مین کئے رکھتی تھین، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتین اور غریبون کو چند کپڑے بانٹ دیتین، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتین، آنحضرت صلعم سے ان دونون کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ اس مین کوئی نیکی نہین، وہ اپنی اس بدخلقی کی سزا بھگتیگی، اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی[2]" ان دونون بیویون کی سیرتون کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہین، وہ اسلام مین اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایان کر دیتے ہین،

حضرت براء بن عازب رض کہتے ہین کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت کو لیجائے، فرمایا، انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کرسکے، تو بھوکے کو کھلا، اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا، اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کرسکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک[3]" غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاق عظمت کو کہان تک بڑھا رہی ہی،

ایمان کے اوصاف و لوازم ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثین ہین جنمین آنحضرت صلعم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلان فلان اوصاف و اخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہین، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات مین زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا مین زیادتی و کمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا ہمیانہ اور پیمانہ ہین، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعون سے کیا جائے گا، آپ نے فرمایا،

۱۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخین ہین، جنمین سے ایک حیا ہے،

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال جلد ثانی، کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہین، [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لایوذی جارہ،

[3] مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۳ صفحہ ۲ حیدرآباد دکن،

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخین ہین جنین سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے، اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو، (تاکہ تمھارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳۔ جس مین تین باتین ہون، اُس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو خدا اور اُس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر مین مبتلا ہو جانے سے اُتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ مین پڑنے سے

۴۔ جس مین یہ تین باتین ہون، اُس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاح کے باوجود جھوٹ نہ بولنا، اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہین سکتا تھا،

۵۔ تین باتین ایمان کا جز ہین، مفلسی مین بھی خدا کی راہ مین دینا، دنیا مین امن اور سلامتی پھیلانا، اور خود اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی انصاف کرنا،

۶۔ تم مین سے کوئی اُس وقت تک کامل مومن نہین ہو سکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے،

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہین، اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسا کرین کہ اپنی جان و مال اس کی امانت مین دے دین،

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ صلعم! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکون کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا، (سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسول! اسلام کیا ہے، فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا، پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا، (سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسرون سے الفت کرتا ہے، اور جو نہ دوسرے سے اُلفت کرتا، اور نہ کوئی اس سے اُلفت کرتا ہے، اس مین کوئی بھلائی نہین،

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے، اور نہ گالی دیتا ہے، اور نہ بد زبان ہوتا ہے،

۱۲- ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم وہ کرے، اور نہ اُس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد مین ہوگا، خدا اس کی مدد مین ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کریگا، تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائیگا،

۱۳- مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھین مسلم وہ ہین جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہین مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ مین میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت مین نہین جاسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو،

۱۴- جو صاحب ایمان ہے اُس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے،

۱۵- بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کیجائے تو خیانت کرے،[1]

ان مذکورۂ بالا حدیثون مین سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہئے، کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے،

اخلاقِ حسنہ، صفاتِ الٰہی کا سایہ ہین،

لیکن اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے، کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہین، اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہین، حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے، ہم انھی اخلاق کو اچھا کہتے ہین جو صفاتِ ربانی کا عکس ہین، اور انھی کو برا کہتے ہین جو خدا کی صفات کے منافی ہین، البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتین ایسی بھی ہین جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہین اور جن کا تصور بھی دوسرے مین نہین کیا جاسکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پرجلال صفتین بھی ہین جو صرف خدا ہی کو زیبا ہین، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ مین کمال یہ ہے، کہ اُن کی مقابل کی صفتین

[1] یہ تمام حدیثین معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان مین موجود ہین، ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال مین ہر قسم کی حدیثین ہین، مگر ہم نے ان کے انتخاب مین مشہور و معتبر حدیثون کو ترجیح دی ہے،

اس مین پیدا ہون، خدا کی کبریائی کے مقابلہ مین بندہ مین خاکساری اور تواضع ہو، اور خدا کی بلندی کے مقابلہ مین بندہ مین پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے، کہ وہ صفات الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب وفیض مین ترقی کرینگے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہیگا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل[1] ہے، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہین،

اخلاقی معلّمون مین آنحضرت صلعم کا امتیاز

دنیا مین اخلاق کے بڑے بڑے معلّم پیدا ہوئے جن کے مکتب مین آکر بڑی بڑی قومون نے ادب کا زانو تہ کیا، اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کئے جو سینکڑون اور ہزارون برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک انکو یاد ہین، اور سچ یہ ہے کہ آج جہان کہین بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتادیگی کہ ان اخلاقی استادون مین باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولون پر مبنی ہے، اور ان مین درسگاہِ عالم کے سب سے آخری معلّم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے،

آنحضرت صلعم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلّمین کی دو جماعتین ہین، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی خاص مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا علیہم السّلام، اور بعض مذہبون کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل ودانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان مین سے اوّل کو انبیاء اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کرسکتے ہین، ان دونون جماعتون نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبرون اور مذہب کے بانیون نے اپنی تعلیمات کا ماخذ حکم خداوندی کو قرار دیا، اس حکم وفرمانِ الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہین، نہ ان کی تعلیمات مین علت ومعلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتون کی گرہ کشائی ہے، اور نہ ان احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتون اور عقلی حکمتون کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات مین علت و

---

[1] ہم نے اسماے الٰہی کی بحث مین اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کردی ہے، دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اوّل صفحات ۳۸۲ - ۴۰۵،

معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض وغایت کی تعین، قوائے عملی کی تحدید یہ سب کچھ ہے، مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یار ما این دارد و آن نیز ھم،

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم مین حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربّانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونون کی آمیزش ہے،

انبیاؑ اور حکما مین جو اصلی فرق وامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاؑ کی اخلاقی تعلیمات کیساتھ ساتھ اُن کی معصوم زندگی اُن کے مقدس کارنامے، اور اُن کے پاک اثرات ہوتے ہین جن کا فیض اُن کے ہربُنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بنکر نکلتا ہے، اور پیاسون کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جسکی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے، اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اُس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسرون کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہین آتا، وہ دوسرون کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی ہر راہ مین بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم ومحبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبون پر رحم کھانا اور دشمنون سے محبت کرنا وہ نہین جانتا، وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راستباز نہین ہوتا،

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہین، اس لئے اس کے منھ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہین بناتی، بلکہ ہوا کے تموّج مین مل کر بے نشان ہو جاتی ہے، اور انبیا علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہین وہ کرتے بھی ہین، جو اُن کی تعلیم ہے، وہی اُن کا عمل ہے، جو اُن کے منھ پر ہے وہی دل مین ہے اس لئے اُن کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بنکر اڑتا اور ہمنشینون کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاؑ اور حکما، یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام، اور سقراط، افلاطون اور ارسطو مین نمایان ہے، سقراط اور افلاطون

کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں تو مون کی قومیں ہیں، جو موسیٰ عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہونچیں اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے،

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکسان نہیں ہیں، بلکہ اُن کے مختلف مدارج ہیں، اُن کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کیساتھ ضرورت یہ ہے کہ اُن کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق، اور اہل صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق اُن کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں، اور پھر وہ واقعات تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اُس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لئے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے،

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو،

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو،

(۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو،

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے، جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، اُن غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے، اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں، اور کیا

ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی ؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس ۳۳ برس کی زندگی مین سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے[1] ان تین برسون کے حالات مین سے بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت مین کیا ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ اُن کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ مین نہین ؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیون کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دنیا مین کوئی سامان ہی موجود نہین کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا مین محفوظ اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ بیان (سیرتِ محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جس مین محمد کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے،[2] آنحضرت صلعم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت مین کرتے دیکھو اس کو جلوت مین برملا بیان کرو، جو حجرہ مین کہتے سنو اس کو چھتون پر چڑھکر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب،

قول کے ساتھ عمل | اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے ان مقدس ہستیون کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی مین کوئی شبہہ نہین لیکن کیا دنیا کو خود اُن بزرگون کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے ؟ کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتین سچائی اور راستبازی کی نصیحتین لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلون سے بھری ہوئی تقریرین دنیا نے سنین، اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن مین ہے مگر کیا اس کی آنکھون نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالین بھی دیکھین کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ سب کچھ جو تمھارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ مین لٹا نہ دو[3] آسمان کی بادشاہت مین داخل نہ ہو گے؟ کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ مین لٹایا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ص ۱۰۰، [2] انجیل،

"شریرون کا مقابلہ نہ کرو" کیا اس نے خود بھی شریرون کا مقابلہ نہین کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنون کو بھی پیار کرو" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا، وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمھارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایان گال بھی اسکے سامنے کردو" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمھارا کرتہ مانگے، تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور مین آئی؟ ہم یہ نہین کہتے کہ حضرت مسیح مین یہ صفتین موجود نہین بلکہ یہ کہنا ہے، کہ انجیل نے اُن کی اس حیثیت کو محفوظ نہین رکھا ہے،

مگر اسلام کے اخلاق معلمؐ کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کرکے دکھایا، اسکا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیون کو طعنہ دیا، کہ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (بقرہ ۵-۵) (کیا اورون کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانون کو متنبہ کیا کہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ، (صف) (تم کیون کہتے ہو جو کرتے نہین، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہان کہ کہو وہ جو نہ کرو)

ایک شخص نے آکر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلعم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا، کیا تم نے قرآن نہین پڑھا، کان خلقہ القرآن[1]، جو قرآن مین الفاظ کی صورت مین ہے، وہی حالِ قرآن کی سیرت مین بصورت عمل تھا، اگر غریبون اور مسکینون کی امداد و اعانت کا حکم دیا، تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، اور دوسرون کو کھلایا، اگر آپ اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کیا، کھانے مین زہر دینے والون سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہین لیا، جنھون نے آپ پر تیر برسائے اور تلوارین چلائین، مسلح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہین اٹھایا، کپڑون کی شدید ضرورت کے وقت مین بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کردی، سیرت کی دوسری جلد مین یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کرچکے ہین، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانون کو اپنے ہادیون اور رہنماؤن کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہین، اور اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، اور مسلمان اپنے پیغمبر

[1] ابود باب م اللیل

کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونون اور کارنامون کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے معصرون کے سامنے پیش نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھکر بلا خوف وخطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا فرمایا۔

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖٓ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (یونس - ۲) (اے منکرو) مین تو تمھارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہون کیا تم نہین سمجھتے،

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا گیا،

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ۔ (ن - ۱) (اے محمد) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے،

کامل و مکمل اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم مین یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسرون کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصون کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکون کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلمون کی فہرست پر ایک نظر ڈالو کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس مین تھی؟ کیا اس مین جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس مین جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس مین تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا،

يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ، (جمعہ - ۱) وہ اُن کو خدا کی باتین سناتا، اور اُن کو پاک وصاف بناتا، اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

اس تحدی اور اعلان مین یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے، کہ اس مین اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہین ہے کہ وہ لوگون کو کتاب و حکمت کی باتین سکھاتا، اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو اپنے فیض و اثر سے پاک وصاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصون کو کامل گنہگارون کو نیک، اندھون کو بینا اور تاریکون کو روشن بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے

تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی
تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا،

تعلیم اخلاقی کا تنوع اگر کسی معلم مین تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لئے ایک ہی
قوت کے انسانون کی نہین بلکہ سینکڑون مختلف قوتون کے انسانون کی ضرورت ہی، اخلاق کے دوسرے معلمین کی
درسگاہون پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہان صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہین، حضرت موسیٰ
علیہ السّلام کی تربیت گاہ مین فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایان نہین، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے مکتب مین عفو ودرگذر
کے سوا کوئی اور سبق نہین، بودھ کے وہار اور خانقاہ مین دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیرون کے سوا کوئی اور موجود
نہین، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی درسگاہ اعظم مین آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس مین انسانی ترقی کی
ہر قوت نشو ونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے،
اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہین، اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کرتے ہین
آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر،
ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد
عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہین، اور اپنے اپنے
پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہین، مدینۃ النبیؐ کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی
چھت کھجورون کے پتون سے اور ستون کھجور کے تنون سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے
الگ الگ گوشون مین ان انسانی جماعتون کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہین کہین ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ
جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہین، کہین طلحہؓ وزبیرؓ ومعاذؓ یہ وسعدؓ بن معاذ وسعدؓ بن جبیر جیسے ارباب رائے وتدبیر ہین، کہین خالدؓ
ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہین، کہین وہ ہین جو بعد کو صوبون کے حکمران، عدالتون کے
قاضی، اور قانون کے مقنن بنے، کہین ان زہادؓ وعبادؓ کا مجمع ہے جن کے دن روزون مین اور راتین نمازون مین کٹتی

تھین کہین ابوذرؓ و سلمانؓ و ابو درداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہین جو مسیحِ اسلام کہلاتے تھے، کہین وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب مین مصروف رہتے تھے کہین حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلامون کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤن کی محفل ہے، کہین غریبون کی نشست ہے اور کہین دولتمندون کی مجلس ہو، مگر ان مین ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہین پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہین، سب پر توحید کا یکسان نشہ چھایا، اور سینون مین حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجین لے رہا ہے، اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش مین لگے ہین[1]۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لئے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ اخلاق کے کانٹون مین الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اُس وقت سے ہو جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، اُن کے اسباب و علل کی تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق، اور اُن کی غرض و غایت کی تعیین یونانیون کے عہد مین شروع ہوئی، اور موجودہ عہد مین علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریون پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق مین شروع سے آج تک فلسفیون مین قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب مین متعدد نظریئے بنتے اور بگڑتے رہے، اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان مین سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہین تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انھی دو قدیم مسلکون کی تشریح ہین، جنھین یونانی اصطلاح مین "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہو، موجودہ اصطلاح مین پہلے کو

---

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبون پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

"ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یون کہئے، پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے، اور دوسرا "عقل" پر، پھر اس منشاے اختلاف کے تحت مین تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہوگئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے،

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہین، علماے اخلاق کے مختلف فرقون نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہکر الگ الگ اپنے نظریون کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت اُن کی بھی وہی اصلی تقسیمین ہین، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہین، یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لاسکے انھون نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا، اور کسی نے اس سے باہر، جنھون نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھون نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان مین ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان مین ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنھون نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھون نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم، اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم، یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑیگا، جو اخلاق کے اُمّہاتِ مسائل مین کبھی قبول نہین کیا جاسکتا،

بہرحال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہین جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ مین بیان بھی کیا ہے، اور اپنے بندون کی فطرت مین ودیعت بھی رکھا ہے، تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کردے، فلسفیانہ کاوشون اور موشگافیون کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریئے باہم کسی قدر

متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہین، کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکین، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق
کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہون، اسی طرح
معیار اخلاق کے اختلافات مین بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال مین
لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار، یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہوکر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو
پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس مین ملحوظ ہو، اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو،
اسلام کے اخلاقی فلسفہ مین یہ سب جہتین ایک کام مین مجتمع ہوسکتی ہین،

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، خدا کا حکم بھی ہے، اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا
بھی یہی تقاضا ہے، اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت
یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتین بھی ہین، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے،
اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس مین بھی شک نہین کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہوسکتے ہین، جہان خدا، ضمیر، فطرت،
جذبات، اور وجدان کا ایک حکم ہو، اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اسی لئے
اخلاق کے باب مین وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے،

الغرض خدا کے حکم ہونے کیساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ
فطرت کہئے، وجدان کہئے، حاسۂ اخلاقی کہئے، ضمیر کہئے، اس فلسفیانہ تدقیق سے اس کو بحث نہین، اور باوجود اس کے
وہ اُن کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے،
کہ انسان مین زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہین جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیات اقلیم، زبان، مذہب،
رسم و رواج، طرز حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومین بلا دلیل متفق اور متحد ہین، اس لئے
یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت
ہین، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات، اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور

لامسہ کے نام سے الگ الگ جانتے ہین، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہی جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہین، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہین جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو ہر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہو، اور بتاتی ہو کہ یہ اچھا ہی یا برا عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہین رکھتی،

تعلیم محمدی نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہین تفصیلی اور کہین اجمالی اشارات کئے ہین، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہین کیا ہو کہ اخلاق کی خوبی اُن کے علم و فلسفہ مین نہین، بلکہ اُن کے عمل مین ہے، اس لئے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر و قیمت اُس کی نگاہ مین نہین لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اُس نے پسندیدہ نہین سمجھا ہے، اسی بنا پر اُس نے ان اصولون کی طرف اشارے تو کئے ہین، مگر اخلاق کے باب مین اُن کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہین دی ہے،

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھکر ادا کئے جائین کہ یہ خدا کے احکام ہین، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہین، انہی احکامِ الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل مین سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے ہونا چاہئے، ان مین باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی اُسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس حد تک ان مین کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال مین نقص ہوگا، ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کیجائے کہ یہ خدا کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہئے، اُس کا وجدان بھی یہی ہو، اُس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اُس کے کرنے مین وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے، اور اسی کی پیروی مین نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اُسکے ان تمام قوی مین اس بارہ مین باہم موافقت اور یکسانی ہوگی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس قدر اس توافق مین کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے

یا اُس سے اُس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی وایمانی کمال مین نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دین لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہین سمجھتا، اور ہماری عقل اُسکے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے، تو اس کے یہ صاف معنی ہین کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہین ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہی، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے، مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس مین ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر مین ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہین؛

بے غرضی چونکہ اسلام مین اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزون کی طرح عبادت ہی، اس لئے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے، اگر ایسا نہین ہے تو ان کامون مین کوئی نیکی اور ثواب نہین، اور نہ اُن کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کامون کو چھوڑ کر، دنیاوی کامون پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام مین جسقدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہی، اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہی، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کرین، اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چُن دین لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس خاطرداری کی تہ مین ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمایش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ مین بے قیمت ہوجاتی ہے، لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان ونمک ہی رکھدین، تو اس کی وقعت اور قدر وقیمت کی کوئی انتہا نہ رہیگی، تو جب دنیاوی کامون مین اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات ہین تو روحانی عالم مین اُن کے نتائج کہان تک ہونگے!

نیت اسی لئے آنحضرت صلعم نے اپنی تعلیمات مین نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت مین روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہین ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالون سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہوجائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی مین اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اس کو

یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالین گے، یا سخت تکلیف پہنچائین گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے مین بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا، اور وہان اس کو اشرفیون کی تھیلی راستہ مین پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی مین اب بھی کوئی شک نہین، اور یہ نہین کہا جا سکتا کہ اُس نے رات کو اندھیرے مین بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے مین درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ مین کسی گڈھے یا کوئین مین گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی،

ایک دوسری مثال فرض کیجئے میری جیب مین روپیون کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ مین گر گیا، جب مین راستہ سے واپس پلٹا، تو ایک بٹوا پڑا دیکھا، اور دل مین یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے مین کسی برائی کا مرتکب نہین ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا، اور مین نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستہ مین کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت مین اس کا دل گنہگار ہو چکا، اور دوسری صورت مین اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمایش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کرین کہ لوگ آپ کی تعریف کرینگے تو اسلام کی نگاہ مین یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران مین ہے،

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ   جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دینگے اور جو آخرت کا

يُرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آل عمران ۱۵) بدلہ چاہیگا اُس کو وہ دینگے،

ایک اور آیت مین اس کی تصریح کر دی گئی ہو کہ جس کام کا مقصد صرف نمایش اور دکھاوا ہو اسکی حقیقت سرآ سے زیادہ نہین فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ اے ایمان والو تم اپنی خیراتون کو احسان دھر کر اور ستا کر

بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہو جو لوگون کی دکھاوے

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ۔۳۶) کیلئے خرچ کرتا ہو اور خدا اور قیامت پر یقین نہین رکھتا،

اسی قسم کی اور بہت سی آیتین ہین جن کی تفسیر مین آنحضرت صلعم نے یہ مختصر لیکن جامع ومانع الفاظ فرمائے ہین،

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری باب اول) انسان کے اعمال اسکی نیت پر موقوف ہین،

اور اس کی مزید تصریح کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے،

ولکل امرئٍ ما نوی فمن کانت ھجرتہ ہر شخص کے لئے وہی ہو جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی

الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ہجرت خدا و رسول کی طرف ہو تو اُسکی ہجرت خدا و رسول

ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ کی طرف ہو، اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی

یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ[1] عورت کو پانا ہو کہ اُس سے نکاح کرے، تو اُس کی ہجرت

اُسی کی طرف ہو جسکی غرض سے اُس نے ہجرت کی،

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمامتر نیت اور ارادہ پر موقوف ہو اور اسی لئے اخلاق کی بحث مین اسکو خاص اہمیت حاصل ہو، حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی، حسن خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستایش کے حدود سے باہر، اور روحانی خیر و برکت، اور ثواب سے محروم ہوجاتا ہو،

فلسفۂ اخلاق کی تائید | آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے

[1] صحیح بخاری جلد اول باب ماجاء ان العمل بالنیۃ،

بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان، ایس میکنزی، اپنی تصنیف "مینول آف ایتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب مین لکھتا ہے۔

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے یعنی فعلِ ارادی، جیساکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمامتر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہین، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل مین ارادہ شامل نہین اسکی اخلاقی حیثیت نہین۔ . . . . . .

اس مسئلہ کی ایک دو مثالین دیکر کینٹ کی راے نقل کی ہے،

"اسی لئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر مین بلکہ دُنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شئے نہین ہے جس کو علی الاطلاق بلاکسی قید و شرط کے اچھا کہا جاسکے"۔[1]

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمامتر بنا، ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع مین ہون یا تنہائی مین، اندھیرے مین ہون یا روشنی مین تاہم کوئی ہے جس کی آنکھین اُس کے دل کی تہ کو ہزار پردون مین بھی دیکھ رہی ہین، دنیا کی تمام قوتین صرف جسم پر حکمران ہین، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کامون کا جوابدہ ہونا ہے، اور ایک دن آئیگا، جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملیگی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ مین جاگزین نہ ہونگے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لئے وحیِ محمدی نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے، کہ بے اس کے ہر کام

---

[1] علم اخلاق، کتاب اوّل باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

محض ریا اور نمائش بنجاتا ہے، فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم — اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو

بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ — جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ ۳۶) — ہے، اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا،

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ — اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے، اُن کے کام ایسے

يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ — ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے،

لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا، (نور-۵) — جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہیں پائے،

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو،

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن — یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں

فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ — کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں

بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ — اُس کو لہر ڈھانکے ہو، اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس

لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ — پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک، جب

نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ، — اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں، اور جس کو اللہ نے روشنی

(نور-۵) — نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں،

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جزا ہی کا یقین نہ ہو گا دل میں اخلاص اور نفس میں نیاز کی

اغراض سے پاکی پیدا نہین ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہی،

غرض و غایت | اسی لئے آنحضرت صلعم کی شریعتِ کاملہ مین نفس عمل مطلوب نہین بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے، تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہی، روح نہین تو بیجان قالب کس کام آسکتا ہے حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہی کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہین ہوتا لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہین ہوسکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لیکر آج تک بیسیون نظریے قائم ہوچکے ہین لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہین،

اسلام کو اس سے بحث نہین کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہی کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہونی چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ پست اور بلند متعدد غرضین اور غایتین ہوسکتی ہین، ہم راہ مین ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اُتار کر خود اٹھا لیتے ہین اور اُس کو اُس کے گھر تک بآرام پہنچا دیتے ہین، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچکے بڈھا خوش ہوکر ہم کو مزدوری اور انعام دیگا، یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کرینگے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب مین وہ ہم کو اپنی رائے دینگے، یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت مین دیکھ کر ہمین بڑا نیک اور دیندار سمجھین گے، یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی مین اس بوڑھے کی مدد کرین گے تو کل ہمارے بڑھاپے مین کل کے نوجوان ہماری مدد کرینگے، بعض نیک لوگون کو ایسے کامون کے کرنے سے طبعًا خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لئے اس قسم کے کامون کو کرتے ہین، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہین جو ایک بوڑھے کو اس حال مین دیکھ کر ترس کھاتے ہین اور اس سے متاثر ہوکر یہ کام کرتے ہین، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض مختلف اشخاص کے کامون کی غایت اور محرک ہوسکتے ہین لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہین، اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اُسی قدر وہ بلند اور قابلِ قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی

نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے، مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے، مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ مین اس کی فلان ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اسکی نگاہون سے گر جاتی ہے، اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے،

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کامون کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہین لیکن حقیقت در اس مین بھی گو اس دنیا کی نہین لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لئے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدیؐ مین بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہین دی گئی ہے، یہانتک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہین،

طاعت مین تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ　　　دوزخ مین ڈالدے کوئی لیکے بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی مین تمیز کر لیتا ہے، اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب و لاچار آدمی کو دیکھکر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر مین ہے، ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت، یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے مین انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤن لرزتے ہین، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس مین غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار

اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہجاتی ہے، اور اُس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہوجاتا ہے،

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہین؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان مین نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہین، یہ اُس کے نتائج ہین، قرآن کہتا ہے،

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، (الشمس) ہر نفس مین اُسکی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے،

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے، اور جو ہم کو ہمارے ہر بُرے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحیِ محمدیؐ کی اصطلاح مین اُس کا نام نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامت مین ہے،

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، (قیامت-۱) اور قسم کھاتا ہون اُس نفس کی جو انسان کو اسکی برائیون پر ملامت کرتا ہے،

آگے چل کر فرمایا،

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ، وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ، (قیامت-۱) بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانون (کے پردے) ڈال لیتا ہے،

نو اس بن سمعان انصاری ایک سال تک اس انتظار مین مدینہ مین ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلعم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھین، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا، اور انہون نے دریافت کیا، فرمایا، نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل مین کھٹک جائے، اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانین،

اسی طرح وابصۃ بن معبد نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ مین نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چارون طرف جان نثارون کا ہجوم تھا، اور وہ شوق و ذوق مین سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت صلعم نے دیکھا تو فرمایا "وابصہ قریب آجاؤ" جب وہ قریب جاکر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہ مین بتاؤن کہ تم کیون آئے ہو، یا تم بتاؤ گے" عرض کی "حضور ہی ارشاد

فرمائین"۔ فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو"عرض کی "سچ ہی یا رسول اللہ" فرمایا

یا وابصۃ استفتِ قلبك واستفتِ نفسك	اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اپنے نفس سے فتویٰ
البرّ ما اطمأنّ الیہ القلبُ واطمأنّتْ	لیا کر، نیکی وہ ہی جس سے دل اور نفس مین طمانیت پیدا ہو،
الیہ النّفس والاثم ما حاكَ فی القلب	اور گناہ وہ ہے جو دل مین کھٹکے، اور نفس کو ادھیڑ بن مین
وتردّد فی النفس وان افتاك الناس[1]،	ڈالے اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیون نہ بتائین،

یہی وہ حاسئہ اخلاقی ہے، جس کا نام لوگون نے ضمیر کی آواز رکھا ہی؛

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اُس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش مین آکر توبہ و استغفار کرتا ہے، اور پشیمان ونادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہانتک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کرکے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت صلعم نے ان الفاظ مین ادا فرمایا،

انّ العبد اذا اخطأ خطیئۃ نکتت فی قلبہ	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل مین داغ
نکتۃٌ سوداءُ فاذا ھو نزع واستغفر و	کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو
تاب صقل قلبہ وان عاد زید فیھا	علحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی، اور توبہ کی تو اس کا
حتّٰی یعلو قلبہ،	دل صاف ہو جاتا ہی اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو
	داغ بڑھایا جاتا ہی یہانتک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہی؛

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہی جس کا ذکر اس آیت مین ہی؛

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا	کبھی نہین، بلکہ اُن کے (بُرے) کامون کی وجہ سے

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۲۸ مصر،

يَكْسِبُوْنَ[1] (تطفیف - ۱) ان کے دلون پر زنگ چھا گیا ہے،

آنحضرت صلعم نے ایک تمثیل مین فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر اودھر دونون طرف دو دیوارین کھچی ہین، اوران دونون مین کچھ دروازے کھلے ہین لیکن ان پر پردے پڑے ہین راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے، کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، اور ادھر اودھر مڑو نہین جب کوئی راہگیر خدا کا بندہ چاہتا ہے، کہ ان دائین بائین کے دروازون مین سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہین، اور یہ پردے اس کے حدود ہین، اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہی، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے،

ھو واعظ اللہ فی قلب کل مومن[2]، وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب مین ہی،

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہی،

مسرت وانبساط یہ بات کہ نیکی کے کامون سے کرنے والے کو جو خوشی، اور برائی کی باتون سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیون سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمامتر صحیح نہین ہے تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کامون سے حقیقۃً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہین، اور نہ ان کو ہمارے کامون کی غرض وغایت ہونی چاہئے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہین، ایک غریب ولاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض وغایت نہین، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کامون کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول،

[1] جامع ترمذی، تفسیر آیت مذکورہ [2] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد وبیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً،

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکماے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ مین جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے، اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا، اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض وغایت نہین بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علماے اخلاق مین بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہین، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا، اور اُس کو تمہارے
فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ	دلون مین اچھا کرکے دکھایا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی
وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (حجرات ۱)	سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک چلن ہین،

اسی آیتِ پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلعم نے اپنے الفاظ مین اس طرح فرمائی،

اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك	جب تمھاری نیکی تم کو خوشی بخشے، اور تمھاری بدی تم کو
فانت مؤمن[1]،	غمگین کرے تو تم مومن ہو،
من سرته حسنته وساءته سيئته فهو	جس کو نیکی کی خوشی اور برائی غمزدہ بنائے، وہ
مومن[2]،	مومن ہے،
من عمل سيئة فكرهها حين يعمل وعمل	جس نے جب کوئی برائی کی، تو اس کو اس سے سخت
حسنة فسر فهو مومن[3]،	نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اسکو مسرت ہوئی وہ مومن ہے

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق مین سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لئے بھی قدم رکھنے کی گنجایش

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و ۲۵۶ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۴ حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۳ مطبع سعادت مصر و ابن حبان و ابوداؤد عن عمر بن الخطاب، [2] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال جلد اول صفحہ ۲۷،
[3] مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۳ حیدرآباد،

باقی رکھی ہی، اور پیغمبرِ اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اُسکی تصحیح فرمادی ہے،

رضاے الٰہی

اسلام مین ہر قسم کے نیک کامون کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے، اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہین آکر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایان ہوتا ہے، حکماے اخلاق یہ ڈھونڈھتے ہین کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے، اور معلّمِ حکمت علیہ السّلام تعلیم دیتے ہین کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتین ہین، جان اور مال، اور انہی دونون کو خدا کی راہ مین خرچ کرنا، ایثار اور حسنِ عمل ہی، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (بقرہ)

بعض ایسے ہین جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کے لئے بیچتے ہین، اور اللہ بندون پر مہربان ہی،

پھر مال کے متعلق فرمایا،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ، (بقرہ-۳۶)

اور اُن کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہین،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، (بقرہ-۳۷)

اور تم تو خرچ نہین کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر،

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ، (نسآء-۱۰)

اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لئے کریگا، تو ہم اُسکو بڑا اجر دینگے،

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ

اور جنھون نے خدا کے لئے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو اُن کو دیا ہی اس مین کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا، اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہین، انہی کے لئے

السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد-۳) ہے پچھلا گھر،

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل مین کھولی گئی ہی،

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ — جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوے دیتا

مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ — ہے کسی کا اس پر احسان نہین ہے جس کو ادا کرنے کے

الْاَعْلٰى، (لیل) — لئے دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے لئے دیتا ہے،

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلعم نے متعدد احادیث مین فرمائی ہی ایک صحابی پوچھتے ہین یا رسول اللہ کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لئے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لئے کہ اُس کو شہرت حاصل ہو، تو ان مین سے راہِ خدا مین لڑنا کس کو کہین گے، فرمایا "اس کو جو اُس لئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو[1] ایکدفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لئے اجر کا موجب، کسی کے لئے پردہ پوش، اور کسی کے لئے گناہ ہی، اجر کا موجب اس کے لئے ہی جو خدا کی راہ مین اس کو باندھتا ہے، تو اُس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لئے ہے جو ضرورةً اس لئے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسرون سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اُس کے لئے ہی جو فخر اور نمائش کے لئے باندھتا ہے[2]۔

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے، اور جس کو وہ ہر بار کہتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گر پڑے، اور جس کو سنکر حضرت معاویہؓ زار زار روئے، حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اتریگا، اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے، اور جو جہاد مین مارے گئے

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۹۴ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوة فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوة،

تھے، اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا، کیا مین نے تجھ کو وہ سب نہین سکھایا جو اپنے پیغمبرؐ اتارا تھا تو تم نے اُسپر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کریگا، بارِ الٰہا مین شب و روز نماز مین قرآن پڑھتا تھا، خدا فرمائیگا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہینگے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائیگا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہین کہ تو بڑا عالم اور قرآن خوان ہے، تو دنیا مین تجھ کو یہ کہا جاچکا، (یعنی تو اپنا بدلہ پاچکا) پھر دولتمند سے خدا فرمائیگا، کیا مین نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہین کیا، یہانتک کہ تو کسی محتاج نہ رہا، عرض کریگا، کیون نہین اے میرے رب! دریافت کریگا، تو مین نے جو کچھ تجھ کو دیا اس مین تو نے کیا کیا؟ جواب دیگا مین اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا، اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہین گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائیگا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہین کہ تو بڑا سخی ہے، تو یہ تجھ کو دنیا مین کہا جاچکا، (تو اپنا بدلہ پاچکا) اس کے بعد وہ لایا جائیگا جو جہاد مین مارا گیا، تو خدا اس سے دریافت کریگا، تو کس بات کیلئے مارا گیا، کہیگا، خدایا تو نے اپنی راہ مین جہاد کا حکم دیا تھا تو مین لڑا، یہانتک کہ مارا گیا، خدا فرمائیگا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہین گے یہ جھوٹا ہے، خدا کہیگا تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہین، تو دنیا مین تجھ کو یہ کہا جاچکا، پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہین جو سب سے پہلے جہنم مین ڈالے جائین گے"۔[له]

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سنکر بہت روئے، پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے، اور اس حدیث کی تائید مین قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم
نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا	اس کا عمل اسی دنیا مین پورا کردینگے بے کم وکاست،
لَا يُبْخَسُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ	ان لوگون کا آخرت مین کوئی حصہ نہین، مگر دوزخ،
فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا	اس دنیا مین انھون نے جو بنایا وہ مٹ گیا، اور
فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، (ھود ۲)	جو کیا وہ برباد گیا،

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ

له جامع ابواب ۱ باب ما الریاء

ثواب کی روح سے خالی ہے، اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہو، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہو جہان اُسکی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہین، بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہو،

وَمَا تُنْفِقُونَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ ۳۷)	اور تم تو خرچ نہین کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (رعد)	اور جنھون نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا،
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى، اِلَّا ابْتِغَآءَ	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اُتارنے کے لئے نہین بلکہ
وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى، (لیل)	اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لئے کرتا ہے،

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ مین ارشاد فرمایا،

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا، اور مسافر کا، ایسا کرنا
ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ	ان لوگون کے لئے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہین
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، (الروم-۴)	اور وہی کامیاب ہین،

مذاہب مین اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلعم کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اُس کا پتہ اخلاق کے نفس بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات مین شاہی احکام کی شان رکھی ہو، جس مین کسی اصول اور غرض وغایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہین کیجاتی، انجیل مین لفظی صناعیون کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہین کی گئی ہو، تاہم عیسائی مذہب مین کچھ اصول ضرور موجود ہین، مگر اُن کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان مین سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقت انسانی کا ہے،

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت مین سادہ ہو یا گناہون سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل مین گنہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ اور مان حضرت آدم اور حوا گناہگار تھے، اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت مین منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہین اس مسئلہ مین مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے

پاک نہین ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گناہگار مرا، اور آسمانی بادشاہی کے حدود مین وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم مین جھونکا جائیگا، کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہین پائی تھی،

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اُس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے، فِطْرَةَ اللّٰہِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگون کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ازلی سوال کے جواب مین بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف، ہر انسان روزِ ازل کرچکا ہے، اس لئے اس دنیا مین آکر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہین کیا، اُس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لئے کافی ہے، اللہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زرین حرف لکھے ہین، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اُس کو اُبھار کر چمکا دیتا ہے، یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، (التین) ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا، یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا،

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ، (انفطار-۱)

جس خدا نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھکو ٹھیک کیا، پھر جس صورت مین چاہا تجھ کو جوڑ دیا،

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس مین قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ٹھیک کیا کیا ہے، اس کے لفظی معنی معتدل کیا نکے ہین یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہین کہ اُس مین کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم مین اس کے جسمانی اور روحانی دونون قوی کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتون مین یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ مین ہے،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی، الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی، (اعلیٰ-۱)

اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا، پھر راہ دکھائی

راہ دکھنا یعنی ہدایت، انسان کی فطرت مین اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس مین دوسرے بیسیون قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہین، سورۂ دہر مین اس سے بھی زیادہ صاف ہی،

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا، اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا، (دھر-۱)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار (نیکوکار) ہوتا ہی یا ناشکر (بدکردار)

غرض اُس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دیدی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اُس کا کام ہے، سورۂ شمس مین اس سے بھی زیادہ واضح ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا، (شمس - ۱)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اسکو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اسکی نیکی اور بدی اتو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا، اور ناکام ہوا، وہ جس نے اس کو مٹی مین ملا دیا، (گندہ کر دیا)

الغرض محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم کے رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار اور عصیان کار نہین ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصل فطرت مین ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اسی لئے یہ کہا گیا،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، (روم ۴)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگون کو پیدا کیا، خدا کے بنائے مین بدلنا نہین، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہین جانتے،

یہ دینِ فطرت، اسلام اور اُس کی تعلیمات ہین، جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت صلعم نے اس آیت کی تفسیر مین فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے

ہین، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل مین صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہین پیدا ہوتا[1]، اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحیِ محمدی نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت مین بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا مین تمھارا پروردگار نہین؟ انھون نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، بَلٰی ہان بیشک تو ہمارا پروردگار ہے؛ یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے، اور کہا ہو کہ دیکھو شیطان نے تمھارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے مین نہ آؤ،

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت مین معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہین لاتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے، کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، (فاطر-۳)	اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہین اٹھاتا،
كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ، (طور-۱)	ہر نفس اپنے ہی عمل مین گروی ہو،

اور اسی کی تفسیر مین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

اَلَا لَا يَجْنِىْ جَانٍ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ[2]،	ہان باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہین، اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ،

اسی طرح اُن مذہبون نے بھی جنھون نے انسانون کو آواگون اور تناسخ کے چکر مین پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے، انھون نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھدیا ہے، اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا، اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرمون کے ہاتھون مین مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے،

[1] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الایمان، [2] سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر،

اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلعم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت مین بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کیلئے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گناہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اُس وقت تک کے لئے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے[1]"

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیان جو بن کھلے مرجھا گئین اسلام کی نگاہ مین جنت کے پھول ہین، آپ نے فرمایا کہ "جس مسلمان کے بچے بچپن مین مرگئے وہ خدا کے دربار مین اپنے ماں باپ کے شفیع ہونگے"، اور ان کو جنت مین لیجائینگے[2] آنحضرت صلعم کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا: "یہ جنت مین جاکر جنتی دایون کا دودھ پئے گا[3]"

اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچون کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہان رہین گے، فرمایا "خدا کو علم ہے، کہ یہ کیا ہوتے[4]"، لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی، ایک دفعہ رویا مین حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت مین بیٹھے ہین اور ان کے چارون طرف کمسن بچون کا ہجوم تھا، فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مرگئے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکون کے بچے؟ فرمایا، اور مشرکون کے بچے بھی[5]، ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی مین مرجانے والے بچہ کو بتخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ نے مناسب نہین سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مرگیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سنکر آنحضرت صلعم سے عرض کی، "یا رسول اللہ! اُس کو مبارک ہو یہ جنت کی چڑیون مین سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا" فرمایا: "اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگ پیدا کئے ہین اور جہنم کے لئے کچھ لوگ[6]" ایک طرف عیسائیت ہے جو تعلیم

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لا یجب علیہ الحد۔ [2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز [4] صحیح مسلم کتاب القدر۔ [5] صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح [6] یہ حدیث صحیح مسلم کتاب القدر مین ہے، امام نووی کی شرح مسلم مین بھی یہ باب دیکھو۔

[6] فضل من مات لہ ولد جلد ۲ صفحہ ۳۳۵ و ۳۳۴ [illegible]

پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچّون کو جہنم مین جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو اُن کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اُن کے جنازہ کی نماز مین یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے: "خداوندا! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جسکی شفاعت تیری بارگاہ مین مقبول ہو" احادیث مین ایسے موقعون پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہون کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت صلعم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے[1]"

خوف ورجا اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیون مین دو گروہ گذرے ہین ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے کہتے ہین، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نا اُمیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمامتر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا مین چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہین دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو، اور زندگی مین موت کی صورت بنا لو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو، اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونون رائین ترمیم کے قابل ہین، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہجاتے ہین، اور وہ دنیا مین کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہین باقی رہتا، اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت مین مست و سرشار ہوتا ہے، اور اُس کو نیک و بد کی تمیز نہین رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونون گلیون کی بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ باربار سناتا ہے، کہ دل بادۂ غفلت مین سرشار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اُس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہین ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے، اُس کی شریعت مین خدا سے نا اُمیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات مین بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہین ہونے دیتا، قرآن پاک مین حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا،

[1] صحیح مسلم باب الاوقات التی نھی عن الصلاۃ فیھا، و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج،

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَانِطِينَ ، (حجر-۴) (ابراہیم ناامیدون مین سے نہ بن،

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی،

وَلَا تَايْئَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَايْئَسُ ‏ اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو، اللہ کے فیض سے

مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ، (یوسف-۱) ناامید وہی ہین جو خدا کے منکر ہین،

اس امت کے گنہگارون کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے،

يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ ‏ اے میرے وہ بندو جنھون نے اپنی جانون پر آپ ظلم

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ، (زمر-۶) کیا، تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو،

اسی لئے آنحضرت صلعم نے احادیث مین انسان کو ہمیشہ پرامید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مین اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہون ؂ یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لئے ہو جاتا ہون، اس بارہ مین اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے،

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا ‏ بھلا ایک وہ جو بندگی مین لگا ہے، رات کی گھڑیون

وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ ‏ مین سجدہ کرتا ہے، اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے

رَبِّهِ ، (زمر-۱) ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے،

یعنی اس کے دل مین یہ دونون کیفیتین یکجا ہین، گناہون اور تقصیرون کے مواخذہ اور بازپرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، خدا کے غضب سے ڈرنا اور اسکی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، ڈر اس کو غافل بیباک اور گستاخ نہین ہونے دیتا، اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہین ہونے دیتی، اسی لئے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے،

وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ، (نساء-۱۵) اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافرون کو نہین،

ؔ جامع ترمذی، زہد باب فی حسن الظن باللہ،

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم مین ایک مومن اور ایک کافر کے دل مین پیدا ہوتا ہے،
کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہان ہے، اور جب وہ اُس کو نہین پاتا، تو دل شکستہ ہوجاتا ہے، وہ
کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے، اور جب وہ نہین ملتی تو افسردہ ہوجاتا ہے لیکن مومن اگر ظاہری
اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہین بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شادان اور فرحان رہتا ہے کہ اس نے
نیکی کا کام کیا، اور بہرحال اس نیکی کا یہان نہین تو وہان معاوضہ ضرور ملیگا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی
تو نہ ہو، خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہرحال ملیگا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانون کو ہر نیک کام مین
جری اور بہادر بنا دیا ہے، اور اُن کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے
کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قومون مین ناکامی اور نا اُمیدی کی خودکشیون کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان مین
ہندو عورتون کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات مین پڑھے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ کے متمدن
ملکون مین ذرا ذرا سی نا اُمیدی پر خودکشی کرلینا ایک معمولی واقعہ بنگیا ہے، جس وقت یہ سطرین لکھ رہا ہون واسا
رپولینڈ) مین ناکام نوجوان لڑکیون کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبرین اخبارون مین چھپ رہی
ہین، مگر کسی مسلمان مین اخیر سے اخیر لمحہ مین بھی نا اُمیدی کا یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا، اور خدا کے فضل و کرم سے اُس کی
آس نہین ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا
دیوالیہ، ہر حالت مین وہ پُر اُمید رہتا ہے، مشکلات مین، بیماریون مین، محتاجیون مین، ناکامیون مین، ہر وقت
وہ ہمت کیساتھ خدا کی رحمت کا اُمیدوار ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ نا اُمیدی اور کفر دونون اُس کے مذہب مین
ایک ہین، اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہان نہین تو وہان ضرور ہے، کہ اُس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ، — مین تم مین سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہین کرتا،

(آل عمران - ۲۰)

اخلاق اور رہبانیت اخلاق درحقیقت انسانون کے باہمی تعلقات مین خوش خلقی، اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یہان

کہئیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہین اُن کو ادا کرنے کو کہتے ہین، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لئے باہم انسانون مین تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت تجرد اور جوگی پن مین نہین پائی جاتی ہے، اسی لئے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علحدگی، اہل وعیال، عزیز وقریب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے، یا کم کر دیتی ہے،

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب مین اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور وہ خود اور اُن کے عقیدتمند بھی اس کو اُن کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد اور جماعتون نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظرون سے چھپا کر بادشاہون کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایان کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے مین مدد ملے، اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھکر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکین، اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال اعزہ واقارب، دوست واحباب، اور قوم وملک وملت کے فرائض وحقوق بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائین،

اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق مین راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہین کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت صلعم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی مین رہ کر اور تمامتر انسانی جدوجہد مین شریک ہو کر گذاری ہے، یہی طرزِ عمل خلفاے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ کا تھا، اور پورا قرآنِ پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن مین موجود نہین ہے،

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتون کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہین، اُن سے ہٹ کر نہین،

وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں، حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں،

اسی لئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم-۱) تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ،

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت صلعم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اُس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائیگا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔[1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لئے وحیِ محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا،

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ (انفال-۳) اور اُس فساد سے بچو جو کہ صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑیگا،

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچیگی، کہ اگر جماعت اپنے تمرّد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں اصحابِ سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے،

دنیا درحقیقت جد و جہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب رعایۃ فی بیتہ ص ۷۸۳

راستہ طے کر رہے ہین، راستہ مین سب لوگون کے ساتھ چلنے مین یقیناً بہت کچھ تکلیفین ہین، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھکر چل کھڑا ہوتا ہے دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان مین اور ترمذی نے جامع مین آنحضرت صلعم سے یہ روایت نقل کی ہے،

انّ المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علیٰ	وہ مسلمان جو لوگون مین مل جل کر رہتا ہے، اور انکی
اذاھم افضل من الذی لایخالط الناس	تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگون
ولا یصبر علی اذاھم[1]	سے نہین ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہین کرتا،

گوشہ گیری اور جماعت سے علٰحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے، اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہون کہ اُن کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت مین وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے مین نہ پائین وہ مجمع سے الگ ہو جائین، فتنہ مین عزلت نشینی کی حدیثین اسی موقع سے تعلق رکھتی ہین، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت مین تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کرکے جماعت کے بچانے مین پوری کوشش صرف کر دے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلعم نے دنیا مین پیش کیا، اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ مین اسی کی پیروی کی،

آپ نے فرمایا کہ بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اُس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے[2]،

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی مین جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے

---

[1] شعب الایمان بیہقی وجامع ترمذی، کتاب الزہد صفحہ ۴۱۶، [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتون کے لئے کہنا، اور بری باتون سے روکنا) ہے، قرآنِ پاک نے مسلمانون کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	تم سب سے بہتر اُمت ہو، جو لوگون کے لئے باہر لائی
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (آل عمران ۱۲)	گئی، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے رُکتے ہو
يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہین اور بری بات سے
(توبہ ۹)	باز رکھتے ہین،

پھر خاص طور سے حکم ہوا،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمٰن)	اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک،

مسلمانون کی تصویر یہ ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ،	اور وہ آپس مین سچائی اور ثباتِ قدم کی ایک دوسرے
(العصر)	کو نصیحت کرتے ہین،
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ،	اور آپس مین ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی
(بلد - ۱)	ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہین،

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب مین اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایان کرتی ہے، اور قومی دل اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی، اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہین،

توراۃ مین قابیل کا یہ فقرہ کہ کیا مین اپنے بھائی کا رکھوالا ہون[۱]؟ عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے، اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کرلی ہے، جس کا نام شخصی آزادی

[۱] سفر تکوین - ۴ - ۹،

کی بھائی ہے، لیکن اسلام کے قانون مین اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے آنحضرت صلعم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گذرا کہ کُلُّکُم رَاعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم مین ہر شخص نگہبان ہے اور تم مین ہر شخص سے اُسکے زیر ذمہ داری لوگون کی نسبت باز پرس ہوگی" قرآنِ پاک مین صراحت کے ساتھ لوگون کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانون پر واجب ٹھرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگون کی نیک چلنی کا ضامن ہوسکے، اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی مین لانے کا ذمہ دار ٹھہرے،

قرآنِ پاک مین اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے، بنی اسرائیل کے لئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا، بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی، وہ حیلہ کرکے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی، اس موقع پر اس آبادی مین تین گروہ ہوگئے، ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور اُس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل مین شریک نہ تھا، لیکن اُن کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہین کرتا تھا، بلکہ خود سمجھانے والون سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگون کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ اُن کے اس جرم کی پاداش مین ہلاک کرنے والا ہے، لیکن اُن پر جب عذابِ الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا، جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا، بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہوگیا، پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۂ اعراف کے بیسوین رکوع مین یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر مین ہے،

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا	اور جب ان مین سے ایک فرقہ بولا، کہ تم کیون ایسے
اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا	لوگون کو نصیحت کرتے ہو، جن کو خدا برباد کرنے والا
شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ	یا سزا دینے والا ہے، انھون نے جواب دیا کہ تمھارے
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ، فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ	رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لئے انکو

اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا	نصیحت کرتے ہین، اور شاید کہ یہ نیک بنجائین، تو
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِیْسٍۭ بِمَا کَانُوْا	جب وہ بھول گئے، جو اُن کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے انکو
یَفْسُقُوْنَ،	جو منع کرتے تھے بچالیا، اور گنہگارون کو انکی بے حکمی
(اعراف - ۲۱)	کے سبب بڑے عذاب مین پکڑا،

یہ قصہ بتاتا ہے. کہ اسلام کی نظر مین اپنے دوسرے بھائیون کو گرنے سے بچانا اور گرتون کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے! اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے! کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے. جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اُس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہوجاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہین، اور اُس کا کیا بلکہ خود رسول کا بھی یہ فرض نہین، فرمایا،

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ، (مائدہ ونور[۱۳])	رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے،

اگر یہ فرض ادا ہوگیا، تو اُس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لئے سورۂ مائدہ مین فرمایا،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج لَا	اے ایمان والو تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم اگر
یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ، (مائدہ۱۴)	سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمھارا کچھ نہین بگاڑتا

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس آیت پاک کو پڑھکر لوگون سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی کے دھوکے مین نہ ڈالین، کہ مین نے رسول اللہ صلعم کو کہتے سنا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھین اور پھر اس کے دونون ہاتھ نہ پکڑین، تو ہوسکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب مین گرفتار ہوجائین" ایک دوسرے صحابی ابوثعلبہ رضؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے، تو جواب دیا کہ مین نے خود آنحضرت صلعم سے اس کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ "نہین بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو، اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو، لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہی، اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے، اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے، تو اُس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو، کہ تمھارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے، جس مین ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے"[۱]

[۱] یہ دونون حدیثین ترمذی کتاب التفسیر (مائدہ) مین ہین صفحہ ۹۰ ج ۲ و ۹۹۸ م ۱۲

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ کیا مین اپنے بھائی کا رکھوالا ہون" منسوخ کر دیا، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ مین نہین رکھیگی، ان کی حفاظت نہین ہوسکتی، قومون کے رسوم وآداب اور اٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہین، دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیوٹ اور نجی کی باتین معلوم ہوتی ہین، جنکا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے، مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہین، ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے، اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی مین پھیل جاتا ہے، دوسرے یہ اگر ان کی روک تھام نہ کیجائے تو ان برائیون کی برائی نہایت ہلکی ہوکر رہجاتی ہے، اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہین، اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیون کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز مین پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہوجاتا ہے، اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گرجاتی ہے، ترمذی مین ہو کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے صحابہؓ کی مجلس مین فرمایا کہ بنی اسرائیل مین اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا، کہ جب ان مین برائی پھیلنے لگی، تو پہلے تو اُن کے علماء نے منع کیا، لیکن جب وہ نہ رُکے تو وہ اُن کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے، صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسٰیؑ کی معرفت ان پر لعنت کی" اس کے بعد آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا "نہین جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو، اور اس کو حق پر نہ جھکا دو"

یہ ہے اس باب مین محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم!

اس کے چند شرائط لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل وعامی کا فرض نہین ہے، کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر سکے گا، یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیون سے بچا ہو، قرآن نے کہا،

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ — کیا تم دوسرون کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو،

(بقرہ - ۵)

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کیساتھ کیجائے، خود آنحضرت صلعم سے فرمایا گیا،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔ (نحل - ۱۶) — تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا،

حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ علیہما السّلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہدیا گیا،

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا، (طٰہٰ-۲) — تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا،

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی،

وَعِظْھُمْ وَقُلْ لَّھُمْ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا، (نسآء ۹) — اور تو اُن کو نصیحت کر اور اُن سے کہہ اُن کے دل تک پہنچ جانے والی بات،

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لئے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے،

امن وامان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے، اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے ذرائع جبر اور زبردستی کے تکملہ انتظامات جن کے لئے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے،

تجسس اور غیبت کی ممانعت یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے، اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جسکا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے، کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھسکر اُس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بنگیا ہے، کہ

ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار،

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا، اور کوئی شخص اپنے گھر مین بھی محفوظ نہ رہتا لیکن اسکی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر مین چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے، اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہین پہنچتا، اس لئے جماعت کو اس مین دخل دینے کی ضرورت نہین، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہین کہ اس مین شرم و حیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بنجائے، لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھرین تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اُس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے، اسلام مین کسی گھر یا کمرہ مین بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہو اُس کی علت بھی یہی ہے، جیسا کہ خود آنحضرت صلعم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرویة یعنی کسی کے گھر مین داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لئے ہے کہ وہ اُس کو نہ دیکھے،

اس سلسلہ مین ایک اور اصول یہ ہے کہ اُس کی غیبت نہ کیجائے یعنی اسکی برائی اس کے پیچھے دوسرون سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہین بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اُس کو ملال ہو اور اس مین مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے، اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے، چنانچہ وحی محمدی نے اسی لئے تجسّس اور غیبت ان دونون چیزون کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ	اے ایمان والو! بہت سارے گمانون سے بچتے رہو، کہ بیشک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو، اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم مین سے کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے ہو سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو بیشبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہو،
(حجرات - ۲)	

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا، کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا، اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لئے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ اُس شخص کی جس کی غیبت کیجائے، اصلاح ہوسکتی ہے، اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایان نہیں، اسی لئے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھروگے تو اُن کو برباد کردوگے"[۱]

غور کیجئے کہ آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہان ہیں،

توسط اور اعتدال؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا، اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کررہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملادیا،

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے، اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنادیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے، اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[۲]، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، اُن کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[۳]، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کردیئے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الادب، باب النہی عن التجسس، [۲] یہود کی سنگدلی کے سبب سے [۳] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کیلئے

ان لفظون مین فرمایا،

"تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت[1]، لیکن مین تم سے

کہتا ہون کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمھارے داہنے گال پر طانچہ

مارے اُس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو، جو شخص لڑنے جھگڑنے مین تمھارے

کپڑے پکڑلے اس کو چادر بھی دیدو، جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لیجائے، اس کے

ساتھ دو میل تک چلے جاؤ، جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نکرو،

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزون سے محبت اور اپنے دشمنون سے بغض رکھو،

لیکن مین تم سے کہتا ہون کہ اپنے دشمنون سے محبت رکھو" (متی باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دُنیا سے جو کچھ کہا یا سُنا گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا، جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا، لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سُن رہی تھی، وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا، لیکن اسلام نے عدل واحسان دونون مین امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کردیا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ،	بے شبہہ خدا، عدل اور احسان (دونون) کا حکم
(نحل - ۱۳)	دیتا ہے،

یہ ایک اصولی تعلیم تھی، جس نے شریعتِ موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتون کو ایک جگہ جمع کردیا ہے،

عدل اور احسان "عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے، قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے، "عدل" کے معنی "برابر" کے ہین، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے اُس کے ساتھ

[1] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے،

اتنی ہی برائی کیجائے، یہ عدل ہے، اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے، اسلام مین ان دونون کے الگ الگ مراتب ہین، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ مین اُس نے دیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہین ہے، اور احسان شخص کے ہاتھ مین ہے، اور یہ محض شخصی معاملہ ہے، قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے، تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے، اس لئے قانون کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ مین پیش کر کے ہمیشہ کے لئے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لئے قابلِ عمل نہین رہا، خود عیسائی سلطنتون کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہین رہ سکا، اور نہ برائیون کی روک تھام ہو سکی؛

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہین ہوتا، بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی بازپرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اُسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے، اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہین ہے، کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزارون لاکھون افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے، اس لئے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے مین بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جو شریعتِ محمدی مین پوری طرح برتی گئی ہے، کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی،

پھر سب لوگ دنیا مین ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہین ہوئے بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہین، جن کے لئے معاف کر دینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے، اور بعض غصہ ور سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہین، جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لئے بغیر چین نہین لے سکتے، ان کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے، اور برائی برائی کے بقدر کے اصول پر عمل

کرنے کے لئے ان کو رضامند کرلیا جائے، اس لئے ایک عالمگیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو عدل اور احسان دونون اصولون کی جامعیت کی ضرورت تھی،

قانون اور اخلاق | اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظون مین یہ ہے کہ دنیا مین امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیون کے انسداد کے لئے دو چیزین ہین قانون اور اخلاق، اور گو ان دونون کا منشا ایک ہی ہے، مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہین، اور تنہا ان مین سے ہر ایک مین کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیون کو تو روک دیتا ہے، مگر دل مین اُس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہین کرتا، جو انسانیت کی جان ہے، اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہین کیا جا سکتا، اس لئے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیون کا استیصال کلیۃً نہین ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے، اور انجیل محض اخلاق، اسی لئے یہ دونون الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیون اور برائیون کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہین، آنحضرت صلعم ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونون کو جامع ہے،

اس جامعیت کا اصول شریعت محمدیؐ مین دو حیثیتون سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اُس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دیدی، اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کرکے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ اُس نے قانون اور اخلاق دونون کے درمیان حدِ فاصل قائم کرکے ہر ایک کی حد مقرر کردی، اور اپنی شریعت کی کتاب مین قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھکر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا،

اسلام نے ان برائیون کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسرون تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت مین رکھا، مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم کے لئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے، جو حکومت اسلامیہ

کی طرف سے دی جاسکتی ہے، اور جو باتین ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھین، اُن کو اخلاق کے دائرہ مین رکھا، مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبون کی امداد وغیرہ، اس طرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونون کا مجموعہ ہے،

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اُس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اُس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی گئی کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کردے، بلکہ برائی کے بجائے اُس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے، اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانونِ انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونون کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے، اور اس لئے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفل ہے، وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگون کی روحانی تکمیل مین بھی کسی طرح حارج نہین، وہ نہ یہودیون کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے، اور نہ عیسائیون کی تعلیم کی طرح غیر محسوس رُوح ہے، بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے،

عفو اور انتقام موسویؑ، عیسویؑ، اور محمدیؐ اخلاقی تعلیمات مین باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے، اسلامی قوانین کو پیشِ نظر رکھکر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم مین اخلاقی روح نہین، لیکن اگر وہ قانونِ محمدیؐ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کو بھی سامنے رکھتے تو اُن کو یہ شبہہ پیش نہ آتا، معلوم ہو چکا، کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے، اُس کا حکم ہے،

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا۔ . . . . . اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، (احبار ۲۴-۱۷ خروج ۲۱-۱۲، گنتی ۳۵-۳۱، استثنا ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے، اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:-

"تم سُن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر مین تمھین کہتا ہون
کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے دوسرا گال بھی اسکی طرف پھیر دے" (متی ۵)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلعم نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونون کا مجموعہ ہے، عدل قانون ہے، اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام مین یہ دونون اصول جاری ہین، اور جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کئے گئے ہین، اُس کی نسبت محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے،

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ	اے ایمان والو تم پر مقتولون مین برابری کے بدلے
فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ	کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام
وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى ، (بقرہ-۲۲)	عورت کے بدلے عورت،

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے،

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ	تو اگر اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا
بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ	گیا، تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کرنا، اور
ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ	نیکی کیساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمھارے رب کی
فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ	طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی، تو جو کوئی (مقتول
عَذَابٌ أَلِيمٌ ،	کے رشتہ دارون مین سے) اس (معافی یا خونبہا لینے)
(بقرہ ۲۲)	کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لئے دُکھ کی سزا ہے"

ان آیتون کی بلاغت پر غور کیجئے، کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ دارون کے درمیان کُھلی دشمنی کے باوجود اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ دارون کا بھائی کہکر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ

توراۃ کے حکم مین خونبہا لیکر معافی کی دفعہ نہ تھی، اس لئے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا، اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ دارون کو معاف کر دینے یا خونبہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونون کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے،

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ	اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ مین یہ حکم لکھا کہ جان کے
وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ	بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،
بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوحَ	دانت کے بدلے دانت اور زخمون مین برابر کا بدلہ،
قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ	تو جس نے بخشدیا تو وہ اس کے لئے کفارہ ہوا اور
لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ	جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ
هُمُ الظَّالِمُونَ، وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ	نہین کیا، تو وہی ظالم ہین، اور ہم نے بنی اسرائیل
بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	کے ان پیغمبرون کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا
مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ	جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا، اور
هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	اس کو انجیل دی جس مین رہنمائی اور روشنی ہے، اور
مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ	جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو
(مائدہ - ۷)	پرہیزگارون کے لئے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے،

۲ - یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے، مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے، فرمایا

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ، (بقرہ - ۳۸)	اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل ہر تم نے دیا تھا

یہ تو قانون تھا اب اخلاق دیکھئے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ	اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کو اُس وقت تک
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	مہلت ہے، جب تک اس کو کشایش ہو، اور بالکل
(بقرہ ۳۸-۲)	معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ	اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہو
بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، (نحل)	اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والون کے لئے بہت بہتر ہے

اسی مفہوم کو ایک اور آیت مین اس طرح ادا کیا گیا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ	اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ
وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا	لیتے ہین، اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، تو اگر
وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ	معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے
(شوریٰ ۴)	وہ ظالمون کو پیار نہین کرتا،

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے مین پہل اور سبقت نہ کرین، لیکن اگر کوئی اُن پر ظلم کرے، تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہین جتنا ان پر کیا گیا، کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے، جیسا کہ توراۃ مین بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کرے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے، (وَاَصْلَحَ) تو اُس کو خدا کی طرف سے ثواب ملیگا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے،

الغرض عفو اور انتقام مین سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو، تو جماعت کا نظام قائم نہین رہ سکتا، اور نہ ملک مین امن و امان رہ سکتا ہے، اور شر

افراد کے بڑے حصہ کو برائیون سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی، اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے، حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لئے ان مین سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا، نظامِ ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے،

اس لئے آنحضرت صلعم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے، اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ مین دیدیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء مین کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس مین بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر مین کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا، تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے،

جماعتی انتظامات کے قیام کے لئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ   اور تم کو اللہ کے حکم چلانے مین ان دونون گنہگارون

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (نور)   پر ترس نہ آئے اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہو

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہان ہے، اور جو قیامت مین ہوگی وہ اس سے کہین زیادہ سخت ہوگی اس لئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی مین دیدینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے، اس لئے اس سزا کے دینے مین نرمی نہ کیجائے،

کسی سزا کے جاری کرنے مین اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم مین گرفتار ہوئی، اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دیجائے، اور اس کے لئے آنحضرت صلعم کی خدمت مین سفارشین پہنچائی گئین تو فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلی قومین اسی لئے ہلاک ہوئین، کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا، تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو مین اس کے بھی ہاتھ کاٹتا[1]

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود صفحہ ۱۰۰۳

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہین کہ آنحضرت صلعم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہین لیا، الایہ کہ اُس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے، تو اُس کو (قانوناً) سزا ملی ہو[1] یہ عمل تھا تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہین کہ "مین نے آپ کی خدمت مین قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہین دیکھا، لیکن یہ کہ اُس مین آپنے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا[2]" یعنی قصاص کے بجاے بالکل معافی یا دیت (زرِتاوان یا خونبہا) لیکر معاف کردینے کو فرمایا، معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا "آپس مین گناہون کو معاف کردیا کرو، لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچیگا تو سزا ضروری ہوجائے گی[3]" یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہوجائیگا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلون پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سورہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتارلی، وہ پکڑا گیا اور عدالتِ نبویؐ مین پیش کیا گیا، آپنے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جن صاحب کی چادر تھی انھون نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، مین یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کردیتا ہون" فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے کیون نہین یہ کرلیا[4]"

یہ تو اُس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے، اور اس لحاظ سے قانون محمدیؐ، موجودہ سلطنتون کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام مین اس سے بھی زیادہ وسیع ہے،

عفو و درگذر کی تعلیم اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو و درگذر ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام مین شرک اور بُت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اُس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود، [2] ابوداؤد و نسائی کتاب الدیات، [3] ابوداؤد کتاب الحدود، [4] ایضاً

حصہ ہے، تاہم مسلمانون کو یہ تاکید کیجاتی ہے کہ تم مشرکون کے بتون کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑھ مین تمھارے خدا کو برا کہہ بیٹھین،

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہین اُن کو
فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ، (انعام ۱۳)	بُرا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ بُرا کہہ بیٹھین

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوج پر صبر کرو، اور ان کو معاف کرو، اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانون کو ہو رہا ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ	معاف کرنے کی خو پکڑ، اور نیک کام کو کہہ، اور جاہلون
عَنِ الْجَاهِلِيْنَ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ	سے کنارہ کر، اور اگر تجھکو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھارے،
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، (اعراف ۲۴)	(یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ، وہ ہی سنتا اور جانتا

سکون کی حالت مین عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ مین بھی بے قابو نہ ہونے پائے، صحابہؓ کی تعریف مین فرمایا،

وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ، (شوریٰ ۴)	اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہین،

نیکوکارون کی تعریف مین ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا، کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیار (اپنی طرف) کھینچ لیتا ہے،

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ	اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگون کو معاف کرنے والے
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، (آل عمران ۱۴)	ہین، اور اللہ اچھے کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے،

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے، فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ	اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ
الْأُمُوْرِ، (شوریٰ - ۴)	بیشک ہمت کے کام ہین،

اس برداشت اورعفو کو وحی محمدی نے اپنے الفاظ مین عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جو خاص انبیاؑ اور پیغمبرون کی توصیف مین آیا ہے، فرمایا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف-۴)

اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبرون نے برداشت کیا،

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے مین ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہئے، کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان-۲)

اچھی بات بتا، اور بُری بات سے روک، اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے، کہ یہ ہمت کے کام ہین،

کفار اور مشرکین کی بدگوئیون کو اور اُن کی لائی ہوئی مصیبتون کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (اٰل عمران-۱۹)

اگر صبر کرو، اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کام ہین،

اوپر کی تمام آیتون مین صبر، برداشت، تحمّل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام ، بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے، اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت مین ایمان والون کو دشمنون کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (جاثیہ-۲)

(اے پیغمبر!) ایمان والون سے کہہ کہ اُن کو جو ایام اللہ کی اُمید نہین رکھتے معاف کرین،

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہین رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہین جو کافر و مشرک ہین، اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے، اس کے باوجود مسلمانون کو

یہ تاکید کیجاتی ہے کہ وہ اُن کو معاف کرین، اور اُن کی خطاؤن سے درگذر کرین، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانون کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتاکر اُن کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے،

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ	اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو، یا چھپا کر کرو، یا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا،	کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے)
(نساء ۲۱)	کیونکہ خدا معاف کرنے والا قدرت والا ہے،

یعنی جب گنہگارون اور بدکارون کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندون مین بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے، اور اس تعلیم مین قرآنِ پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمھارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندون کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہے اُس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہئے اسی کے قریب قریب یہ آیتِ پاک بھی ہے،

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ	اور چاہئے کہ معاف کرین اور درگذر کرین، کیا تم نہین
لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، (نور-۳)	چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی تم دوسرون کو معاف کرو، تو اللہ تم کو معاف کریگا، اس مین عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہی،

برائی کی جگہ نیکی

عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے نہ صرف یہ کہ اسکو معاف کرو بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو، اور جو عداوت رکھے اُس کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والون کا نام خدا نے صابر اور ذو حظِ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے، کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا،

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ	نیکی اور بدی برابر نہین، تو برائی کا جواب بہتری سے

بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ	پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو،
عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ، وَمَا یُلَقّٰھَآ	وہ ایسا ہو جائیگا، جیسا ناتے وار دوست، اور یہ
اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا، وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ	بات اُنہی کو حاصل ہوتی ہے، جو برداشت (صبر)
حَظٍّ عَظِیْمٍ، (حٰمٓ السجدہ۔۵)	رکھتے ہیں، اور جس کی بڑی قسمت ہو،

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا، مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو، کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے،

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ	مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے
وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ	ہیں جو وہ کہتے ہیں، اور کہہ کہ اے میرے پروردگار
وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ،	میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اور
(مومنون۔۶)	اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں، کہ وہ میرے پاس آئیں،

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے، اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے، فرمایا،

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ	اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم
یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ	ان کو اللہ نے دیا ہے، (یعنی ایک دوسرے کا حق)
الْحِسَابِ، وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ	اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور حساب کے برے انجام
رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ	سے خوف کھاتے ہیں، اور جو اپنے پروردگار کی خوشی

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ	کے لئے صبر کرتے ہین اور نماز ادا کرتے ہین، اور ہم نے انکو
أُولٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ، جَنّٰتُ عَدْنٍ	جو روزی دی اس مین سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہین
(رعد ۔ ۳)	اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہین انہی کے لئے ہے پچھلا گھر،

اُن سے کہا جائیگا ،

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ	تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے مین کہ تم نے صبر کیا ہو
(رعد ۳)	خوب ملا پچھلا گھر ،

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارتِ عظمیٰ مین نہ تو نماز کا ذکر ہے، نہ خیرات کا اور نہ خوفِ خدا کا صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے، علاوہ ازین اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے، ایک اور آیت مین نو مسلم یہودیون کو اپنے برخلاف اپنی ہم قومون سے جو دلآزار فقرے، اور اعتراضات سننے پڑتے ہین، اور وہ اس پر صبر کرتے ہین، اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے، کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہین

أُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ	وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائینگے اور وہ برائی کا جواب
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ	بھلائی سے دیتے ہین، اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے
وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَا	ہین، اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہین تو اُس سے
أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ	درگذر کر لیتے ہین، اور کہہ دیتے ہین کہ ہمارے لئے
لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ،	ہمارے کام ہین اور تمھارے لئے تمھارے کام سلامت
(قصص ۔ ۶)	رہو ہم کو بے سمجھون سے مطلب نہین ،

ان آیتون کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے، نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہین اور درگذر کرتے ہین، بلکہ اُن کے حق مین سلامتی کی دعاے خیر بھی کرتے ہین ،

صحیح بخاری مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہین ہے جو احسان کے بدلہ مین احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو[1]، ایکدفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہین جنکے ساتھ مین تو سلوک کرتا ہون، مگر وہ بدسلوکی کرتے ہین، مین نیکی کرتا ہون، اور وہ بدی کرتے ہین، مین حلم اور بردباری سے پیش آتا ہون، اور وہ جہالت کرتے ہین، آپنے فرمایا۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو تم اُن کے منہ مین مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لقمہ سے اُن کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے خدا کی مدد شامل رہیگی[2]، حذیفہؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا، تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کرینگے تو ہم بھی کرینگے، اور اگر وہ ظلم کرینگے تو ہم بھی کرینگے، یہ نہین بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو، لوگ تمھارے ساتھ بھلائی کرین تو بھلائی کرو اور اگر برائی کرین تو بھی ظلم نہ کرو[3]،

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانون کو اپنی فریب کاریون، جھوٹے وعدون، خیانت کارانہ معاہدون اور پرفریب صلحون سے دھوکا دیا کرتے تھے، ان کے متعلق بھی آنحضرت صلعم کو یہی ہدایت ہوئی،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (مائدہ ۔ ۳)	اور ان مین سے چند کے سوا اورون کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے، تو تو اُن کو معاف کر اور اُن کے قصور سے درگذر کر، اللہ نیکی کرنے والون کو پسند کرتا ہے

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصورون سے درگذر کرنا، اسلام مین وہ نیکی ہے، جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والون کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے،

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم اس باب مین کس قدر اہم اور کامل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ صفحہ ۳۳۴ (غریب)

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ مین نظامِ حکومت مین جو ترقیان ہو جاتی ہین اُن کی وجہ یہ نہین ہوتی کہ تمدن اصول قانون مین کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت مین قانون کے نفاذ مین ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہین جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ مین صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے، اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہین کیجاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہین ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اُس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائین جو اس جرم مین اعانت کرتے ہین، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہین، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہین، وغیرہ وغیرہ، بہرحال تمدنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے، اور وحشیانہ نظامِ حکومت مین یہ وسعت اور ہمہ گیری نہین پائی جاتی، تمدن کے زمانہ مین انسانی ضروریات مین جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے،

تفصیل اور ہمہ گیری مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے، اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دیجا سکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے

مثلاً اصولِ شریعت مین دنیا کے اکثر مذاہب مین اشتراک واتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد مین اعمال مین، عبادات مین، معاملات مین، اخلاق مین، جو چیزین ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھین اُنکی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزین جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھین، اُن کی ترغیب دی لیکن امر ونہی کے طریقے، اور ان کی جزئیات کے احاطہ مین کمی وبیشی ہے، اور اسی نے ان مذاہب کے احکام وشرائع مین باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہو جس سے برائیون کا تمامتر سدِ باب ہوتا ہے، اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصار کیا ہو، اور عام انسانون کے لئے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو، اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اُس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کیساتھ کی ہے کہ برائیون کا کلّی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیون کے مظاہر عام ہو گئے ہین، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے،

مثلاً توحید تمام مذاہب کا اُمّ الاصول ہے، لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہین کی، اس بنا پر ہر مذہب مین شرک کسی نہ کسی صورت مین شامل ہو گیا صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی اور ان کا کلّی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دیجاتی اور عرب کے تمام بُت توڑ دیئے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہین کیا، بلکہ ان تمام چیزون کو ناجائز قرار دیا جو ان بتون کی یاد کو تازہ کر سکتی تھین تصویر بجائے خود کوئی بُری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اسلئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا کسی مدح مین غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بد اخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے

اثر اور اُن کے نفوذ و طاقت مین غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ مین شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لئے آنحضرت صلعم نے برسرِ منبر سختی کیساتھ اس کی ممانعت فرمائی،

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم	میری شان مین مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم
فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ (بخاری)	کی شان مین کیا مین تو خدا کا بندہ ہون تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول

یہ ایک کلی حکم تھا، اور آنحضرت صلعم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اُس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا، اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیرؤون کو اُن سے ہر طرح آگاہ فرما دیا، اور کوئی بات سوال وجواب کے لئے باقی نہین رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہین جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی،

آنحضرت صلعم نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتون سے فرمائی ہے،

۱- تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ،

۲- ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ،

۳- نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی دونون قسم کے اخلاق کی تفصیل اور اُن کے مواقع کی تحدید،

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلّمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دیگا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان مین سے کسی نے نہین کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے، اور اُن مین سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم مین نمایان

کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے صحیفہ مین سب سے زیادہ اہمیت احکامِ عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام
جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن مین سنائے گئے تھے، ان دس احکام مین سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور
مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت، اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی
ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہین، جو حسب ذیل ہین، (دیکھو خروج باب ۲۰)

تورات کے اخلاقی احکام

۱- تو اپنے مان اور باپ کو عزت دے،

۲- تو خون مت کر،

۳- تو زنا مت کر،

۴- تو چوری مت کر،

۵- تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے،

۶- تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی، اور اس کے بیل اور اس کے گدھے،
اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر،

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ مین قانونی احکام کیساتھ
دو تین باتین اور آگئی ہین یعنی مسافر، بیوہ، اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم، اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹
مین انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے،

۱- تم مین سے ہر شخص اپنی مان اور باپ سے ڈرتا رہے،

۲- تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو،

۳- تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ،

۴- تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات
صبح تک تیرے پاس نہ رہجائے،

۵۔ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ،

۶۔ تو حکومت مین بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر،

۷۔ تو عیب جوؤن کے مانند اپنی قوم مین آیا جایا نہ کر، اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ،

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل مین نہ رکھ،

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندون سے بدلہ مت لے، اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ،

۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے،

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمھاری زمین پر تمھارے ساتھ سکونت کرے، تم اُس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمھارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ جو تم مین پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اُس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپکو کرتے ہو،

۱۲۔ تم حکومت کرنے مین پیمایش کرنے مین، تولنے مین ناپنے مین بے انصافی نہ کرو،

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہین کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہین کی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنیٰ اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام مین نظر آتی ہے، اخلاق مین بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفون مین جو خاص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھین، اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، اُن کو یک جا اپنے مشہور وعظ مین اُن کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ مین بہ ترتیب حسب ذیل باتین بیان کی گئی ہین،

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگذر، پاکدامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنون کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کرین، ایسا تم بھی اُن کے ساتھ کرو،

یہ اخلاقی تعلیمات بشتیر اہی لفظون کے ساتھ جو انجیل مین ہین، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفون مین مذکور ہین، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے اُن اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود اُن مین اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا،

اسلام مین اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہین، اس لئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اُس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہین رکھا گیا، بلکہ تمام قومون اور زمانون تک وسیع کیا گیا، اس لئے تمام قومون اور زمانون مین جو برائیان پائی جاتین یا پائی جانے والی تھین اُن سب کو استقصا کرکے منع کیا گیا، اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا، اور اُن کے حصول کی تاکید کی گئی، گذشتہ صحیفون مین جن برائیون سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیون کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت صلعم کی وحیِ مبارک نے اُن کی تمام جزئیات کا استقصا کیا، اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا، ذیل مین ہم اُن اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہین، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآنِ پاک نے کی ہے،

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگذر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ مین جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزون، قرابتدارون، یتیمون، مسکینون اور پڑوسیون کے ساتھ نیکی، مسافرون، سائلون اور غریبون کی امداد، غلامون اور قیدیون کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدون کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس مین لوگون کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ برے نامون سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتون مین باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی

برادری، انسانی برادری، اکلِ حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگون کو اچھی بات کی تعلیم دینا، اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی، اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اُس کے مال وجائداد کی نیک نیتی کیساتھ حفاظت، ناپ اور تول مین بے ایمانی نہ کرنا، ملک مین فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھین نیچی رکھنا، کسی کے گھر مین بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی بازپرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسرون کو معاف کرنا، دشمنون سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظرون اور مخالفون سے گفتگو مین آداب کا لحاظ، مشرکون کے بتون تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ مین عدل وانصاف، دشمنون تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگون پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی، اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقوی اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار مین وقار و متانت، مجالس مین حسنِ اخلاق، ضعیفون، کمزورون، اور عورتون کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغلخوری، طعنہ زنی، اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑون کی پاکیزگی اور طہارت، شرمگاہون کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمایش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال، اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے، اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکون کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتون سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگون سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمایش، معاملات مین سچائی اور دیانتداری،

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلعم کے اُن اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۲۰۰ صفحوں میں ہیں جنمیں سے ہر صفحہ میں ۳۰ سطریں ہیں، اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا، جو داعی اسلام علیہ السّلام کی تلقینات کی فہرست سے رہگیا ہو، اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں،

صلۂ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت، اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبرگیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیرخواہی، جانوروں پر شفقت، اور رحم، محسنوں کی شکرگذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو و درگذر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جاکر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور استغنا، گداگری

کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح و ستایش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضولخرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفسِ انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قماربازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت، اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت، اور دورُخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شرابخواری، زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، مصافحہ و معانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام،

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلعم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے،

اخلاقی جزئیات کا استقصاء انسان بڑا بہانہ جو، اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے، اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرے، اس کے لئے ضرورت ہو کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے، اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے، اور اُن کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں، آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات نے

اس نکتہ کو پوری طرح محفوظ رکھا ہے، اس کی توضیح کے لئے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہونگی

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عُشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اُس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بنجانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت صلعم کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے، اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مبہم تھا، کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عُشر یا زکوٰۃ فرض، اور کن کن چیزوں میں فرض ہے، شریعتِ محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی، وہ اجناس مقرر کر دیئے جن میں عُشر یا زکوٰۃ واجب ہے، انکی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، اُن کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی، اس نے یہ حکم نہیں دیا، کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بنجاؤ بلکہ یہ کہا،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ-۲۷) — لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہدے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو،

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی، کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر، دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصارؓ جنھوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرینؓ کی مصیبتیں دور کیں، اُن کی تعریف میں خدا نے فرمایا،

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ، (حشر-۱) — وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود اُن کو حاجت ہو،

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا،

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا، (دھر-۱) — خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں،

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ مین خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہی، اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ مین دوسرون کو دیتے ہین، جو سڑی گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآنِ پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجاے جو اس خیرات کا مقصد ہی، نفس کی اور دنائت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ،	تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤگے، جب تک اس مین
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ، فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ،	سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو محبوب ہے، اور جو بھی تم خرچ
(آل عمران-۱۰)	کرو، خدا کو اس کا علم ہے،

پھر فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ	اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو، اس مین کی اچھی چیزین
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	اور جو ہم تمھارے لئے زمین سے نکالتے ہین اس مین سے
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ	کچھ خدا کی راہ مین دو، اور اس مین سے خراب چیز دینے
لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ،	کا قصد بھی نہ کرو، کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ، (بقرہ-۳۷)	چشم پوشی کرلو، اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیون والا ہے،

اس آیتِ پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو، کہ اس مین اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیون والا ہے" یعنی اُس نے اپنے بندون کو مال کے بہترین حصّہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اُس کا یہ سبب نہین کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندون کی اچھی چیزون کی ضرورت ہی، کہ وہ تو ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیون والا ہے، اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے،

سب سے پہلے تمھاری امداد کے محتاج خود وہ ہین، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال، دست نگر

عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ	لوگ تجھ سے پوچھتے ہین کہ کیا خیرات کرین، کہدے جو
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى	کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ مان باپ، رشتہ دارون
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا	یتیمون، مسکینون اور مسافر کے لئے، اور جو بھی تم نیکی کا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ، (بقرہ-۲۶)	کام کرو، اللہ اس سے واقف ہی،

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے ؟ آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگون نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فرمایا، مزدوری کرے اور جو ملے اس مین کچھ خود کھائے، کچھ محتاجون کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجتمند کی کوئی جسمانی خدمت کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے یہ بھی صدقہ ہے[1] دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا اور بُری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول مین ڈالدینا بھی صدقہ ہے[2] غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے،

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ اپنا احسان اُس پر جتاؤ، نہ اُس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمایش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت صلعم کو دوسری ہی وحی مین یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱)	اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے،

عام مسلمانون کو تاکید کیگئی،

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۴۱ مصر، [2] جامع ترمذی ابواب البر والصلہ، باب صنائع المعروف،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ	اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھکر اور جتا کر
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور خدا اور پچھلے دن
(بقرہ ۲ - ۳۶)	پر یقین نہیں رکھتا،

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے،

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ	اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اُس خیرات سے بہتر
يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ،	ہے جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے
(بقرہ ۲ ۳۶)	دل کو صدمہ پہنچایا جائے، اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے

ریا اور نمایش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو، اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ	اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے، اور اگر چھپا کر
تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ	غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے، اور
وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ	اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دیگا، اور جو کچھ تم
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ، (بقرہ ۲ - ۳۷)	کرتے ہو اللہ اُس سے خبردار ہے،
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ	جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ
النَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ	کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو ان کا ثواب اُن کے
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	رب کے پاس ہے، نہ اُن کو خوف ہوگا اور
يَحْزَنُوْنَ ، (بقرہ ۲ - ۳۸)	نہ غم،

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہئے، جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے،

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (توبہ - ۷)	وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر،

صدقہ وخیرات پکے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ	اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر
مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	اور اپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ مین خرچ کرتے ہین،
الآیہ (بقرہ ۔ ۳۶)	اُس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو،

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا	اور تم تو خرچ نہین کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ	جو خیرات کروگے، وہ تم کو پوری ملے گی، تمھارا حق
لَا تُظْلَمُوْنَ ، (بقرہ ۔ ۳۷)	کچھ دبا نہ رہیگا،

صدقہ وخیرات کی اِن تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشون کا احاطہ کیا ہے،

...ات کی حرمت ...ن جزئیات احاطہ

احکام مین یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایان طور پر نظر آتی ہے، مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہین کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہین سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہان اور نہین کے تمام پہلوؤن کو دور کر کے اس بارہ مین ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگون نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اُن کے نقصانات سے محفوظ نہین رکھا جاسکتا، اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیۃً محفوظ نہین رہ سکتے، مثلاً ایک شخص شراب نہین پیتا، لیکن اسکی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونون چیزون سے احتراز کرتا ہے لیکن اُن برتنون کو استعمال مین لاتا ہے، جن مین شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کیساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہین کرسکتا،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لعن اللہ الخمر وشاربها وساقيها وبائعها و مبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا، خدا شراب پر اس کے پینے والے پر اس کے پلانے والے پر اس کے بیچنے والے پر اس کے خریدنے والے پر اس کے نچوڑنے والے پر اس کے اپنے لئے نچوڑنے والے پر اسکے لیجانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے، لعنت کرتا ہے

مذہب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اُس کے مختلف نام تھے، اور انکا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اُس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی؛ چنانچہ آنحضرت صلعم نے اس کی تعیین فرمادی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعير خمرا، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی، اور جو سے بھی،

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول ان الخمر من العصير والزبيب والتمر والحنطة والشعير والذرة، و انی انهاكم عن كل مسكر، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار، اور ہر چیز کے نچوڑ سے بنتی ہے، اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں،

عرب کے مختلف حصوں میں انھیں چیزوں کی شراب بنتی تھی، اسلئے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا، اور یہ ممکن تھا، کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب

کی دوسری قسمیں استعمال کیجائیں، اور تحدید اُن کو شامل نہ ہو اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی،

کل مسکرٍ خمرٌ وکل مسکرٍ حرامٌ، (ابوداؤد کتاب الاشربہ وصحیح مسلم واحمد و ترمذی ونسائی) — ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے،

کل شراب اسکر فھو حرامٌ (ابوداؤد و احمد و بخاری و مسلم) — ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے،

لیکن حیلہ جُو لوگون کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کیجائے کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا،

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرامٌ، (ابوداؤد کتاب الاشربہ) — جو چیز زیادہ مقدار مین نشہ لائے، اُس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے،

بعض چیزین ایسی ہوتی ہین جو نشہ نہین لاتین، تاہم اعصاب مین ایک خدر کی کیفیت پیدا کردیتی ہین، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزین ہین، اور تمدّن کے زمانہ مین مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہین، اس لئے آنحضرت صلعم نے انکی بھی ممانعت فرمائی،

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکرٍ و مفترٍ، (ابوداؤد کتاب الاشربہ) — آنحضرت صلعم نے ہر نشّی و مخدر چیز سے منع فرمایا،

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی نشّی چیزین استعمال کرین جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب مین اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جسکو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ نے اس کو بھی خمریات مین داخل فرمایا،

یقول لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونہا — آپ نے فرمایا کہ میری امت مین کچھ لوگ نام بدلکر

بغیر اسمہا۔ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) شراب کا استعمال کریں گے،

اُن کے علاوہ عرب مین جن برتنون مین شراب رکھی جاتی تھی، شروع مین ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی،

نھی عن الدباء والحنتم والمزفت و النقیر، آپنے کدو، سبز وسیاہ رنگ کے مرتبان، اور کھجور کی جڑ سے جس مین سوراخ کرکے شراب رکھی جاتی منع فرمایا،

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لئے آپنے آخر مین اس حکم کو منسوخ فرمادیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتین باقی رہ گئی تھین، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دیجائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت مین استعمال کیجائے، لیکن آنحضرت صلعم نے ان دونون صورتون مین بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچون نے وراثت مین شراب پائی تھی، حرمتِ خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیون نہ بنا لیا جائے، لیکن آپنے اجازت نہ دی[1]،

ایک بار دیلم حمیری نے آپ کی خدمت مین عرض کی، کہ ہم سرد ملک مین رہتے ہین اور سخت کام کرتے ہین، اس لئے گیہون کی شراب پیتے ہین کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپنے فرمایا، کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انھون نے کہا "ہان"۔ آپنے فرمایا تو اُس کو چھوڑ دو، انھون نے کہا، لیکن اور لوگ نہین چھوڑین گے، ارشاد ہوا کہ اگر نہ چھوڑین، تو اُن سے جہاد کرو[2]۔

سود کی ممانعت کا[illegible]

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیون سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی ناروا نفع سے لوگون کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزون مین کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم مین جو لوگ کسی طرح بھی شریک ہون، اُن سب کو

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۰۰ کتاب الاشربہ، اس سرکہ کے جواز وعدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ [2] ایضاً

شریک جرم ٹھہرایا،

لعن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اٰکل الربوا وموکلہ وشاھدہ وکاتبہ (ابوداؤد کتاب البیوع)

آنحضرت صلعم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی،

رشوت کی حرمت مین استقصا،

لعن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم الراشی والمرتشی،

آنحضرت صلعم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونون پر لعنت بھیجی ہے،

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات مین بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا، اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتین پیدا ہو جاتی ہین، اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت مین مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے جب تک ان تمام صورتون کو مٹا نہ دیا جاے اُس چیز کا کلیتہً قلع وقمع نہین ہو سکتا،

مسیحی اخلاق کی کمزوری

نرم وگرم اخلاق مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا مین ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی، کہ اس نے حسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم مین کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی، وغیرہ منفعل قوتون کو اخلاق کا درجہ دیا تھا، اور اس کے مقابل کی قوتون کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کی امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لئے دونون قسم کی مناسب قوتون کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندون کے لئے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے، کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے،

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا وبیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے، اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات

کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہین، جن سے لوگون مین عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم، عزتِ نفس، اور خودداری کے جوہر پیدا نہین ہو سکتے، وہ کہتا ہے،

"مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست، اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خود دارانہ قوتون کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغون کا ستیاناس کر دیا ہے"[1]

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۰ برس بعد اُس نبیِّ آخر الزمان کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیون کی تصحیح کر دی، اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اسکی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہین گذری تھی، کہ محکومون نے حاکمون کی، پستون نے بلندون کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان مین سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہین کیا،

نفوس کا اختلاف استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہین ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریون کا علاج ہو، تمام انسانون کی اندرونی کیفیتین، اخلاقی استعدادین، اور نفسانی قوتین یکسان نہین ہین، انسانون مین کمزور و پست ہمت بھی ہین اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہین اور مغرور و خود دار بھی، بزدل بھی ہین اور بہادر بھی، بردبار بھی ہین اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہین اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہین اور فیاض بھی، نا اُمید بھی ہین اور پُر امید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہین اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہین اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہین کہ سب کے لئے ایک دوا کبھی کارآمد نہین ہو سکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے

[1] نٹشے از ایم اے مگے، ترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے، باب سوم،

مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو،

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھکر جو عنصر کم ہو، اسکو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کرکے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ، اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پُرامید کرے، اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے، کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ خدا سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کرکے خدا سے مانگنے والا کردے، وہ ذلیل و خوار کو خود دار، اور خود دار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے، اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدون کی طرف پھیر کر اُن کی برائی کو کم سے کم کردے،

قوت غضب اور قوت شہوت میں تعدیل

قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر اُن کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور اُن کے مختلف مراتب سے سیکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، **غضب** کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے، اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبۂ حق، جدوجہد، سعی و محنت، جہاد، پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی، تو تہور بنجاتی ہے، اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف، اور دنائت کے قالب میں ظہور

کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت مین جب کامل اعتدال ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہین، یہی صفت مختلف سانچون مین ڈھل کر مختلف نامون سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاکدامنی، پرہیزگاری، جود وسخا، شرم وحیا، صبر وشکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل واولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہین،

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق،

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونون غضبی اور شہوی قوتون کا استیصال ہے، اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونون کو افراط وتفریط سے ہٹا کر اُن مین توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس یہ دونون قوتین بذاتہ بری ہین، اور اسلام کے نزدیک یہ دونون قوتین بجاے خود بری نہین ہین بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہین ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کرکے دشمن کو پیار کرو، اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کرکے مجرد رہو اور مفلس وغمگین بنکر زندگی گذارو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنون کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو، اور خدائی دشمنون کے حق مین دعاے خیر کرو کہ انھین ہدایت ملے، اور خدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہین، اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہا ہے، وَالْفَاقِدِيْنَ الغيظ نہین،

مسیحی اخلاق کا

دنیا مین علم وہنر، خوشی ومسرت، ولولہ وانبساط، رونق وترقی، جد وجہد جو کچھ ہے، وہ انھی دونون قوتون کی جلوہ آرائیان ہین، اگر یہ دونون قوتین یک قلم مٹ جائین، یا ان مین افراط وتفریط پیدا ہوجائے تو نیکی ل سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مرجائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہون، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن وامان کا نشان ملے، نہ کسی کی مِلک محفوظ، اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایان ہون، تو مون کی ترقی اور ملکون کا نظام

درہم برہم ہو جائے، اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بنجائے جس مین حرکت و جنبش کا نام نہ رہے،

مسیحی اخلاقی تعلیم مین یہ نکتہ ملحوظ نہین رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہین ہے، بلکہ بیجا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزین ہین، اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونون قوتون کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہین، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنارت طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہین، اسلام نے اپنے پیروون مین ان دونون قوتون کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اُس نے جہان رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (آپس مین رحمدل) اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (مومنون کے فرمانبردار) کی تعلیم دی وہین اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (کافرون پر بھاری) اور اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (کافرون پر گران) بننے کی بھی تعلیم دی، اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور اُن کے فرمانبردارون کے حصہ مین ہے، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ مسیحی قومون کو اس وقت تک ترقی کا منھ دیکھنا نصیب نہین ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بنکر انھون نے فائدہ نہین اٹھایا، لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد مین کہتا ہے،

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

"لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزون و مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزون ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم مین خودداری ہو، اور حریت کے جذبات موجود ہون، اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہین، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیون مین تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمح نظر تھا، کسی طرح ترقی تمدن کے حق مین مفید نہین پڑسکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدون مین تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہین، لیکن عوام مین تجربہ سے

معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماے اخلاق نے بجاے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا، اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی، اور دوسرے خودداری، انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک مین جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقون مین نہین پائی جاتی، بلکہ اُن کے بجائے دنارت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہین اور سب سے بڑھکر یہ کہ اول الذکر مین سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیان ہین، اُن سے آخرالذکر یکسر خالی ہین، (فصل گیارہ)

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپکے صرف ایک سبق سے ہوسکتا ہو، فرمایا،

اِنَّ اللہَ یحب معالی الامور ویبغض سفسافہا،	بیشک اللہ معالیِ امور کو پسند اور محقراتِ امور کو ناپسند کرتا ہے،

معالیِ امور سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام، اور محقرات سے مراد چھوٹی اور دنی باتین ہین، اس حدیث مین گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لئے ضرورت ہو کہ اُس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے، اور دنارت کی چھوٹی چھوٹی باتون سے الگ رہے،

اسی کے ساتھ آنحضرت صلعم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب مین اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کردینے کے لئے کافی ہے، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آپنے فرمایا،

المومن القوی خیر واحب الی اللہ من المومن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ما ینفعک واستعن باللہ ولا تعجز،	کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہو اور ہر ایک مین بھلائی ہو، ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر، اور خدا سے مدد چاہ،

وان اصابك شيئ فلا تقل لو انی فعلت كان	اس راہ میں کمزوری نہ دکھا، اور اگر تجھے اس میں کچھ
كذا وكذا ولكن قل قدر الله وما شاء	تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ کہ اگر میں یوں کرتا تو یوں
فعل فان لو تفتح عمل الشيطان،	ہوتا بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا، اور جو چاہا اس نے
	کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے

تقدیر، توکل، صبر اور شکر یہ حدیث اُن تمام مسائل کی شرح کرتی ہے، جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر، اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے، اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں، اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پُرامیدی، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیئے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کرکے کام شروع کر دینا چاہیئے، اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے، اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ خدا کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے،

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ	جب تم پکا ارادہ کرلے پھر خدا پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے، اگر خدا
يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ، إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا	تمہاری مدد کریگا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں،
غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي	اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد
يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	کر سکتا ہے، خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا
الْمُؤْمِنُونَ، (آل عمران - ۱۷)	چاہیئے،

ل صحیح مسلم کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ،

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا	کوئی مصیبت نہین آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ
فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ	اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الہی) مین درج
نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ	ہوتی ہو یہ اللہ پر آسان ہے یہ اس لئے تاکہ اس پر جو
لِّـكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ	تم سے جاتا رہو غم نہ کرو، اور جو تم کو اللہ دے اس پر
اٰتٰٮكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ (حدید)	اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہین کرتا

ان آیتون سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام مین پستی اور ونارت کے لئے نہین بلکہ مسلمانون مین ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتون اور فوجون کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے، اُن کو مشکلات مین خدا کے دوسرے برگزیدون کی یہ دعا سنائی گئی،

رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا	اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر و ثبات کا پانی بہا اور ہمارے
وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ، (بقرہ ۔ ۳۳)	پاؤن کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگون پر فتحیاب کر،

اور بتایا کہ مشکلات مین دوسرے پیغمبرون کے ساتھیون نے کیا کیا،

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ	اور کتنے نبی تھے کہ اُن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والون
كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ	نے لڑائی لڑی، تو خدا کی راہ مین جو مشکل یا مصیبت
وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ	پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوے اور نہ کمزور
الصّٰبِرِيۡنَ ، وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا	ہوئے، اور خدا ثابت رہنے والون کو پیار فرماتا
رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ	ہے، اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے
اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى	پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا
الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ، (اٰل عمران ۔ ۱۵)	معاف فرما، اور ہمارے پاؤن مضبوط رکھ اور

(ہم کو کافر قوم پر فتح دے)

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے،

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا	اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہو، اور
وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔	دشمن کے مقابلہ مین ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو
(آل عمران ۲۰)	اور اللہ سے تقوی کرو تاکہ کامیاب ہو

ان آیتون سے معلوم ہوگا، کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات مین صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اُسکے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اسی طرح سطوت اور بہادری وحکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے،

اپنے دشمنون کو پیار کرو مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زرین اصول یہ ہے، کہ اپنے دشمنون کو پیار کرو، اس مین شک نہین کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینون کی آنکھین خیرہ ہو جاتی ہین، لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسرین[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کیساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق مین دعاے خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہین کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہین،

اخلاقِ محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے، اور اللہ کے بندون نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنون کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والون کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائین دین، اُن کو دعا دو، جو تمھارا قصور کرین، اُن کو معاف کرو، اور جو تم پر ظلم کرین، اُن کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ	اے ایمان والو اخدا کے لئے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف
شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ	کے ساتھ گواہ بنکر، اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف

---

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی،

قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ	کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو، کہ انصاف کرنا
لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ	پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے، اور خدا سے
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (مائدہ ۔ ۲)	ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے،
وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ	بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ	کرو، تو دفعتہ وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی
بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا	ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا، اور اس
یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ	پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں،
اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ	اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسمت والے
مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ	ہیں، اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو
هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ (حٰمٓ السجدہ ۔ ۵)	کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے،

۱۔ اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے،

۲۔ اس آیتِ پاک میں جس نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے، جو تمہارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا،

۳۔ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا، اور اُس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے، اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباسؓ جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی

تفسیر مین کہتے ہین[1]،

"اللہ تعالی نے مسلمانون کو غیظ وغضب کی حالت مین صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو ودرگذر کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کرین گے، تو خدا ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا، اوران کا دشمن بھی دوست کی طرح اُن کے آگے سر جھکا دے گا"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق کو جو آنحضرت صلعم کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سنکر چُپ رہے اُس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت صلعم فوراً اُٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ مجھسے خفا ہوے، فرمایا" اے ابوبکر جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا[2]"

آپنے فرمایا"صلۂ رحم یہ نہین ہے کہ صلۂ رحم کرنے والون کے ساتھ صلۂ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اُس کے ساتھ صلۂ رحم کرو[3]" یعنی دوستون کے ساتھ دوستی کوئی بات نہین، بلکہ دشمنون کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبوی مین آکر عرض کی یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے، جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپنے اس کو چند باتین بتائین، منجملہ اُن کے فرمایا، ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتون کی بارش کردو[4]"

اسلام کی نظر مین کافر مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دشمن نہین ہوسکتا لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانون کو اپنے ایسے دشمنون کے ساتھ بھی عفو ودرگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ (اے پیغمبر) مسلمانون سے کہدے کہ ان کو جو خدا

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۱۲، و ابن جریر جلد ۲۴ ص ۶۰ مصر، [2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی الانتصار [3] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۸۸۶، [4] مستدرک حاکم کتاب المکاتب جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ حیدر آباد دکن،

اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ	کے دنون پر یقین نہین رکھتے معاف کر دیا کرین،
(جاثیہ - ۲)	تاکہ خدا ایسے لوگون کو اُن کے کرتوتون کا بدلہ دے،

اگر عملی مثالین چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیون[1]" اور "سانپون اور سانپون کے بچّون[2]" والی مسیحیت کے واعظ مین نہین بلکہ اسلام کے اُس اوّلین داعی و واعظ مین ہے، جس نے فاتح بنکر، مفتوح ہو کر نہین، حاکم ہو کر محکوم بنکر نہین، یہ یک دفعہ مکہ کے ان ہزارون دشمنون کو معاف کر دیا جن مین سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا[3]، جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اُسکے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سُنکر اس کا تعاقب کیا تھا[4]، جس نے خیبر مین اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا[5]، جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا[6]، جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا[7]، جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا[8]، جس نے تنعیم کی وادی مین قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا[9]، جو اسکے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان مین جب وہ محو خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو مین پا کر معاف کیا[10]، جس نے اُن طائف والون کے حق مین دعائے خیر کی جنھون نے اس پر کبھی پتھرون کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤن خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے اُحد کے میدان مین اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والون کو نیک دعا دی[11]، جس نے دشمنون کے حق مین بد دعا کرانے والون کو کہا کہ مین دنیا مین لعنت کے لئے نہین، بلکہ رحمت کے لئے آیا ہون[12]، صلی اللہ علیہ وسلم، انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی،

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ	لیکن جن مشرکون سے تم نے عہد باندھا
يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا	پھر اُنھون نے تم سے کچھ کم نہ کیا،

---

[1] انجیل متی ۲۳-۲۵-۳۳ [2] صحیح بخاری باب فتح مکہ، [3] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ [4] صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی [5] صحیح بخاری فتح طائف [6] صحیح بخاری باب فتح مکہ [7] کتب سیر طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ و ہبار بن اسود [8] جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح ص ۵۴۰ [9] صحیح بخاری کتاب المغازی [10] ابن سعد غزوۂ طائف [11] فتح الباری ج ۶، ص ۲۲۶ مصر باب حد [12] صحیح بخاری بعث النبی صلعم و مشکوٰۃ اخلاق النبی صلعم بحوالہ مسلم،

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (توبہ - ۱)

اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو اُن کا عہد اُنکی مدت مقرر تک پورا کرو اللہ پرہیزگارون کو دوست رکھتا ہے،

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے اُن احکام کو پیش کرتے ہین جنمین مسلمانون کو کافرون اور مشرکون کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علٰحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروون کو اُس کے اُن مخالفون کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہون خصوصاً ایسے وقت مین جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹادینے کی کوششین ہو رہی ہون، اور طرفین مین لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہین پھیلا کر اس کے پیروون کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہون، چنانچہ اس قسم کی آیتین،

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا (آل عمران - ۳)

ایمان والے مسلمانون کو چھوڑ کر کافرون کو اپنا دوست نہ بنائین، تو جو ایسا کریگا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہین، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ، (توبہ - ۳)

اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیون کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھین اپنا دوست نہ بناؤ، اور تم مین سے جو کوئی اُن سے دوستی رکھیگا تو وہی حد سے گذرنے والے ہون گے،

اسی موقع کی ہین، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہون تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃً اُن اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علٰحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہون، اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم

کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہین "جو شہزادہ امن" کے اس اعلان کے ہین،

"یہ مت سمجھو کہ مین زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہین، بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہون کیونکہ مین آیا ہون کہ مرد کو اُس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں، اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کرون، آدمی کے دشمن اُس کے گھر کے لوگ ہون گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہین، (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق مین یہودیون کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی، جو دُوسرے نادان بت پرستون اور گنہگارون کے ساتھ تھی، وہ یہودیون کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیون اور سرحدِ شام کے عیسائیون سے مسلمانون کی جنگ چھڑی، اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعون کے سبب سے اُن کا پلہ مسلمانون سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقون اور کمزوردلون کی عاقبت بینی اور دوراندیشی اُن کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنون سے سازباز رکھین، تاکہ اُن کے مقابلہ مین اگر مسلمانون کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانون کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانون کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَ	اے ایمان والو! یہودیون اور نصرانیون کو رفیق
النَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ	نہ بناؤ، وہ آپس مین ایک دوسرے کے رفیق ہین اور
وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ	جو کوئی تم مین سے ان سے رفاقت کرے، وہ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، فَتَرَى الَّذِينَ	انہی مین ہے، اللہ بے انصاف لوگون کو راہ
فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ	نہین دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے، جن کے دل

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا
عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ، وَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ
يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ،

(مائدہ - ۸)

میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے
ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ
آجائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا
(اُن کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے
بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے
لگیں، اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ
کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اکارت
گئے اُن کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں، اے
ایمان والو اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھریگا
تو خدا کا کچھ ہرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لئے اور
دوسرے لوگوں کو لائے گا، جن سے اللہ راضی ہوگا*

* اور وہ اللہ سے راضی ہونگے، جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہونگے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ-۹) ہو،

اے ایمان والو اہل کتاب اور کفار میں سے
اُن کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں
اپنا رفیق نہ بناؤ، اور خدا سے ڈرو، اگر یقین رکھتے

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ، اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ
دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ
تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے جتنی تم کو تکلیف

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ، (آل عمران - ۱۲)

پہنچے اُن کو خوشی ہو، دشمنی اُن کی زبان سے نکلی پڑتی ہے، اور جو اُن کے جی مین چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتین جتا دین اگر تم کو عقل ہے،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانون کو ملا ملا کر مسلمانون کے منصوبون اور نقشون کی جاسوسی کرتے تھے، اور بھیدون کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام کے لئے مسلمانون کو اُن کی رفاقت اور سازباز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ مین ہے، فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ، لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ، (ممتحنہ - ۱)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنون کو دوست نہ بناؤ کہ تم اُن کو دوستی کا پیغام بھیجو، اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہین، وہ رسول کو اور تم کو اس لئے گھر سے نکالتے ہین کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے، اگر تم میری راہ مین لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب مین نکلو، تو تم اُن کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو، اور مجھے خوب معلوم ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم مین سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تمکو موقع سے پائین تو تمھارے دشمن ہون اور تمھاری تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائین اور برائی کے ساتھ اپنی زبانین کھولین اور چاہتے ہین کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ، تمکو تمھاری قرابت اور تمھاری اولاد سے کچھ نفع نہین پہنچ سکتا۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنئے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	خدا تم کو ان لوگون کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے
فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	سے باز نہین رکھتا، جو تم سے مذہب مین لڑائی
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	نہین کرتے، اور نہ تم کو تمھارے گھرون سے نکالتے
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ، اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ	ہین، خدا انصاف والون کو پیار کرتا ہے، وہ انہی
الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ	سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب مین
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ	لڑائی لڑین اور تم کو تمھارے گھرون سے نکالین
اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ	اور تمھارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار ہین،
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، (ممتحنہ-۲)	جو ان سے دوستی کا دم بھریگا، تو وہی بے انصاف ہونگے

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنادی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائیگی۔ فرمایا،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ	امید ہے کہ اللہ تمھارے اور تمھارے دشمنون
عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (ممتحنہ ۲)	کے درمیان دوستی پیدا کردے، اور اللہ قدرت والا ہے

ان آیتون کا مطلب اُن کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہوجاتا ہے، انہی مین سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بیخبری مین مکہ پر قبضہ کرلینا چاہتے تھے، تیاریان ہورہی تھین کہ ایک مسلمان حاطب رضؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کردیا، کہ قریش خبردار ہوجائین، آنحضرت صلعم کو خبر ہوگئی، آپنے دو سوارون کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئین، وہ خط آیا تو آپنے حاطب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی یا رسول اللہ جلدی نہ فرمائیے، بات یہ ہے کہ مین قریش مین رہتا ہون، لیکن اُن سے میرا کوئی نسبی تعلق نہین

اور جس قدر مہاجر ہیں وہان ان کی قرابتین اور رشتہ داریان ہین جن کے سبب سے اُن کے خاندان کے لوگ محفوظ ہین، میری وہان کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو مین نے چاہا کہ مین ان پر یہ احسان کرون تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کرین، مین نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہین کیا، آپ نے فرمایا تم بدر والے لوگ ہو خدا نے تمھارے گناہ معاف کئے ہین، اس پر یہ آیت اتری، یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا، اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنون کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ احکام اسی قسم کے ہین جو عہد عتیق مین بھی مذکور ہین، زبور مین ہے،

"اے خدا تو یقیناً شریرون کو قتل کریگا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتین کرتے ہین، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہین، اے خداوند کیا مین ان کا کینہ نہین رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہین، کیا مین ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہین، بیزار نہین، مین شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہون، مین انھین اپنے دشمنون مین گنتا ہون" (۱۳۹-۱۹-۲۲)

یشوع کے صحیفہ مین ہے،

"اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہوا اور ان لوگون کے بقیہ سے لپٹو جو تمھارے درمیان باقی ہین، اور ان کے ساتھ نسبتین کرو، اور ان سے ملو، اور وہ تم سے ملین تو یقین جانو کہ خداوند تمھارا خدا پھر ان گروہون کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کریگا، بلکہ وہ تمھارے لئے پھندے اور دام اور تمھاری بغلون کے لئے کوڑے اور تمھاری آنکھون مین کانٹے ہونگے، یہان تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمھارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤگے، (یشوع باب ۲۳-۱۲)

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ،

قرآن پاک اور احادیث مین بعض احکام ایسے بھی ہین جنہین منکرون، ظالمون، بدکارون اور گنہگارون سے علحدہ رہنے کی نصیحت ہی،

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ	وہ چاہتے ہین کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انھون نے
سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى	کفر کیا، تو ان مین سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہان
يُهَاجِرُوا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، (نساء-۱۲)	تک کہ وہ خدا کی راہ مین ہجرت نہ اختیار کرین،
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِىْ اٰيٰتِنَا	اور جب تو اُن کو دیکھے، کہ جو میری آیتون کی شان
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ	مین لغو بکتے ہین، تو اُن سے کنارہ کرلے، یہانتک
غَيْرِهٖ ، وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا	کہ وہ اس کے سوا دوسری بات مین لگ جائین،
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ	اور اگر تجھکو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد
(انعام-۸)	پھر ان گنہگار لوگون کے ساتھ نہ بیٹھو،
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا	اور تم پر کتاب مین یہ حکم اتار چکا کہ جب تو اللہ کی
سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ	آیتون سے انکار ہوتے، اور ان پر ہنسی ہوتے،
بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا	تو اُن کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ
فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ	کرنے لگین نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے
(نساء-۲۰)	ہوجاؤ گے،

یہ احکام اس لئے ہین تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانون پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہین، جو سینٹ پال کے ان فقرون کے ہین،

"مین نے خط مین تم کو لکھا کہ حرامکارون مین مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرامکارون یا لالچیون یا لٹیرون یا بت پرستون سے نہ ملو، نہین تو تمھین دنیا سے نکلنا

ضرور ہوتا، پر مین نے اب تمھین یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لالچی، یا بت پرست، یا گالی دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا۔ . . . غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو، (اول قرنتیون ۵)

اور تم بے ایمانون کے ساتھ نالائق جوئے مین مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی مین کونسا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی مین کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتون سے کون سی موافقت ہے۔ . . .
اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم اُن کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ، (۲ قرنتیون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی، اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق مین مسلمانون کو اُن سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت مین بھی یہ حکم ہے،

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر مشرکون مین سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے،
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	تو اس کو پناہ دے، یہانتک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے
مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ	پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے، یہ
(توبہ-۱)	اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہین،

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک مین یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہون تو بھی اُنکی خدمت بجالانا، اور دنیاوی معاملات مین اُن کے ساتھ حسن سلوک کرنا اُن کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا،

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ،

(لقمان - ۲)

اور اگر وہ دونون (والدین) اس پر ضد کرین کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہین تو اُن کی بات نہ مان، اور دنیا مین اُن کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر، اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے، پھر مین تم کو جتاؤنگا، جو تم کرتے تھے،

مذہبی دشمنون کیساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور اُن کے ساتھ نیک برتاؤ مین کوئی کوتاہی نہ کیجائے،

سختی کا جائز موقع اس مین شک نہین کہ اسلام مین نہ صرف کفار بلکہ اُن کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح مین منافقین کہتے ہین، بعض موقعون پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانون کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانون کے ساتھ آباد ہین وہ دھوکے سے دشمنون کیساتھ میل اور سازش نہ کرلین، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانون کے اندر رہ کر ان کی جماعت مین تفرقہ پردازی کرین اور طرح طرح کے شبہون اور افواہون سے مسلمانون کی جمعیت مین پریشانی پیدا کرین، اس حالت مین ان کافرون اور منافقون کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کیجائے اور مسلمانون کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑین تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے، یہان تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجائین، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتین سورۂ توبہ مین ہین،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ، يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ

اے پیغمبر! کافرون اور منافقون سے جہاد کر اور اُن پر سختی کر، اور اُن کی جائے پناہ دوزخ ہے، وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے

قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ	ہیں کہ انھون نے ایسا نہین کہا، حالانکہ انھون نے
وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا	یقیناً کفر کی بات کہی، اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر
أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ	کیا، اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ پا نہ سکے
فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ وَ	اور انھون نے عیب نہین کیا، لیکن یہی کہ خدا اور
إِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا	اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے اُن کو دولتمند
أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ	کر دیا، تو اگر وہ باز آجائین تو اُن کے لئے یہ بہت اچھا
فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ،	ہے، اور اگر وہ منھ پھیرین تو اللہ ان کو اس دنیا مین
(توبہ — ۱۰)	اور آخرت مین دردناک سزا دیگا، اور زمین مین نہ

[illegible]

یہ آیتین اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہین، اور اُن کے آگے اور پیچھے جو اور آیتین ہین، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہین، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ مین مسلمانون کو رومیون کے مقابلہ مین اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ	اے ایمان والو! اُن کافرون سے لڑو جو تمھارے
مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً	ہم سرحد ہین اور چاہئے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائین
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ، (توبہ ۱۶)	اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگارون کے ساتھ ہے،

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانون کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کرین،

تحریم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہلِ بیتِ نبوی مین پھوٹ ڈال کر مسلمانون کی جماعت مین افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ	اے پیغمبر! اُن کافرون اور منافقون سے جہاد کر

لہ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰ صفحہ ۹۴، مصر،

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (تحریم-۲)
اور ان پر سختی کر اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے،

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے علانیہ شریک ہو گئے تھے قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بیرحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں، اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابۂ کی بہادری اور دوسری طرف اُنکی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح-۴)
محمد خدا کے رسول اور جو اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں، اور آپس میں اہم محبت رکھتے ہیں،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ وہ کافروں پر سخت ہیں۔ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگدلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں، کہ کفار اُن سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان اُن پر ایسے بھاری ہیں، کہ کفار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی اُن پر غالب اور اُن کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، اُن سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں، جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں،

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ) فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے، اور بھاری ہیں کافروں پر

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورۂ ہود میں ہے،

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ، (ہود - ۸)	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے،

دوسری آیت میں ہے،

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، (توبہ - ۱۶)	تمھاری تکلیف رسول پر گران ہے،

لسان العرب میں ہے،

ورجلٌ شديدٌ قويٌّ والجمعُ اشدّاء (جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ مصر)	مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشدّاء ہے،

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہی معنی مراد لئے گئے ہیں،

اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ، (طٰہٰ - ۲)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر،
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا، (نبا)	اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے،
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ، (ص ۲)	اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی،
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، (قتال - ۱)	پھر مضبوط باندھو،

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے، اور یہی صحابۂ کرام کی صفت تھی، انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پر زور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھدیا، اُن کے تیروں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھار سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کر چکے

تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے، اور مسلمانون کی ایمانی قوت کا رعب اُن پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (آل عمران وانفال) کہ مین ان کافرون کے دلون مین مسلمانون کا رعب بٹھا دونگا وہ بالآخر پوری ہوئی، اور فرمایا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب وحشر-۱) اُن کے دلون مین مسلمانون کا رعب ڈال دیا،

مخالفون کے دلون مین اسی رعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے،

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (انفال) ان کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے، اور گھوڑون کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنون کو مرعوب کرو،

اس آیت کا یہ مطلب نہین کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمھارا سازو سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمھارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانون پر فرض ہے، اور آنحضرت صلعم نے جہاد کی غرض سے گھوڑون کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ مین باندھتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے، اس کے لئے پردہ پوش ہے، اور جو نمایش کے لئے باندھتا ہے، وہ اس کے لئے عذاب ہے[1]، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ مین نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفون کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدمِ موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیون کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروون کو نہین روکا ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد،

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں، اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے، تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں، اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بنجائے، اس لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے، کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے، اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خودغرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو، صلح و جنگ، دوستی و دشمنی، رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو، وہ خدا کے لئے ہو، الحبُّ فی اللهِ والبغضُ فِی اللهِ،

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، اگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کیجائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کریگا تو شر سے نفرت بھی کریگا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا، تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے، اور ایک ہی دل میں

ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونون کی محبت یکجا نہین ہو سکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ (احزاب-۱) خدا نے کسی کے سینہ مین دو دل نہین بنائے،

ع سینہ مین کسی شخص کے دو دل نہین ہوتے،

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

"کوئی آدمی دو آقاؤن کی خدمت نہین کر سکتا، اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا، یا دوسرے سے دوستی، یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا، تم خدا اور مال دونون کی خدمت نہین کر سکتے، (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولون نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس[1] نے خدا اور آدمی، یعقوب[2] نے خدا اور دنیا، یوحنا[3] نے خدا اور دنیا کے برے کامون کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا، وہ دوسرے سے نہین،

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ مین ہے کہ محبت اور عداوت دونون صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے، اپنی ذات کے لئے نہین، بیہقی کی شعب الایمان مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے ابوذر سے پوچھا کہ "ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے"، عرض کی خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے"۔ فرمایا یہ کہ "باہمی میل جول خدا مین ہو، محبت بھی خدا ہی مین ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی مین ہو"[4] مسند احمد مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ "کونسی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے"، کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا "تمام نیکیون مین سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا ہی کیلئے محبت اور خدا ہی کیلئے مخالفت ہو"،

اسلام مین کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہین

خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضمندی کے یہ معنی ہین کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ مین کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا

[1] گلیتون کے نام ۱-۱۰ [2] یعقوب ۴-۴ [3] یوحنا ۲-۱۵ [4] مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ،

بیزاری نہ ہو، بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو، اور اس کے سبب سے اس شخص سے علحدگی و بیزاری ہو، جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآنِ پاک کی ایک آیت ہے،

حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّهَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ ؕ (حجرات - ۱)

خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے لیے ناپسندیدہ بنایا

اس آیتِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ، (توبہ - ۲)

تو اگر وہ کفر سے توبہ کریں، اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں،

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے، اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدایشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے، اور نہ غیر قوم ہے، اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے، اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے، اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلالِ حبشی، صہیبِ رومی اور سلمانِ فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی حکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے، بیک نظر اُن کی قلب کا یا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے، اور مسلمان اُن کے فدائی بن گئے، اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا،

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے، تو اس نے تمہارے
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا،	دلون مین باہم الفت پیدا کردی اور تم اس کے فضل و
(آل عمران - ۱۱)	کرم سے بھائی بھائی بن گئے،

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے، توبۂ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبۂ رحمت و شفقت سے مبدّل ہوجاتا ہے، مبشرِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے گنہگارون کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	اے میرے وہ بندو جنھون نے گناہ کر کے اپنے
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، خدا
يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ	سب گناہون کو معاف کرسکتا ہے، وہ بخشنے والا
الرَّحِيْمُ، (زمر - ۶)	اور رحم کھانے والا ہے،

آپ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو" یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نے گنہگارون کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور اُن کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا، اور ان کو رضاے الٰہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اسکی سزا بارہا بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم مین پکڑ آئے تو صحابہؓ نے کہا خدا اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت صلعم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا، تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے[۱]، اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے، کہ گناہگار پر بد دعا نہ کی جائے[۳]، ماعز بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھون نے خدمتِ نبوی

[۱] صحیح بخاری کتاب الحدود، [۲] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ، [۳] فتح الباری شرح حدیث مذکور،

مین حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی، اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت صلعم نے کئی دفعہ ان کی درخواست ردّ کی
لوگون سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہین، سب نے کہا ایسا تو نہین ہے۔ اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا،
وہ میدان مین کھڑے کئے گئے، اور اُن پر سنگ باری کی گئی، اور اسی حال مین انھون نے جان دی صحابہ
مین بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو برا کہتے تھے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو فرمایا، "ماعز
کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم مین بانٹی جائے تو اس مین سب
کی گنجایش ہو سکتی ہے[1]"

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا، اور سزا کی درخواست کی،
آپ نے فرمایا کہ وضعِ حمل کے بعد آنا، وہ اس کے بعد آئی، فرمایا بچہ کی پرورش کرو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا،
وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی، اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہین ہوا
تھا، آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹین اُڑ کر حضرت خالد بن ولید
کے منھ پر پڑین، انھون نے عورت کو برا کہا، آنحضرت صلعم نے سنا تو فرمایا کہ خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے
ہاتھ مین میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے، کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا[2]"

ترکِ ہوی | آنحضرت صلعم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے، کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اسکی
غرض وغایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے تو وہ نیک اور اچھا
ہے، اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے تو وہ نیکی نہین اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام
قرآنِ پاک مین هوی ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال واعمال واخلاق کو ہوی سے پاک رکھے
کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے، جس کے لئے وہ کام کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُن لوگون کو جو دینِ حق کے
پیرو نہین اور اپنے کامون کی بنیاد اخلاص پر نہین رکھتے، یہ کہا کہ اُن کا دین و مذہب اپنی خواہشِ نفسانی

---

[1] و [2] یہ دونون واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود مین ہین،

کی پیروی ہے، اور ان کے سینون کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش وہوی کے بت چھپے ہین قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتون مین متنبہ کیا،

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ، (جاثیہ-۳)

اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اسی لئے نفس کے تزکیہ وصفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعتِ محمدی نے ترکِ ہوی کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض وغایت نہ ٹھہریگی، اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہیگا، اسی لئے اسلام کی تعلیم مین ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہین، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا وہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی وضلالت پیدا ہوتی ہے، وحیِ محمدی نے فرمایا،

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ، (قصص-۵)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی،

پھر فرمایا

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص-۲)

اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیگی،

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ہوی کے زہرِ قاتل سے مرجاتی ہے، فرمایا،

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا ، (نساء-۲۰)

عدل مین نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو،

ہوائے نفسانی تمام برائیون اور بدیون کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا، اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے، فرمایا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (نازعات-۲)

اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہی اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبت الٰہی
دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے، عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے، اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیِ خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا،

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران-۴)

کہدو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کریگا،

اس لئے آنحضرت صلعم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآنِ پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں، اور اس دولت سے محروم کون ہیں، اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں میں جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے، اور ان امور میں جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے،

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں،

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (آل عمران ۷)

اور خدا ایمان والوں کا دوست ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، (بقرہ ۲۴ و مائدہ ۳)	خدا اچھے کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (بقرہ ۲۰۲)	خدا توبہ کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ، (آل عمران ۱۷)	خدا توکل کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ، (مائدہ، حجرات)	خدا انصاف کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ، (توبہ ۱)	خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ، (آل عمران ۱۵)	اور خدا صبر کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ، (توبہ ۱۳)	اور خدا پاک صاف رہنے والون کو پیار کرتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ (صف ۱) خدا انکو پیار کرتا ہی جو اس کی راہ مین لڑتے ہین،

ان آیاتِ پاک مین نو باتین ایسی بیان کی گئی ہین جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہین، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد،

حسب ذیل صفتین وہ ہین جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہین،

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ، (آل عمران ۴)	تو خدا کافرون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ، (بقرہ ۲۴ و مائدہ ۲۰)	خدا حد سے بڑھنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا، (نساء ۶)	خدا اس کو پیار نہین کرتا، جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا، (نساء ۱۶)	خدا اسکو پیار نہین کرتا جو خیانت کار گنہگار ہو،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ، (انفال ۷)	خدا خیانت کرنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (حج ۵)	خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ، (قصص ۸)	خدا اترانے والون کو پیار نہین کرتا،

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ، (قصص ۸)	خدا فساد کرنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ، (انعام ۱۷)	خدا فضول خرچ لوگون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ، (نحل ۳)	خدا مغرورون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ، (شوریٰ ۴)	خدا ظالمون کو پیار نہین کرتا،
وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ، (بقرہ ۳۸)	خدا ناشکر گنہگارون کو پیار نہین کرتا،

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے مین حد سے آگے بڑھ جانا، فخر، غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیان ہین، جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہین،

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب مین محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے،



تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب،

آنحضرت صلعم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی یعنی لوگون کو سکھانا اور بتانا، اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتون کا پابند اور بری باتون سے روک کر آراستہ وپیراستہ بنانا، اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ. (بقرہ ۴-۱۵)

وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا اور پاک وصاف کرکے نکھارتا ہے،

اور اسی لئے حدیث مین آیا ہے کہ

وانما بعثتُ معلّما، (ابن ماجہ باب فضل العلماء)

اور مین تو معلّم بناکر بھیجا گیا ہون،

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلّمِ ربّانی نے کن طریقون سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا،

ایک کامیاب معلّم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اُس مین اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونون ہون، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ مین نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے، اور دوسرے ہاتھ مین مرہم ہو، جس سے زخم مین ٹھنڈک پڑجائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو مین سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کرسکتا ہے، اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت وپوست پیدا کرسکتا ہے،

آنحضرت صلعم کی تعلیمِ اخلاق کے طریقون پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم اپنی

تعلیم مین سختی اور نرمی کے موقع ومحل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہین کہ آپنے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہین لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے[1]، قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم مین پکڑی گئین، بعض مسلمانون نے اُن کی سفارش کرنی چاہی تو آپنے فرمایا تم سے پہلے کی قومین اسی لئے تباہ ہوئین کہ جب اُن مین معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اُن کو سزا دیتی تھین، اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو اُن کے احکام ٹال جاتے تھے[2]،

یہ تو سختی کی مثالین ہین، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی مین ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہین مسجد کے صحن مین بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چارون طرف سے اس کے مارنے کو دوڑے، آپنے روکا، اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہین بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہین، یہ نجاست کے لئے موزون نہین، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہین، پھر لوگون سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[3]،

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان مین بحالتِ روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگون سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو، انھون نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلعم کے پاس پہنچا، اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہین، فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی مین تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلا دو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہین، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ، اور جو بچے وہ تم اور تمھارے گھر والے کھائین، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ مین آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے، اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی[4]،

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہان حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف

---

[1] صحیح بخاری باب قول النبی صلعم یسروا ولا تعسروا [2] صحیح بخاری کتاب الحدود [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول، [4] ابوداؤد، باب فی الظہار،

ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل ورذائل کا موقع ہوتا تھا آپ نرمی سے سمجھا دیتے، اور لطف ومحبت سے فرما دیتے تھے، ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بنا کر کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ کہیں اُس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے،

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا،

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ	بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا
ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ	حکم کرتا ہے اور بیحیائی کی بات، اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ،	سے منع کرتا ہے تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے، تاکہ تم
(نحل - ۱۳)	نصیحت پکڑو،

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور اُن سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اُس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون وچرا کی گنجایش نہیں؛

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ، اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہو جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (بقرہ - ۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہو زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے، اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے،

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے"
قرآن نے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ-۳۶) "اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں فدا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی، اور چٹان دُھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا"
بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ "جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" (نساء-۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی: "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے" (حجرات ۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے" آنحضرت صلعم نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے" اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے،

قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا، اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آکر عدالتِ نبویؐ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضورؐ نے تحقیقات کے بعد اُس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہو چکا، تو آپ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا، اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا، حضورؐ یہ سنکر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے، کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ نے پکارا کہ فلاں فلاں صاحب کہاں ہیں، انھوں نے کہا ہم یہ ہیں یا رسول اللہ! فرمایا تم اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا، فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات تھیؐ،

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

له سنن ابی داؤد کتاب الحدود،

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا "مسلمانو! شراب جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے، اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔" (مائدہ-۱۲) شراب اور جوے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا نتیجہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے، اور انسان ان میں پھنسکر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے،

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا،

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء-۲۱)	اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ بھی معاف کرنے والا قدرت والا،

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے[1]،

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا نہیں،

اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ (صحیح مسلم و ترمذی)	اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے،

---

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکور ج ثالث ص۳۵۵،

اس لئے بندون کو بھی چاہئے کہ اپنے طور وطریق ولباس مین سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھین،

مسلمانون مین عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۳) تمہارے لئے اللہ کے رسول مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

حق کے مقابلہ مین ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ سے دیگئی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (ممتحنہ-۱) تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیون مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

ان دونون آیتون مین اخلاق کی بعض صفتون کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے اس کی بڑائی ظاہر کی گئی اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے،

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانون کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یون ذہن نشین کرایا،

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بنی اسرائیل ۳) بے شبہ فضول خرچ شیطانون کے بھائی ہین،

اب کون ہے جو شیطانونکا بھائی ہونا پسند کریگا،

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبون سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربون کے ذہن نشین کردی، جابر بن سلیم ایک صحابی دربار نبوت مین اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہین، کہ مین نے دیکھا کہ مجلس مین ایک شخص بیٹھا ہی جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجا لاتے ہین، مین نے پوچھا یہ کون ہے، لوگون نے کہا یہ اللہ کے رسول ہین، یہ سنکر مین نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپ پر سلام، (علیک السلام) آپ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، مین نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہین؟ فرمایا ہان مین اس اللہ کا رسول ہون جس کو تم تکلیف مین پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کردیتا ہے، اور جس سے خشک سالی مین مانگتے ہو تو وہ اگا دیتا ہے، اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر مین ہو، تمہاری سواری وہان گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے

پاس لوٹا دیتا ہے، مین نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا، کسی کو برا نہ کہو، جابر کہتے ہین کہ آپکے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ مین نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہانتک کہ کسی جانور کو بھی برا نہین کہا، آپنے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کئے جاؤ، اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمھارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے، اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہین تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی[1] ہے، اور اللہ غرور کو پسند نہین فرماتا، اور اگر تمھین کوئی گالی دے، اور تم مین جو برائی وہ جانتا ہے، تم کو اسکی عار دلائے، تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا[2]۔

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے، کہ آپنے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقع یاد دلائے جو اس کی زندگی مین خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہونگے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا، اور حضور اقدس صلعم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مرض کی حالت کو دیکھکر نسخہ تجویز کرے، یہ نہین کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے مختلف پوچھنے والون کے جواب مین ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتین بتائین، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اُس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیرین بتائین،

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر، اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دُہرایا، آپنے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر[3]، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اُس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص مین غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیان ہو جاتی ہونگی، اس لئے آپنے اس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر مین معمولی سمجھا، اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی۔

---

[1] عرب امرا فخر و غرور کے لئے ایسا کرتے تھے، جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹکر چلنا، دوسری قومون مین شاہانہ غرور کی نشانی تھی، [2] سنن ابی داؤد، باب فی اسبال الازار [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب

لیکن آپنے ہربار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو،

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کامون مین بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ مین جہاد کرنا، پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر مین زیادہ پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کامون مین سے کچھ نہ کرسکون فرمایا تو کسی بیکس کی مدد کرو یا کسی بے سلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ ہو سکے، فرمایا کہ شر سے لوگون کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو، (ادب المفرد بخاری صفحہ ۴۹ مصر)

کبھی آپ یہ کرتے کہ لوگون سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ انکی اس توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو اُن کے دل مین اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپنے پوچھا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؛ لوگون نے عرض کی ہم مین مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری امت مین مفلس وہ ہے جو قیامت مین گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیان لیکر آئے گا، لیکن اس نے اسکو گالی دی ہوگی، اس پر تہمت لگائی ہوگی، اسکا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا، تو اُس کی نیکیون مین سے کچھ کچھ ان لوگون کو دیدیا جائیگا، اگر اس کی نیکیان ختم ہوگئین اور اس کے ذمہ لوگون کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برائیان اس کے نام لکھدیجائینگی پھر وہ جہنم مین ڈال دیا جائیگا۔[1]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے،

اسی طرح ایک دفعہ آپنے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو، لوگون نے کہا جس کو لوگ کشتی مین پچھاڑ نہ سکین، فرمایا نہین یہ پہلوان نہین ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ مین اپنے نفس پر قابو رکھے،[2]

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہون، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو، صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہین، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم، [2] ایضاً باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب،

اولاد آگے نہین بھیجی۔ (احادیث مین ہے کہ جو بچے کمسنی مین مرجائین اور اُن کے والدین صبر کرین تو وہ قیامت مین اُن کی شفاعت کرین گے) اس طریقۂ ادا نے کس خوبی سے یہ دل مین بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہین، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت مین درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی،

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلعم تشریف لائے، اور دریافت فرمایا کہ کیا مین تمھین بتاؤن کہ تم مین سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہون کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگون کے نام لین گے) آپنے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا ہان یا رسول اللہ فرمائیے، ارشاد ہوا، تم مین سب سے اچھا وہ جس سے اچھائی کی امید کیجائے، اور جس کی برائی سے لوگ امن مین ہون، اور تم مین سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کیجائے، اور جس کی برائی سے کوئی امن مین نہو۔[1]

ایک دفعہ آپنے فرمایا کہ مجھ سے کون یہ باتین سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے، اور دوسرون کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کرین، ابوہریرہؓ نے کہا مین اے اللہ کے رسول، ابوہریرہؓ کہتے ہین، کہ آپنے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتین گنکر فرمائین، گناہون سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولتمند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگون کیلئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بنجاؤ گے، اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[2]، (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے اپنے دو جبڑون اور دونون پاؤن کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون[3]، کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اُٹھے ہونگے، ان دو فقرون کی بلاغت پر غور کرو، دونون جبڑون کے بیچ مین زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیون کی جڑ ہے، اور دونون پاؤن کے بیچ مین انسان کی شرمگاہین ہین جو ہر قسم کی بیحیائیون اور بدکاریون کی جگہ ہین

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب، [2] ترمذی اواخر کتاب الفتن، صحیح [3] جامع ترمذی ابواب الزہد [3] صحیح بخاری باب حفظ اللسان

ان دو کی حفاظت کیجائے تو انسان کی برائیون کے بڑے حصہ کی اصلاح ہوجائے،

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون، آپکے غلام ثوبانؓ نے اٹھکر کہا مین اے اللہ کے رسول: فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو، چنانچہ انھون نے کبھی کسی سے سوال نہین کیا،[۱]

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنون مین کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہوسکتا ہے، حجۃ الوداع مین آنحضرت صلعم منیٰ مین خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا، لوگو! آج کون دن ہے؟ لوگون نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہین، عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہین، سب نے کہا جی ہان، پھر پوچھا یہ کون مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائین گے، فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہین، سب نے کہا جی ہان، پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے، پھر سب خاموش رہے کہ آپ کوئی اور نام بتائین گے، فرمایا کہ یہ بلد الحرام نہین ہے، سب نے کہا جی ہان، ان سوالون سے جب سننے والون کے دلون مین اس دن، اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا، مسلمانون کا خون، مسلمانون کا مال اور مسلمانون کی آبرو تمھارے لئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام مین اور اس مہینہ مین۔[۲]

کبھی خاص خاص صاحبون کو اُن کی مناسبتِ طبع دیکھکر خاص خاص طور کی نصیحتین فرماتے، حضرت ابوذرؓ غفاری گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا: اے ابوذر! جہان رہو خدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اُسکو مٹا ڈالو گے، اور لوگون کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو،[۳]

لوگ عام طور سے سمجھتے ہین کہ صدقہ اللہ کی راہ مین صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت صلعم کو لوگون کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا "تمھارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی، یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے

---

[۱] مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵ [۲] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منی [۳] ترمذی باب ما جاء فی معاشرۃ الناس،

بھائی کے ڈول مین پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے[1]"

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانون کے دلون مین تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیون کو صدقہ بتاکر آنحضرت صلعم نے اس طریقۂ ادا سے اُن نیکیون کی کتنی اہمیت مسلمانون کے دلون مین بٹھا دی،

کبھی آپ مسلمانون سے مختلف اخلاقی باتون پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآنِ پاک مین ہے کہ جو عورتین ایمان لانا چاہین وہ بیعت میں رسول سے ان باتون کا عہد کرین کہ وہ چوری نہ کرینگی، بدکاری نہ کرینگی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالین گی، بہتان نہ باندھا کرینگی، اور کسی بھلے کام مین رسول کی نافرمانی نہ کرینگی، (سورۂ ممتحنہ ۲)

عبادہ بن صامت کہتے ہین کہ آپ نے ہم سے ان باتون پر بیعت لی کہ ہم ہر حالت مین رسول کی پیروی کرینگے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھین گے، اور خدا کے معاملہ مین کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہین ڈرینگے[2]"

یہی عبادہؓ کہتے ہین کہ مکہ مین ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے، اور اُن مین چند آدمیون کو چُن کر آپ نے نقیب بنایا تو ان مین سے ایک مین بھی تھا، آنحضرت صلعم نے ہم نقیبون سے ذیل کی باتون پر بیعت لی "ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائین گے بدکاری نہ کرین گے، چوری نہ کرینگے، اور ناحق کسی کی جان نہ لین گے، لوٹ مار نہین کرینگے، اور نافرمانی نہ کرینگے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی مین پورا کر دکھائین گے تو ہمین جنت ملیگی، اور اگر اس مین کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے[3]" اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبون نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا"

بعض دفعہ حضور صلعم ایک سوال کرتے تھے، سوال سنکر لوگ متوجہ ہوجاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دین، خود ہی جواب دیدیتے تھے، دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہین، پھر خود ہی فرمایا وہ چغلی ہے" لوگون کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا[4]" ایک بار ارشاد ہوا کہ تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہین" لوگون نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے" فرمایا تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو

[1] ترمذی فی صنائع المعروف [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۱۶، [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۶ کتاب الدیات، [4] صحیح مسلم باب تحریم النمیمہ،

کسی نے کہا اگر میرے بھائی مین وہ برائی واقعی موجود ہو تو فرمایا اگر اس مین ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان[1] ہے، ایک موقع پر ارشاد ہوا مین تمھین بتاؤن کہ جنت والے کون ہین؟ صحابہؓ نے عرض کی ہان یارسول اللہ فرمایا ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانین یا جو متواضع ہو لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کردے، پھر فرمایا کیا مین تمھین بتاؤن کہ دوزخ والے کون ہین؟ صحابہؓ نے عرض کی ہان یارسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور[2]،

کبھی آنحضرت صلعم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اُس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اُس کی اہمیت کا پورا اندازہ کرلیتے، اور مشتاق ہوکر پوچھتے کہ یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر اُن کی رگ رگ مین سرایت کرجاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یارسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیون سے امن مین نہ ہو[3]، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے" صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کس کے ساتھ، فرمایا "اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانون کے سردارون کیساتھ اور عام مسلمانون[4] کے ساتھ"،



[1] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ، [2] صحیح مسلم باب جہنم، [3] مشکوۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین [4] ایضاً بحوالہ صحیح مسلم،

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں،

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اُس کے اُن اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملین، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصّون مین تقسیم کر دیا ہے، حقوق، فضائل و رذائل اور آداب؛

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانون بلکہ حیوانون اور بے جان چیزون تک کے کچھ فرائض عائد ہین، اور یہ اُن کے حقوق ہین جنھین ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہین،

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائلِ اخلاق ہے، اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل مین سے ہے،

تیسری قسم کامون کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا ہے، اس کو آداب کہتے ہین، مثلاً اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور و طریق،

ذیل مین اسلامی اخلاق کی ان تینون قسمون کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے،



حقوق و فرائض

حقوق کے معنی | **حقوق** کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دیجائے، قرآن پاک مین اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۔ (بقرہ ۔ ۳) خدانے تمھارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزین پیدا کین،

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اُس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گونہ لگاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت مین کوشش کیجائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے، اور ان موقعون پر اس کو صرف کیا جائے جنمین خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام **حق** ہے جسکو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا،

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ، (ذاریات ۔) اور اُن کے مالون مین سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو،

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ، (معارج) اور ان کے مالون مین سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو،

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ اور قرابت والے کو اوس کا حق دے اور

السَّبِيْلِ، (بنی اسرائیل ۳) مسکین کو اور مسافر کو،

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (روم۔۴) تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو،

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ اُن کا حق ہے، اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے،

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا (انعام۔۱۷) اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو،

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا، اور اس نے اُس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی، اور پھل پھول نکلے، اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اُس کا حق ادا کرے اور اس میں اُن کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی، اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کرکے ضائع نہ کرے، کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے، اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچانا ہے،

حدیث میں آتا ہے،

انّ لزوجك عليك حقًّا ولزورك عليك حقًّا، (بخاری، صوم) تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق، اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے،

ولاهلك عليك حقًّا، (بخاری صوم) تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق،

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اُس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے: (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اُس کے اوپر حق ہے،

آنحضرت صلعم نے فرمایا،

فَاِنَّ لنفسک علیک حقا، (بخاری، صوم) بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے،

فانّ لجسدک علیک حقًّا و لعینیک علیک حقًّا، (صحیح بخاری کتاب الصوم) تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اسکی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ اُن کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشو ونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ اُن کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اُن کے آرام و آسایش کا خیال کیا جائے، اور انسانون سے بھی کہ اُن کی ہر ضرورت مین مدد کیجائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے،

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات مین اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بنکر پھر آہستہ آہستہ گھٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے،

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہین لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بیجان اور جاندار چیزون کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ، توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے،

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزون کے دو حق انسان پر ہین، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہین اُن سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشو ونما، پرورش اور ترقی مین وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے، اور اوسکے مناسب غذا بہم پہنچانے اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونون حقوق اصل مین قرآنِ پاک کی اسی حقیقت کے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمھارے (یعنی
(بقرہ - ۳) انسانوں کے) لیے پیدا کیا،

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ اُن سے وہی کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئیں، اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، انکی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا،

آنحضرت صلعم نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ایکدفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعۃً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لئے پیدا نہیں کیا گیا میں تو کھیتی کیلئے پیدا کیا گیا ہوں[1]، اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا، اور فرمایا گیا، کہ جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]، اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]، ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اسلئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہانتک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی[4]،

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی،

حقوق کی ترتیب مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل فرمائی ہے،

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲ [2] صحیح بخاری ومسلم باب مذکور [3] فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکور جلد خامس صفحہ ۷، مصر [4] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں،

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ و انجیل کیطرح مختصر یون کہہ سکتے ہین کہ دوسرون سے محبت کرنا لیکن صرف محبت کرنا کہدینا کافی نہین، بلکہ ان چیزون کی تفصیل کرنی چاہیئے جو اس محبت کا تقاضا اور اُس کے مظاہر ہین، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپنے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لئے رکھتے ہو"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم وجان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم وجان اور مال وملکیت کیلئے چاہتا اور پسند کرتا ہی وہی دوسرون کیلئے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہی لیکن اسلام مین یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہی، اور اس تشریح کے ضمن مین انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہی جسکو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہی اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کردیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ مین ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ مین ایک دوست کی، غیرون اور بیگانون کے مقابلہ مین ایک عزیز کی، اور ان عزیزون مین بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز اور سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اُس کے مقابلہ مین اُس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت عزیزداری کی بنا پر باطل پر کیجاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح مین عصبیت (تعصّب) ہے جس سے بچنے کی[2] ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے،

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مین انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہین ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خطِ فاصل نہین قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات مین انسان و حیوان کے اور پھر انسانون مین اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہین، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس مین کوئی دفعہ نظر نہین آتی، اسی طرح ہندو قانون مین ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور

---

[1] صحیحین کتاب الایمان، [2] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ،

ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت مین تمام قرابت دارون کو چھوڑکر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے، اوراُن کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندون اور رشتہ دارون کو ان مین کوئی مرتبہ نہین دیا گیا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ مین پوری تفصیل سے کام لیا ہے،

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب مین جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص جو ایک وقت مین ایک ہی کی مدد کرسکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اُس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت مین اُسکا ایک ہم محلہ بھی ہے، اور اسی حالت مین اوس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہئے یہی وہ موقع ہے جسمین تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہین، پھر باپ کے ہین، پھر بھائی کے ہین، پھر پڑوسی کے ہین، پھر ہم وطن کے ہین، اور اسی ترتیب سے اُن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑکر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہوجائے، یہ ایثار نہین بلکہ ظلم ہے، ہان یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کرکے دونون کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کرسکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتون مین پیش کیا ہے،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ دار کیساتھ، اور یتیمون اور
الْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	مسکینون کیساتھ، اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ
بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء-۴)	اور بیگانہ پڑوسی کیساتھ، اور ساتھی کیساتھ، اور مسافر کیساتھ، اور
قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	اے پیغمبر ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ	باپ، اور عزیزون، اور یتیمون اور غریبون، اور مسافر

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (بقرہ-۲۷) کے لئے، اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ اس سے آگاہ ہے

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۔ اور رشتہ دار کا حق ادا کر، اور مسکین کا اور مسافر کا، اور

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل-۳) فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے، اور اسلام مین بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے، مگر اس کی تکمیلی شان اس باب مین بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب مین۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت، اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیمات مین یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں مین اُن کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں مین سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، تورات مین توحید کی تعلیم کے بعد ہے،

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اُس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو، (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے،

"تم مین سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانونًا یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے، مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے، اس کا خون اسی پر ہے" (احبار ۲۰-۹)

اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے، (خروج ۲۱-۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا، اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کیجائے، بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:-

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا، اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا، (متی ۱۵-۴)[1]

نبوتِ محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اُس نے توراۃ و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور اُن سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی، اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا،

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری بیچارگی، اور حمل و وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا ماں کی بڑائی، اُسکی سب سے پہلے دلدہی کرنے اور اُس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمان - ۲)	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اسکی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا، اور دو برس تک دودھ پلایا،
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (احقاف ۲)	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کیساتھ پیٹ میں رکھا، اور تکلیف کیساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے

---

[1] اسکے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے، مثلاً متی ۱۹-۱۹ مرقس ۷-۱۰ و ۱۰-۱۹ لوقا ۱۸-۲۰،

آنحضرت صلعم نے اپنے ارشادات مین اس کی مزید تاکید کی ایک شخص نے خدمت اقدس مین آکر دریافت کیا
کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری مان، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری مان!
اُس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری مان! تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ[1]
ایک دن آنحضرت صلعم نے چار بڑے بڑے گناہون کا ذکر کیا، اور سرفہرست مان کی نافرمانی کو قرار دیا، اور
فرمایا کہ تمھارے خدا نے ماؤن کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے[2]، ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ!
مین نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری مان زندہ ہے؟ جواب دیا
نہین، دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی، ہے، فرمایا تو اُس کے ساتھ نیکی کر[3] یہی اس کی توبہ بتائی، ایک اور صحابی
نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! مین نے جہاد مین شرکت کا ارادہ کیا ہے، اور آپ سے مشورہ چاہتا ہون، فرمایا کیا
تمھاری مان ہے؟ جواب اثبات مین دیا، فرمایا تو اُسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤن کے پاس ہے[4]۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم مین مخلوقاتِ انسانی مین جنسِ لطیف ہی کی ایک
صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے، اور یہ برتری بالکل فطری ہے، انسان سب سے زیادہ اپنے وجود مین جن کا
ممنون ہے، اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہین وہ خالقِ اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد مان اور باپ ہین،
لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحون اور چند قطرون سے زیادہ نہین، مگر مان وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا
خون پلا پلا کر بڑھایا، اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہکر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ مین رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل
برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پید امضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیون سے لگا کر اپنا خون پانی
کرکے پلایا، اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت مین اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار
کردی، ایسی حالت مین کیا مان سے بڑھ کر انسان اپنے وجود مین مخلوقات مین کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لئے
شریعتِ محمدی نے اپنی تعلیم مین جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اُس کی سزاوار ہے،

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب [2] ایضاً [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ [4] ترغیب ترہیب منذری جلد ۳ صفحہ ۱۰۲ بحوالۂ ابن ماجہ ونسائی و حاکم،

۲- ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی، بچہ کی تولید وتکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے، اور شک نہیں کہ اس کی نشو ونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی ومالی کوششیں شامل ہیں اس لئے جب بچہ اُن کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اُس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح اُنکی "عزت" کرنے اور اُن سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا کی بلکہ اُن کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ اُن کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے، قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے، اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے، جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا،

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بقرہ-۱۰) | اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کیساتھ نیکی کرنا،

یہ آیت پاک گو اُس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں، بلکہ "نیکی کرنے" کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے، اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے،

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، الآیہ (بقرہ-۲۶) | فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے،

سورۂ نسا میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کیجاتی ہے،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّ — اور اللہ کو پوجو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ،

بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، (نساء-۶) — اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو،

کفار کو جنھوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی وخیالی باتیں پیدا کرلی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کرکے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، "او ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک کرنا، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا،

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ — کہہ اے پیغمبر! "آؤ میں تمھیں پڑھ کر سناؤں کہ تمھارے

اَلَّا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا — پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ

(انعام-۱۹) — کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا،

معراج کے احکامِ دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اس اہتمام کیساتھ دی جاتی ہے کہ اُن کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، اُن کے حق میں دعاے خیر کرو اور بڑھاپے میں اُن کی خدمت کرو، فرمایا،

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ — اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ تم اس کے سوا

اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ — کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان

اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ — میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے

وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا، وَاخْفِضْ — کو پہنچ جائیں تو اُن کو اونہہ بھی نہ کہو، اور نہ اُن پر خفا ہو

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ — اور اُن سے ادب سے بولو، اور اُن کے لئے اطاعت کا بازو

ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ — محبت سے جھکا دو، اور کہو کہ اے میرے پروردگار! تو ان

(بنی اسرائیل-۳) — پر رحمت فرما جسطرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا،

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے،

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت مین شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہین قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہون تو اس حالت مین بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہین، بجز اس کے کہ اگر وہ اس شرک کی دعوت دین، تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا،	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو،
وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ	اور اگر وہ تجھکو مجبور کرین کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک
بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	کرجس کا تجھ کو علم نہین تو اُن کا کہنا نہ مان، تم سب کو
فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ،	میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو مین تم کو تمھارے
(عنکبوت - ۱)	کرتوت سے آگاہ کرونگا،

اتنا ہی نہین، بلکہ اگر تمھارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دین، تو صرف ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن اُن کی دنیاوی خدمت، اور حسنِ سلوک مین کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت مین بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ
أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ	نیکی کرو، اُس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ
أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ،	مین رکھا، اور دو سال مین اس کا دودھ چھڑایا، کہ وہ
وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ	میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی
لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا	پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کرین کہ
فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا،	میرے ساتھ اس کو شریک کرجس کو تو نہین جانتا تو انکا
(لقمان - ۲)	یہ کہنا نہ مان، اور دنیا مین ان کے ساتھ بھلائی سے گذران کر،

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسانمندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی شرک پرستی کی دعوت، اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسیقدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب مین ان کی بات اولاد نہ مانین، مگر دوسری دنیاوی باتون مین اُن کا ادب، اُن کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے،

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ اون کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لاکر حسنِ خاتمہ پر مرے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ، (ابراهیم - ۶) اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخشدے

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی،

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ، (نوح - ۲) میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخشدے،

اس لئے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیا علیہم السّلام کی پیروی ہے،

آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہین، اُن کی خدمت بجالاتے ہین، اور اُن کے لئے خدا سے دعاے خیر کرتے ہین، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ مین اُن کے سارے گناہ معاف کر دیتا، اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت اُن کو عطا فرماتا ہے،

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ	اور ہم نے انسان کو تاکید کرکے کہدیا کہ اپنے ماں باپ کے
أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ	ساتھ نیکی کرنا، اُس کی ماں نے اس کو تکلیف کرکے پیٹ
ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ	مین اٹھایا، اور تکلیف کرکے جنی، اور تیس مہینون تک
أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ	اس کو پیٹ مین رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہانتک کہ وہ
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ	بچپن سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا اس نے
وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي	کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس

إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ، أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ،

(احقاف-۲)

احسان کا شکر ادا کرون جو تو نے مجھ پر اور میرے مان باپ
پر کیا، اور ایسی کہ مین وہ کام کرون جن کو تو پسند کرے، اور
میری اولاد نیک کر، مین تیری طرف لوٹ کر آیا، اور مین
تیرے فرمانبردارون مین ہون، یہی وہ ہین جن کے اچھے
کام ہم قبول، اور اُن کے برے کامون سے درگذر کرتے
ہین، یہ جنت والون مین ہونگے، یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا
ان سے وعدہ کیا گیا،

ان آیتون نے والدین اور خصوصاً مان کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے
گناہون کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث مین رسول اللہ صلعم نے اسی منشاے الٰہی کو مختلف
عبارتون اور طریقون مین ادا فرمایا ہے، کبھی فرمایا ہے کہ "مان کے پاؤن کے نیچے جنت ہے"[1] کبھی ارشاد ہوا "رب
کی خوشنودی، باپ کی خوشنودی مین ہے" کسی نے پوچھا یا رسول اللہ میرے حسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ
مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری مان، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری مان، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری مان،
گذارش کی پھر کون، چوتھی بار فرمایا تیرا باپ، اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اُس سے قریب ہے، ایک دفعہ
حضور انور صلعم مجلسِ قدس مین تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے، فرمایا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہ نے
پوچھا کون یا رسول اللہ، ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے مان باپ کو یا ان مین سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت مین
پایا، اور پھر (اُن کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی، ایک اور مجلس مین صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کامون مین
خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا مان باپ کے ساتھ
نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون، فرمایا خدا کی راہ مین محنت اٹھانا، (جہاد)

ایک دفعہ آپ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت مین بیان فرمایا، ارشاد ہوا

۱؎ مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلۃ،

کہ تین مسافر راہ مین چل رہے تھے کہ اتنے مین موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینون نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار مین پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اُس غار کا منھ بند ہو گیا، (اب اُن کی بیکسی و بیچارگی اور اضطراب و بیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اُن کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی) اس وقت انھون نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الٰہی مین دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے، اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، مین بکریان چراتا تھا، اور انھی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، مین شام کو جب بکریان لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دُہکر پہلے اپنے والدین کی خدمت مین لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچون کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ مین بکریان چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے، مین دودھ لے کر اُن کے سرھانے کھڑا ہوا، نہ اُن کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت مین خلل آجاتا، اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھین کھلین، اور دودھ مانگین، بچے بھوک سے بلک رہے تھے، مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہون، مین اسی طرح پیالہ مین دودھ لئے رات بھر سرھانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے، خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ مین نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منھ سے چٹان کو ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی، اور غار کے منھ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافرون کی باری آئی اور انھون نے بھی اپنے نیک کامون کو وسیلہ بنا کر دعا کی، اور غار کا منھ کھل گیا،

اسلام مین جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے، مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھکر ہے، ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہین، کہ جہاد کے میدان مین سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے، اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اس جسم و جان کو کھونے کا حق نہین، جس کو اُن کی خدمت گذاری کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت صلعم نے نیک کامون مین جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمت اقدس مین آکر شرکت جہاد

کی اجازت طلب کی، دریافت فرمایا کہ تمھارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو،

قرآنِ پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے، احادیث میں بھی اُس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے، صحابہؓ سے فرمایا کہ تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے؟ ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں، انھوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ، فرمایا خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے، اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی، اور ہاں جھوٹی گواہی"[1]

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے، وحیِ محمدی نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کر دی ہے، اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں، اور مجرم کو اپنے فعل پر نظرِ ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اُس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے، کہ اگر کوئی سنگدل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اسکے قصاص میں قتل نہ ہوگا، بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تاآنکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو،[2]

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتبِ حدیث میں مذکور ہیں خصوصیت کیساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، مشکوۃ باب مذکور۔ [2] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائیگا، امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہو ورنہ نہیں، اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے، اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد

اسی سلسلہ مین ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دیکر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کردیا ہے، لکھا ہے،

اس واسطے مرد اپنے مان باپ کو چھوڑے گا، اور اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وہ ایک تن ہونگے، (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰ نے بھی جوگو (انجیل کے بیان کے مطابق) مان باپ اور بیوی تینون سے نا آشنا تھے، تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ مین ہے، مان باپ کے مقابلہ مین بیوی کی طرفداری اور حمایت کی، اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰-۷ و ۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو، اور اس لئے ان دونون مین سے مجبوراً ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کیجائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال مین بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے، جو ٹوٹ کر جڑ سکتا، اور مٹ کر بدل سکتا ہے لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھین جن سے وہ راضی تھے، مگر اُن کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھین، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت صلعم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کرین،

اولاد کا حق

اصولی تعلیم | جس طرح مان باپ کے حقوق اولاد پر ہین، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق مان باپ پر ہین، اور یہ وہ عنوان ہے، جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابون مین نہین ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہین کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم جو مذہب لے کر تشریف لائے

اُس کی شریعت مین حقوق کے مسئلہ مین بڑون چھوٹون کی تفریق نہین، وہ جس طرح چھوٹون پر بڑون کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹون کے بھی بڑون پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت صلعم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ مین وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، اُن حقوق کی جس قدر تشریح کیجائے، یہ متن اُن سب پر محیط ہے، فرمایا

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا۔ (ترمذی) — جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے، اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم مین سے نہین،

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئین، اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کرین، یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹون اور بڑون کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام مین قائم کی گئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت مین چھوٹون، بڑون، افسرون، ماتحتون، آقاؤن، نوکرون، اور بزرگون اور عزیزون کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے جب کبھی چھوٹون اور بڑون مین کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے، کہ ترازو کے ان دونون پلڑون مین توازن قائم نہین رہا ہے، حکیمون اور مقننون کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدون کا بے پایان دفتر جو کام نہین کرسکتا وہ نبی اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہین، اور دیتے ہین، اگر واقعاً کسی جماعت مین یہ ترازو بے نظام ہوجائے تو بڑے بڑے قانونون کا بارگران بھی پھر اُس کو برابر نہین کرسکتا،

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے اُن کی اولاد کی زندگی کا واسطہ انکو بنایا ہے تو وہ بالقصد اُس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنین، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کرین جو ان کی قوت اور استطاعت مین ہے، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہین

سمجھا ہے، اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے،

اولاد کشی کا انسداد

عرب کے سفاکانہ مراسم مین سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچون کو مار ڈالنا اور لڑکیون کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچون کو اپنے دیوتاؤن کی خوشنودی کیلئے خود ذبح کرکے اُن پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلان کام ہوگا تو اپنے بچہ[1] کی قربانی کرین گے، یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب مین بلکہ بہت سی بت پرست قومون مین جاری تھی، روۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون مین اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی، اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج[2] تھا، ہندوستان کے راجپوتون مین یہ دردناک منظر لڑکیون کی شادی کی شرم و عار سے بچنے، اور بیواؤن کی ستی کی صورت مین اور لڑائیون مین جوہر کی صورت مین رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ تو دیوتاؤن، دیبیون کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصومون کی جانین بہت آسانی سے لیجاتی تھین، قرآنِ پاک کی اس آیت مین نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قومون کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے،

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ،

(انعام - ۱۶)

(جس طرح کھیتون اور جانورون مین خدا سے برحق کے ساتھ اُن کے دیوتاؤن نے اپنا حصہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے مشرکون کو ان کے دیوتاؤن نے یہ بات خوبصورت کرکے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کردین، تاکہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لئے) ہلاک کردین اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کردین، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، تو ان مشرکون کو اور

[illegible]

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر مین عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب مالایجوز من النذور فی معصیۃ اللہ

[2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول صفحہ ۲۴، [2] کتاب دز نتنی تفصیل آیت مذکور

اسی سلسلہ مین آگے چل کر خدا فرماتا ہے،

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (انعام - ۱۷)

گھاٹے مین ہین وہ جنھون نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا،

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربون کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اسکے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لئے وہ اُس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے، نبوتِ محمدی نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہین کھلاتا، بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے، اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ، (هود - ۱)

اور زمین پر کوئی جاندار نہین لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے،

اس لئے جاہل عربون کو تعلیم دی گئی،

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ، (اسراء - ۴)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہین جو اُن کو اور تم کو دونون کو روزی دیتے ہین ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے،

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت صلعم کو حکم ہوا کہ ان عربون کو جنھون نے اپنی طرف سے بہت سی چیزین حرام بنالی ہین، بتادو کہ اصلی چیزین انسان پر کیا حرام ہین؟

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ

کہدے اے پیغمبر! آؤ مین تم کو پڑھ کر سناؤن کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اور

نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ؕ — مفلسی کے ڈر سے اپنے بچون کو نہ مارڈالو ہم تم کو اور ان کو

(انعام۔ ۱۹) — دونون کو روزی دیتے ہین،

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اُس کے بعد فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مارڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی:[1] یہ جواب حقیقت مین آیتِ بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتوفیض نے دلون مین یہ یقین پیدا کردیا کہ رازق خدا ہے، اسی کے ہاتھ مین رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنی رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو گئی،

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیون کا زندہ دفن کردینا تھا، کہ لڑکیان شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھین، جب گھر مین لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگون سے منھ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیان ہین، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمھاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیون کا باپ کہو تو شرم نہ آئے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ — اور جب اُن مین کسی کو اس کے ہونے کی خوشخبری دیجائے

مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ — جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہین

(زخرف۔ ۲) — تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اسکا منھ سیاہ پڑجاتا ہے؛

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک مین چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکرین کرتے، قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ — اور جب ان مین سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دیجاتی

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورۂ بقرہ، و سورۂ فرقان و کتاب الادب و کتاب المحاربین، و صحیح مسلم کتاب الایمان،

مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ	ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ
مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي	پی کر رہجاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگون سے
هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ	منھ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھاکر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی مین چھپادے (یعنی زندہ دفن کردے)
(نحل - ۷)	

یون تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب مین تھا، مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف کہتے ہین کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم مین اس کا رواج سب سے زیادہ[1] تھا، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلعم سے اقرار کیا کہ انھون نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیون کو زندہ دفن کیا ہے[2]، یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کیساتھ انجام دیجاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلعم کے سامنے خود اپنی بیتی آپ سناکر اس طرح کھینچا کہ رحمتِ عالم صلعم بیچین ہو گئے،

دارمی مین وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[3] ہے، کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس مین عرض کی کہ "یا رسول اللہ ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتون کو پوجتے تھے، اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب مین اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی مین آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی مین آگے بڑھتا چلا گیا جب ایک کوئین کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا، اور لڑکی اس کے قریب پہنچی، تو مین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئین مین ڈالدیا، وہ ابا ابا کہکر پکارتی رہی' اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی'، رحمتِ کونین اس پر درد افسانہ کو سنکر آنسو ضبط نہ کرسکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کردیا، فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اسکا

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۲۴۳ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۰ مطبعہ خیریہ مصر، زیر مثل اضلّ من موؤدة
[2] ابن جریر و ابن کثیر و در منثور سیوطی بحوالۂ سنن بیہقی و مسند بزار، و مصنف عبد الرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر، [3] سنن دارمی صفحہ اول یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہین لیکن ہم نے نقل کردی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے،

علاج پوچھنے آیا ہے، پھر اُن صاحب سے فرمایا: ہان میان؛ تم اپنا قصہ پھر تو سناؤ" انھون نے دوبارہ پھر بیان کیا، آنحضرت صلعم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریشِ مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔"[1]

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھون نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مین نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیان زندہ دفن کی ہین، فرمایا اے قیس؛ ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس اونٹ ہین، "فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک اونٹ قربانی کرو"[1]

مردون کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتین بھی اس جرم مین مردون کی شریک تھین، مائین خود اپنی لڑکیون کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھین، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے

مالقی الموؤد من ظلم امہ ✽ کما لقیت ذھل جمیعا و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی مان کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہین اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت مین ایک عورت نے آکر کہا کہ مین نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کرون گی، فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دیدو"[2]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیون نے ایسی لڑکیون کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور اُن کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس مین بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت صلعم کی خدمت مین آیا تو عرض کی یا رسول اللہ! مین نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیون کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا، فرمایا؛ ہان تم کو اس کا ثواب ملیگا، کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے[3]، اسی طرح زید بن

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبد الرزاق و بزار و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ، [3] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی، تفسیر سورۂ اذا الشمس کورت،

عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبوی سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیون کو اپنے آغوشِ شفقت مین لیتے تھے، اور اُن کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہوجاتی تھین تو وہ اُن کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو مین تم کو واپس کردون، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو،[1] یہ شخصی کوششین تھین جو ملک مین بار آور نہ ہوئین لیکن بعثتِ محمدی کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی، تو ان شقاوتون کے موسم پر ہمیشہ کے لئے خزان چھاگئی،

لوگ عمومًا لڑکیون کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوتِ محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنادیا کہ وہ نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بن گئین، فرمایا جو کوئی ان لڑکیون مین سے کسی لڑکی کی مصیبت مین مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بنکر حائل ہوجائے گی،[2] نیز فرمایا جو دو لڑکیون کی بھی پرورش کرے یہانتک کہ وہ جوان ہوجائین، تو قیامت مین میرا اور اُس کا مرتبہ دو انگلیون کو اٹھا کر فرمایا کہ یون برابر ہوگا،[3] غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی مین آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بنگئی،

ان اخلاقی نصیحتون کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتون اور مردون سے بیعت لی، صلحِ حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتین اسلام لائین اُن سے توبہ کی جو بیعت لیجائے اس مین ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ (ممتحنہ) کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرینگی، چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلعم نے عورتون سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتحِ مکہ کے دن جب عورت مرد جوق جوق اسلام کے لئے حاضر ہورہے تھے تو آپ نے عورتون سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا، اور انھون نے اقرار کیا،[4] عید کے اجتماعِ عام مین عورتون کے مجمع مین آپ تشریف لائے، اور دوسری باتون کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا،[5] کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہونگی، دوسرے

---

[1] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اوّل صفحہ ۵۴۰، [2] صحیح بخاری کتاب الادب، و صحیح مسلم کتاب البر، [3] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق، [4] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶ تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء، [5] صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۱۳۲ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید،

موقعون پر بھی جو خاتونین دربارِ رسالت مین حاضر ہوتین ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا[1] بعض روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے پیشِ نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحین تھین ان مین ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعتِ عقبہ مین سب سے پہلے انصار سے جن باتون پر عہد لیا گیا تھا، اُن مین ایک یہ بھی تھا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرینگے[2]"

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت مین حاضر تھے، آپنے فرمایا کہ ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤگے، چوری نہ کروگے، بدکاری نہ کروگے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے، اور اگر کسی نے ان مین سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہوجائے گا، اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا مین مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخشدے چاہے عذاب دے[3]؛ صحابہ سے فرمایا کہ خدا نے تم پر ماؤن کی نافرمانی اور لڑکیون کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے[4]"

ان تمام تدبیرون کے علاوہ قرآنِ پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتون، ان تمام سنگدلیون اور ان تمام سفاکیون کو مٹانے مین وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہین کرسکتی تھین، قیامت کی عدالتگاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہین، غضبِ الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمالنامے شہادت مین پیش ہین کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیان خون سے رنگین کپڑون مین آکر کھڑی ہوجاتی ہین، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم مین ماری گئین،

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ — یاد کرو جب (قیامت مین) زندہ دفن ہونے والی لڑکی

---

[1] ترمذی ونسائی وابن ماجہ باب مصافحۃ النساء، ومسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ وسلمی بنت قیس، [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۴۴۴ برحاشیۂ فتح البیان بحوالہٗ ابن ابی حاتم، ومستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ علی شرط مسلم، [3] صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار ومسلم کتاب الحدود ومسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ ومستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸، [4] صحیح بخاری کتاب الادب وکتاب فی الاستقراض وصحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل،

(کورت) سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم مین ماری گئی،

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرزِ ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیون کو خود اپنے ہاتھون سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ اداے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلعم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہین، سیدالشہدا حمزہ کی یتیم بچی اُمامہ جو مکہ مین رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؓ ہاتھون مین اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہؓ زہرا کے حوالہ کرتے ہین کہ یہ تو تمھارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہین کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے، کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، اور اس کی خالہ میرے گھر مین ہے، حضرت زیدؓ آگے بڑھکر کہتے ہین کہ حضور، یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے ہی گود مین آئی ہے، آنحضرت صلعم اس دلخراش منظر کو دیکھتے ہین، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اُس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کے گود مین دے دیتے ہین کہ "خالہ مان کے برابر ہوتی ہے"۔[1]

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی جس کی پیدایش کی خبر سنکر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا، اور وہ لوگون کے مجمع مین منہ دکھانے کے قابل نہین رہتا تھا، یا یہ حال ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعۃً چار چار گود خالی ہوجاتے ہین، اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی، آنکھون کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے،

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ، (فرقان-۶)

(جنت ان کو بھی ملیگی جو......) اور جو کہتے ہین کہ ہمارے پروردگار ہماری بیویون اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھون کی ٹھنڈک عنایت فرما،

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا،

غدا الناس مذ قام النبی الجواریا، — پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہو کہ سب لڑکیان ہی لڑکیان ہین

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء،

رضاعت وحضانت | اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو و نما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کیجائے، اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی، اور اس کے خرچ کی کفالت کیجائے، چنانچہ اسلام نے ان دونون باتون کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہانتک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابون مین مل سکتی ہے مختصر ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم مین ماں دودھ پلائے، اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علٰحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا، اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا، اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے،

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ	اور مائین اپنے بچون کو پورے دو برس دودھ پلائین،
كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ	یہ مدت اس کے لئے ہو جو چاہے کہ رضاعت کی مدت
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ	پوری کرے، اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ
بِالْمَعْرُوْفِ ط (بقرہ - ۳۰)	پلانے والی ماؤن کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے

اور شیر خوارگی کے دنون مین ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا، اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کرکے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا

وَاُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ	اور تمھاری وہ مائین تم پر حرام ہین جنھون نے تم کو دودھ
مِّنَ الرَّضَاعَةِ، (نساء - ۴)	پلایا، اور تمھاری دودھ شریک بہنین،

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچون کی نشو و نما کی خدمت اسلام مین وہ عزت اور احترام رکھتی ہو کہ نسبی رشتہ داریون کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے،

اوپر کی پہلی آیت مین جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے، اور باپ نہ ہو تو دادا پر، اور اسکے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے،

تعلیم و تربیت — ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ مین جو صرف چار لفظون سے مرکب ہی اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح مین دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہین، فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ	اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال
نَارًا، (تحریم-۱)	کو آگ سے بچاؤ،

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیون، خرابیون اور ہلاکتون سے اُن کی حفاظت ہی، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہین، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے،

خدا نے اُن لوگون کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچون کے حق مین دعاے خیر کیا کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ بار الہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حسن، صورت و سیرت کی خوبی، اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھون کی ٹھنڈک بنا، فرمایا

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ	اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہین) جو کہتے ہین کہ اے ہمارے
أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ،	پروردگار ہم کو ہماری بیویون اور ہماری اولادون کی
(فرقان - ۶)	طرف سے آنکھون کی ٹھنڈک عنایت فرما،

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اُس کی نیکی و سعادتمندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے، ایک سورہ مین خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے

حق مین مغفرت کی دعا مانگتے ہین، اور اُن کی خدمت کی توفیق چاہتے ہین، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق مین اپنی کوششون کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہین،

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ	اور (اے خداوندا) میرے لئے میرے کامون کو میری
وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ،	اولاد مین صالح بنا، مین اپنے گناہون سے تیری طرف
(احقاف-۲)	بازآیا، اور مین فرمانبردارون مین ہون،

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے، آنحضرت صلعم نے اس باب مین وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیمِ ربانی پاکر مختلف طریقون سے واضح فرمایا،

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی مین آیا، حضور صلعم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا کیا آپ بچون کو پیار کرتے ہین، میرے دس بچے ہین مین نے اُن مین سے کسی کو پیار نہین کیا، حضور صلعم نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا"، دوسری روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کیا اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم وشفقت کو نکال لیا ہے تو مین کیا کرسکتا ہون[1]، ان دونون کا منشا یہ ہے کہ بچون کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہئے، کہ جو اپنے بچون پر رحم نہین کرتا خدا اُس پر رحم نہین کرتا،

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک غریب عورت سائل بنکر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیان بھی تھین، اُس وقت کاشانۂ نبوی مین ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، اُمّ المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اُس کے نذر کردی،

مان کی ممتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانون کو اس سدِ رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کرکے دونون بچیون کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہؓ کو

---

[1] و[2] یہ دونون روایتین صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد [illegible]، نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہٗ

غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھکر تعجب ہوا، آنحضرت صلعم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور نے سنکر فرمایا جب کسی کو لڑکیون کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ اُن کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اُس کے لئے آڑ بنجائین گی؛ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیون کی پرورش کرے یہانتک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائین تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور مین (دو انگلیون کو جوڑکر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہونگے[1]؛ اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہوسکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپنے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے، ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہین دیسکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے[2]،

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت مین داخل فرمائے گا[3]، باہم لڑکون مین بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعتِ محمدیؐ مین قائم نہین، اسی لئے دنیا کی اکثر شریعتون اور قانونون کے برخلاف اسلام مین بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہین، کہ ہر ایک کو ان مین سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہانتک کہ اگر لڑکون مین سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت صلعم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکون مین سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلعم کی شہادت ہو، انھون نے خدمتِ اقدس مین حاضر ہوکر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچون کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہین، فرمایا تو مین ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنونگا[4]؛

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات، [2] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی ادب الولد، [3] سنن ابی ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما، [4] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل،

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیون، رومیون ہندوون اور دوسری پرانی قومون مین رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو اصلاح کر دی گئی، اور باپ کی نظر مین اس کے تمام لڑکون کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹون پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اُس کا خاتمہ ہوا،

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست مین تیسرا درجہ زن و شو کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھون کی تسکینِ روحانی کا ذریعہ، اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچون کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانون کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے،

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، اُن سب مین عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقیِ مدارج کے لئے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان مین بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب مین تجرّد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا، اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرّد مین ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا تعلق ازدواج مین ممکن ہے کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو، اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے، اس پر دُنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہین؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اسکو کون سے فطری موقع مل سکتے ہین؟ پھر دنیا مین اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرّد کی زندگی مین کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرّد کی وہ پوری

اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتبخانہ مین محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے،

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا (حکم ہوا)

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ	اور اپنے مین سے بن شوہر کی عورتون کا (خواہ وہ
عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ	کواری ہون یا رانڈ) اور اپنے غلامون اور لونڈیون مین سے
يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ	صالحون کا نکاح کردیا کرو، اگر وہ غریب ہونگے تو اللہ انکو اپنی
عَلِيْمٌ، (نور-۴)	مہربانی سے غنی کردیگا، اور اللہ گنجایش رکھنے والا اور علم والا ہے،

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب و تنگدست ہونگے تو خدا تعالیٰ اپنی مہربانی سے انکو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر مین غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر مین فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا، اور دنیاوی لحاظ سے دو سببون سے ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر مین دو کام کرنے والے ہون گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہونگے اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہین غریب ہی سمجھ سکتے ہین، خصوصاً مزدور اور کاشتکار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤن ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بیکاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا، کہ وہ کام کہین سے پیدا کرے، خصوصاً اس لئے کہ اسکی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کامون پر آمادہ کردے گی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر مین فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجایش مین سب کچھ ہے، اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہین،

پھر اس فرض کو یہانتک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا،

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ	اور جو تم مین سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف
الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ	مومن عورتون سے نکاح کرسکے تو تمھاری ان مومن
فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ	باندیون مین سے کسی سے نکاح کرے جو تمھارے
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ	قبضہ مین ہو، اور اللہ تمھارا ایمان زیادہ جانتا ہے،
(نساء - ۴)	تم ایک دوسرے کے ہمجنس ہو،

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہان سے دو شبہے پیش آتے ہین کہ یہ کیا نومسلم باندیان پرانے مسلمانون کے برابر ہوسکتی ہین؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہین ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا، اور خدا کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتین شریف خاندانون کے ہمرتبہ کیسے ہونگی، تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے، اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہین،

یہ اہتمامِ بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسون مین پڑ کر نکاح سے باز نہ رہین، اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل مین کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا،

اتزوج النساء فمن رغب عن	مین تو عورتون سے نکاح کرتا ہون تو جس نے میرے طریقہ
سنتی فلیس منی[1]،	سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہین،

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہین ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہمجنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے

[1] صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح،

باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ	اور اس (خدا کی) نشانیون مین سے ایک یہ ہے کہ
اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ	اس نے تمھاری جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کین تاکہ
مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ	تم اون کے پاس سکون پاؤ، اور تمھارے آپس مین
لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ،	پیار اور مہر پیدا کر دیا، بیشک اس مین سوچنے والون
(روم - ۳)	کے لئے کتنی نشانیان ہین،

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث، اور مشکلات کے تلاطم مین امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے، اُس لئے میان بیوی کے باہمی تعلقات مین اتنی خوشگواری ہونی چاہئے کہ اُس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثارِ قدرت مین شمار کیا ہے، پورے ہون یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہرومحبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہون تو اس مین دونون یا دونون مین سے ایک کا قصور ہے،

میان بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اُن لوگون کی سخت برائی کی ہے جو زن وشو کے باہمی میل جول اور مہرومحبت مین فرق ڈالین، فرمایا،

فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے ہین جس سے شوہر اور
الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ۔ ۔ ۔ ۔ مَا لَہٗ	اس کی بیوی مین تفرقہ ڈالتے ہین۔ ۔ ۔ ۔ ۔
فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ، (بقرہ - ۱۲)	اس کے لئے آخرت مین کوئی حصہ نہین ہے،

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بیوی شوہر

کی فرمانبرداری، اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے، کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبرگیری کرتا ہے، اور اسکے جائز مصارف کا بوجھ اُٹھاتا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ (نساء-۶)	مرد، عورتوں کے سردھرے ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنا مال اُن پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے اُن کی حفاظت کی ہے،

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیرحاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں، اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن میں اپنی عصمت کا خیال، اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کرکے اُن کو محفوظ کردیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے،

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملاکر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو اُن کی معاشی، اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآنِ پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کردیا ہے،

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ (بقرہ-۲۳) عورتیں تمہاری پوشاک ہیں، اور تم اُن کی پوشاک ہو، اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے

لئے تم اُن کی زینت ہو، وہ تمھاری تم اُن کی خوبصورتی ہو، وہ تمھاری تم اُن کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمھاری، یہی نکاح کے اغراض ہین، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے،

ایک اور آیت مین اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا،

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے
مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا	تم کو ایک ذات سے پیدا کیا، اور اُسی کی جنس سے
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ	اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونون سے بہت سے
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ	مردون اور عورتون کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ،	دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور
(نساء - ۱)	رحمون (رشتون) کا لحاظ رکھو، اللہ تمھاری دیکھ بھال کرتا ہے

آنحضرت صلعم ان آیات کو نکاح کے خطبون مین عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتون مین انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑون مرد وعورت پیدا ہوئے، اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات مین اپنے اس خالقِ حقیقی کا، اور ان رحمون (رشتون) کا لحاظ کرین جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہین، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتون اور رشتہ داریون کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا، اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود مین آیا ہے، اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا مین نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر ومحبت اور الفت ومودت کا آغاز ہوتا ہے،

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد وعورت مین صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ مین کہا ہے، مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (مائدہ - ۱) "پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے" اسی لئے آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ جوانون کو خطاب کرکے فرمایا، اے جوانون کے گروہ! تم مین نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح

کرلے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے، (ابن ماجہ، نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہئے، اور اصلاح حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہئے، اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاحِ حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا، اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا، (بقرہ ۲۸-۲۰) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا، (نساء ۱۹) اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدود کو قائم کرنا کہا گیا ہے،

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ. (بقرہ ۲۸-۲۹) یہ کہ میاں بی بی دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھینگے

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کرینگے، اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں، محمد رسول اللہ صلعم نے وحی کی زبانِ مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا،

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ	اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ	اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو
وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ، (بقرہ ۲۸-۲۸)	اور اللہ سنتا اور جانتا ہے،

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علحدگی اختیار کرلینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شو کے معاملہ سے ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کیساتھ حسنِ سلوک (بِر) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور دوستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے،

نیک بیویوں کے اوصاف قرآنِ پاک نے یہ بتائے ہیں،

فالصّٰلحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلغَیبِ (نساء - ۶)

تو نیک بیویان شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزت وآبرو) کی حفاظت کرتی ہیں،

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں، اُن کے مال و دولت اور ملکیت کی جنکی حفاظت اُن کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں، اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود اُن کی اپنی عزت وآبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اسکی طرف دیکھے تو وہ اُسکو خوش کردے اور اگر شوہر اُسکو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کردے، اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے " (ابن ماجہ نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی،

لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں، تو اُن کو خوابگاہ میں علٰحدہ کردو، اور ان کو ہلکی مار مارو، تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر اُن پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمہارا عورتوں پر، اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے، اور نہ تمہارے گھروں میں اُن کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں، اور ہاں! اُن کا حق تم پر یہ ہے کہ اُن کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو، (ابن ماجہ، کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے، فرمایا! جب خود کھائے تو اُس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اُس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علحدہ کرے، (ابن ماجہ، ایضاً) دوسری طرف آپ نے عورتون کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہرون کی پوری اطاعت کرین، یہانتک فرمایا کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا مین کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے" آپ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لئے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام مین خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہین ۔

ایک مشہور حدیث مین آپ نے فرمایا،

خیرکم خیرکم لاھلہ (ترمذی ودارمی وابن ماجہ) تم مین سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوین کے لئے سب سے بہتر ہے

خیارکم خیارکم لنساءھم، (ترمذی،) تم مین سب سے بہتر وہ ہین جو اپنی بیوین کے لئے بہتر ہین

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ مین ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنون کے ساتھ انصاف اور احسان نہین کر سکتا وہ دوسرون کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے،

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہین کرتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا،

ولزوجک علیک حقاً، (بخاری، کتاب النکاح) اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے،

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ مین بیویون کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصورون پر ماری پیٹی جا سکتی تھین، حضرت عمرؓ فرماتے ہین کہ ایک دفعہ مین نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہین کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتون کو کسی شمار قطار مین نہین سمجھتے تھے اسلام آیا تو اس نے اُن کے بارہ مین احکام اتارے، اور اُن کے حق مقرر کئے[۱]

[۱] صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل ابنتہ و تفسیر سورۂ تحریم

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہانتک بڑھایا کہ اُن کو قانوناً مردون کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق مین اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ مین مردون کو تھوڑی سی اعزازی برتری دیگئی، ارشاد ہوا،

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ	عورتون کا حق دستور کے مطابق مردون پر ویسا ہی ہو
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ،	جیسا مردون کا عورتون پر، اور مردون کو ان پر ایک
(بقرہ ۲۸-)	منزلت حاصل ہے،

لیکن یہ منزلت بھی اُن کو بے وجہ نہین دیگئی ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتون کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکین یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہین، یہ نکتہ اس سے سمجھ مین آتا ہے کہ اوپر کی آیت میان بیوی کے خانگی جھگڑون کے دور کرنے کے سلسلہ مین ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشون کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونون کے قانونی حقوق یکسان ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے، تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے،

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہین قرآنِ پاک نے اسکی مصلحتین بھی بتادی ہین فرمایا

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ	مرد عورتون کے نگران ہین، اس سبب سے کہ اللہ نے
بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ	ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور اس لیے کہ انھون
(نساء-۶)	نے اپنا مال خرچ کیا،

یعنی مردون کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے فطری طور سے مردون کو عورتون پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ مین جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، علمی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اسکی تائید مین ہین، اس لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان و نفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری

مرد پر عائد کی ہے، اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست، اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید اُن کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر اُن کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ نے اُن کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دیکر نصیحت فرمائی کہ "عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ اُن کی پیدائش ~~ٹیڑھی ہڈی~~ پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھاپن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اور اگر اُسکے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے"

آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا: "اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی"[۲] یہ نصیحت حقیقت میں قرآنِ پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے،

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ	اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو، اگر
فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ	تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے
فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (نساء - ۳)	اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو،

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لئے خود روزی کمانا، اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے، اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ، اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعہ عورت کو اسکی وصولی کا حق حاصل ہے، اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علٰحدگی کے دعویٰ کا اختیار

[۱] صحیح بخاری و مسلم نکاح، [۲] صحیح مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء،

حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں،

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اسکی دولت سے اسکی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلعم کی خدمتِ اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یارسول اللہ صلعم! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں اُن کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا "تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمھارے بچوں کو کافی ہو۔"[2]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے جنکی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا "تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی...... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اسکی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" (بخاری اول ص۱۷۷ باب قوا انفسکم واھلیکم) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہدیا گیا،

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے،

قرآنِ پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے،

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو تو اُن کو سمجھاؤ،
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	اور خوابگاہوں میں اُن سے علٰحدگی برتو، اور اُن کو مارو

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (نساء) تو اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں، تو پھر اُن پر راہ مت تلاش کرو،

---

[1] اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں، تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیئے، نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص۱۶۳ مصر، [2] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل ص۸۰۸،

لغت میں "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہیں، اور عورت کے حق میں، اسکے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں،

ومعنى ذالك اذا رأيتم نشوزهن مما	اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت
تخافون ان ينشزن عليكم من نظر الى	دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی اودھر
مالا ينبغي لهن ان ينظرن اليه ويدخلن	دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہئے، اور وہ آئیں اور
ويخرجن واستربتم[1] بامرهن (تفسیر طبری ۵-۴۰۰)	نکل جائیں، اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے،
عن محمد بن كعب القرظي اذا رأى الرجل	محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت گھر
تقصيرها في حقه في مدخلها ومخرجها	سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے،
قال يقول لها بلسانه قد رأيت	تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی
منك كذا وكذا فانتهى (ایضاً)	یہ دیکھی تو اب باز آجا،

فقہ کی کتابوں میں ہے،

الناشزة هي الخارجة عن منزل زوجها	نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے
المانعة نفسها منه۔ (عالمگیری، نفقات)	باہر نکل جائے اور اپنے آپکو اس کے سپرد نہ ہونے دے،

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں،

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے، اور اس سے بغض رکھے، (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیتِ مذکور پوری یہ ہے،

---

[1] اصل متن تفسیر میں واستبربتم غالباً غلط چھپا ہے،

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ	مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لئے کہ اللہ نے
بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ	ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے) اسلئے
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ	کہ مرد اپنا مال (اُن پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں
بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ	فرمانبردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کی) پیٹھ پیچھے (شوہر کے
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ	گھر بار اور عزت[1] و آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے
وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا	ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے، اور جن کے
عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا،	نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ، اور ان کو خوابگاہوں
(النساء - ۶)	میں علٰحدہ کردو، اور اُن کو مارو، تو اگر وہ تمھارا کہا مان
	لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو،

اس آیتِ پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، اُن کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں، اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمھیں نشوز کا ڈر ہو تو اُس کو پہلے تو سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو، یا اُس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اُس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو،

اب جب اوپر میں یہ بتایا جا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں، اور شوہروں کے پیچھے اُن کے گھر بار، مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمھیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے، کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں، یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے

---

[1] اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے،

پیچھے اُس کے گھربار اور عزت وآبرو کی حفاظت، جو عورت ان دونون کو یا ان دونون مین سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہین کرتی وہی ناشزہ ہے، اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے،

"شوہر کی عزت وآبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اسکی تصریح احادیث مین موجود ہے، آپ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اور جب کوئی حکم دے تو وہ مانے، اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے" اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت وعصمت ہے،

حجۃ الوداع کے خطبہ مین عورتون کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلعم کے جو فقرے ہین، اُن مین نشوز کے معنی کی پوری تصریح ہے، صحیح مسلم مین ہے۔

واتقوا اللّٰہ فی النساء فانھن عندکم عوان	عورتون کے بارہ مین خدا سے ڈرو کہ وہ تمھارے بس مین
ولکم علیھن ان لا یوطین فرشکم احدًا	ہین، تمھارا اُن پر حق ہے کہ وہ تمھارے بستر کو کسی سے
تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن ضربًا	روندوا نہین جسکو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کرین تو
غیر مبرح، (مسلم)	ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو،

ابن ماجہ مین یہ الفاظ ہین،

استوصوا بالنساء خیرا فانھن عندکم عوان	عورتون کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ مین میری
لیس تملکون منھن شیئا غیر ذلک الا	وصیت کو قبول کرو وہ تمھارے قبضہ مین ہین، تمکو انکے
ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن	سوا ان پر کوئی اختیار نہین، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بیحیائی
فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضربًا	کا کام کرین، تو اگر ایسا کرین تو انکو خوابگاہون مین علحدہ کردو
غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن	اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمھارا کہا
سبیلا، (کتاب النکاح)	مان لین تو اُن پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو،

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر مین آنے جانے نہ پائین جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو، اور کھلی بیحیائی سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہین، لیکن بعض نے اس مین بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشۃ مبینہ کی تفسیر مین داخل کیا ہے۔ (تفسیر سورۂ نسار رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات مین ہے، اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہانتک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے، (تفسیر طبری جلد ۵ صفحہ ۴۴ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہین آسکتی، ورنہ عورتون کو عام طور سے یون مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیون (اپنی بیویون) کو مارا نہ کرو، تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ بیویان اپنے شوہرون پر دلیر ہوگئین تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتین اہلبیتِ نبوی کے سامنے اپنے شوہرون کی شکایتین لیکر آئین، یہ دیکھکر آپ نے فرمایا "آل محمد (صلعم) کے گرد بہت سی عورتین چکر کاٹتی رہین جو اپنے اپنے شوہرون کی شکایتین لے کر آئی تھین، یہ (یعنی بیویون سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم مین سے اچھے لوگ نہین" (ابوداؤد و ابن ماجہ و دارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہین اتارتا" یعنی وہ مارپیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا، ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے، اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا "تو اس کو سمجھایا کرو، اس مین صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو" ایک دوسرے موقع پر فرمایا کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہین کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر

سزا کی خفیف شکل ... عورت کی اصلاح کیلئے ... ابوداؤد، مشکوٰۃ ... عشرۃ النسار ... صحیح مسلم باب المطلقہ ...

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلۂ رحم" ہے، محمد رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدیؐ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اُسکا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا،

فَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ، (روم - ۴) تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ، (اسرائیل - ۳) اور قرابت والے کو اسکا حق ادا کر،

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت، اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصل نیکی ہے،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى، (بقرہ - ۲۲) (اور اصل نیکی اسکی ہے جس نے ....) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا،

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا،

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، (بقرہ - ۲۶) فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے اور . . . . . .

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے اُن خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى، (بقرہ - ۱۰)

(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا،

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا،

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى، (نحل - ۱۳)

بے شک اللہ انصاف اور حسنِ سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے،

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا،

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ (بقرہ - ۲۶)

کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں یتیموں اور غریبوں کیلئے،

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُّؤْتُوْا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ، (نور - ۳)

اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشایش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں،

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى، (نساء - ۶)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کیا تھ نیکی کرنا،

حقِ قرابت کو اسلام مین وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام علیہ السلام اپنی اُن تمام محنتون، زحمتون، تکلیفون اور مصیبتون کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق مین اُن کو پیش آئین اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم، اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہین کہ رشتہ دارون اور قرابت مندون کا حق ادا کرو، اور اُن سے لطف و محبت سے پیش آو، فرمایا،

قُل لَّآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِي الۡقُرۡبٰى ؕ (شوریٰ - ۲۰)	کہہ اے پیغمبر! کہ مین تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہین مانگتا کہ ناتے مین محبت اور پیار کرو،

عربی زبان مین قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہین، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے، اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہین، کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے، کسی امر مین دو انسانون کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہین ہمعمری، کہین ہمدرسی، کہین ہمسایگی، کہین ہم مذاقی، کہین ہم پیشگی، کہین ہموطنی، کہین ہم قومی کی مختلف صورتون مین نمایان ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت، اور فرائضِ محبت کی ادائگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکون سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحمِ مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیون کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے، اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانون پر سب سے زیادہ ضروری ہے،

ان لوگون کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کرین وحیِ محمدیؐ نے "فاسق" کا خطاب دیا ہے، اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے،

وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ الَّذِيۡنَ	اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہین مانتے

يَنقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِه — جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہین، اور خدا نے

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَن يُوصَلَ (بقرہ ۳) جس کے جوڑنے کو کہا، اوس کو کاٹتے ہین،

ایک حدیث مین آنحضرت صلعم نے انسانون کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ مین فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کرکے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا، اس کو مین نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو مین نے کاٹا"[1] اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ مین آنحضرت صلعم نے یون ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے" جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے"[2] ایک اور موقع پر آنحضرت صلعم نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل مین حقو ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچیگا، کیا تو اس سے خوش نہین کہ جو تجھ کو ملائے اس کو مین اپنے سے ملاؤن، جو تجھ کو کاٹے اس کو مین اپنے سے کاٹون"[3] یعنی رحم مادر اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفون کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے، اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر مین اہل قرابت کی ہے،

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت مین بھی اشارہ ہے، سورۂ نساء مین فرمایا،

وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَ — اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے

الْأَرْحَامَ، (نساء-۱) — درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتون کا خیال رکھو،

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البر والصلۃ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ، [3] ایضاً،

مجھے جنت مین لیجائے، فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی کو اُس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو[1]،

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کریگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا[2] (یعنی جنت مین اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہیگا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لیگا، یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکیگا)

ابوہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے، کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اسکی روزی مین وسعت اور اس کی عمر مین برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے[3]، اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت مین فراخی اور عمر مین زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلۂ رحم کی دو ہی صورتین ہین، ایک یہ کہ ضرورتمند رشتہ دارون کی مالی مدد کیجائے، دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر مین سے کچھ حصہ اُن کی خدمت مین صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی، اور دوسرے کا نتیجہ عمر مین برکت اور زیادتی کی صورت مین ملتا ہے،

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کیجا سکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اُس کے لئے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہین، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والون کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلۂ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہین، ان کی زندگی مین خانگی مسرت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونون مین برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی مین یہ حدیث ان لفظون مین ہے، "صلۂ رحم سے قرابت والون مین محبت، مال مین کثرت اور عمر مین برکت ہوتی ہے"

احادیث مین اسکی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہین ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے، بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے، اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے[4] (یعنی جو قرابت کا حق ادا نہین کرتے ہین اُن کا حق ادا کیا جائے،

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم،
[2] ایضاً باب اثم القاطع،
[3] ایضاً باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم
[4] ایضاً باب لیس الواصل بالمکافی،

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہین، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہین، انسانیت اور اسکے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا مین ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے مین سے اُس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اسکی تیمار داری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانون کی مجموعی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریون کی گرہ مین بندھکر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب نے ان دونون انسانون پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہون، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اورون سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہین،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اُنہی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہین، اس لئے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیون کا سدِ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجاے بہشت کا نمونہ ہو، اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے، اور گھر مین قدم رکھے،

اسلام نے انہی اصولون کو سامنے رکھکر ہمسایگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہین، عربون مین دوسری

قومون سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا، اور اس لئے اسکی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آکر عربون کے اس احساس کو چند ترمیمون اور اصلاحون کے ساتھ اور زیادہ قوی کردیا،

وحی محمدی نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہین کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائگی ہے، اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسمون کے ہمسایون مین تقدم اُس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآنِ پاک نے یہ تفریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے،

وَالجَارِ ذِي القُرْبَى وَالجَارِ الجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالجَنبِ (نساء - ۶) (اور خدا نے) ہمسایۂ قریب اور ہمسایۂ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کیساتھ نیکی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنون مین اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار و عزیز، اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہین، دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہین، اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہین، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[1]، لیکن حقیقت مین یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیمِ محمدی کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیون اور ہمسایون مین اُن کو ترجیح دیجائے گی، جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو، یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے،

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ،

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلعم نے مختلف طریقوں سے فرمائی ہے سب سے بڑھکر یہ کہ آپ نے اُس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے، کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا" جان نثاروں نے پوچھا کون یا رسول اللہ! فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں[1]" ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[2]" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[3]"

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے، اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے[4]" ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے اُن سے فرمایا کہ جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہیں اُن کو وراثت کا حق نہ دلادیں[5]، حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے،

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے آنحضرت صلعم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں اُن میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو[6]، اس ہدیہ اور تحفہ کیلئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لئے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو، اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو[7]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب، [3] صحیح بخاری کتاب الادب، [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حق الجوار، [5] صحیح بخاری کتاب الادب [6] صحیح بخاری کتاب الادب، باب حق الجوار فی قرب الابواب [7] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب الوصاءۃ بالجار[illegible]، باب ماجاء فی حق الجوار،

ان تحفون کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتون کو پیش آتا ہے، اس لئے آپ نے خصوصیت کے ساتھ عورتون کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے مسلمانون کی بیویو! تم مین کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھُری کیون نہ ہو"[1] یہ نصیحت دونون بیویون کے لئے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھکر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے، اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اُس کی حقارت کرے،

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہین کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے، آنحضرت صلعم نے فرمایا "مومن وہ نہین جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اُس کے پہلو مین بھوکا رہے"[2] برائی برائی ہے جہان بھی ہو، اور گناہ گناہ ہے جہان بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہان لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہون اور برائیون سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان مین چوری کرنا کتنا برا ہے، بدکاری ہر جگہ اُس سے ممکن ہے، مگر پڑوس کے گھر مین جہان سے دن رات کی آمدورفت ہے، اور جہان کے مرد پڑوس کے شریف مردون پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہین، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے اسی لئے توراۃ مین یہ حکم تھا،

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام، اور اسکی لونڈی، اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر" (خروج ۲۰ - ۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے" (احبار ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ مین فرمائی، جن مین توراۃ کیطرح صرف ممانعت پر بس نہین کی ہے، بلکہ اسکو دس گنا زیادہ برا کرکے دکھایا، ایک سوال کے جواب مین فرمایا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحقرن جارۃ لجارتہا، [2] مشکوۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری باب لا یشبع دون جارہ،

"زنا حرام ہے، خدا و رسول نے اُس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، خدا و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرالے"[1]

دو صحابیہ تھیں جنمیں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں، لوگوں نے اُن کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا، اُن میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملیگی، پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں، اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا یہ بیوی جنتی ہو گی[2]۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا،

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو، (مرقس ۱۲۔ ۳۰)

آنحضرت صلعم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اُس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے،

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کیلئے پیار رکھتا ہے[3]۔"

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا،

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اُس کو پیار کرے، یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے[4]،

اسی لئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہونگے، جو پڑوسی ہونگے[5]۔

انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اسکو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن

[1] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔ [2] ایضاً باب لا یؤذی جارہ۔ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ [4] مشکوٰۃ از بیہقی۔ [5] احمد بن حنبل مسند عقبہ بن عامر۔

صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا، فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو، تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو[1]۔

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اسکی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کریگا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لیکر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہی عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو، (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) اُن صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقتِ حال بتائی، سب نے اُن کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو مناکر پھر گھر میں واپس لایا، اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا،

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیرالمومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی[2]،

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہونگے (اُن سے
اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا	کہا جائے گا) تم اپنے حظ اپنی دنیا کی زندگی میں لیجا چکے
وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا، (احقاف-۲)	اور اس سے فائدہ اٹھا چکے،

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے،

---

[1] سنن ابن ماجہ، ص۲۵ ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار، و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار،
[2] موطا امام مالک باب ما جاء فی اکل اللحم،

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلعم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اسکو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے[1]،



[1] ابوداؤد، کتاب الادب باب حق الجوار،

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اُس کو آغوشِ محبت میں لے، اُس کو پیار کرے، اُس کی ہر طرح خدمت کرے، اُس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اُس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور اُن کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنی امت کے لایا۔ عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہئے اُن کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے، اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے،

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ	کیا تونے اُس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی
الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ (ماعون)	ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے،

ایک اور آیت میں اُن متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں،

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا	نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے،

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۂ نساء ج ۴ صفحہ ۱۷۱

تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ، وَتَاْكُلُوْنَ	اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے
التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا	ہو، اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور
جَمًّا۔ (الفجر-۱)	دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو،

اسلام سے پہلے کے مذاہب مین اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ مین عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین مین دوسرے لوگون کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہون" وہ آئین اور کھائین اور سیر ہون" (استثنا ۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲) انجیل نے ان بیچارون کی کوئی دادرسی نہین کی ہے، اور نہ کسی تعلیم مین اُن کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اُس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لیکر دنیا مین آیا، وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کرکے یاد دلا دیا،

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ . .	کیا تجھکو خدا نے یتیم نہین پایا، تو اُس نے پناہ دی! . .
فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ، (الضحیٰ)	تو یتیم کو نہ دبا،

آنحضرت صلعم جب تک مکہ معظمہ مین بے بسی کے عالم مین رہے یتیمون کے متعلق اخلاقی ہدایتین فرماتے رہے، اور قریش کے جفا پیشہ رئیسون کو اس بیکس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتون مین یہ تعلیمات وحی ہوتی رہین، دولتمندون کو غریبون کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ مین فرمایا گیا، کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کرسکتے ہو؟ ظلم و ستم کے گرفتارون کی گردنون کو چھڑا کر، بھوکون کو کھلا کر اور یتیمون کی خدمت کرکے،

اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا	یا بھوک کے دن مین کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔
ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ (بلد-۱)	

نیکون اور نیک بختون کی تعریف مین فرمایا کہ یہ وہ ہین جو

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ	اور اُس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے
يَتِيْمًا ، (دھر-۱)	ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورۂ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، اُن کو وراثت کا حق دلایا گیا، اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، اُن سے کہا گیا،

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا	اور یتیموں کو اُن کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دیدو،
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ	اور اُن کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا
اِلٰى اَمْوَالِكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ،	نہ کرو، اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ،
(نساء-۱)	یہ بڑے گناہ کی بات ہے،

دولتمند یتیم لڑکیوں کو اُن کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے، اور بے والی و وارث جان کر اُن کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا،

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ ،	نہ کر سکو گے تو ان کو چھوڑ اور عورتوں سے جو تمھیں
(نساء-۱)	پسند ہو نکاح کر لو،

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے، اور نہ جب تک اُن کو پورا شعور آئے، وہ اُن کے سپرد کیا جائے، بلکہ اُن کے سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کیجائے، فرمایا،

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ	اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمھارے
لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا	قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو، اور ان کو کھلاتے

لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى | اور پہناتے رہو، اور اُن سے معقول بات کہو، اور
اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ | یتیمون کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی طبعی عمر کو پہنچین تو
رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ج | اُن مین اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال ان کے

(نساء-۱) | حوالہ کردو،

ان آیاتِ پاک مین بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع مین جہان متولیون کو ناسمجھ یتیمون کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہان مال کی نسبت متولیون کی طرف کی ہے، کہ تم اپنا مال اُن کو نہ دو" اور آیت کے آخر مین جہان بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیون کو یتیمون کو مال واپس کردینے کا حکم ہے، وہان اُس مال کی نسبت یتیمون کی طرف کیگئی کہ تم اُن کا مال اُن کو واپس کردو، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیون کے پاس رہے تو اُس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چنکر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہین،

متولیون کو جو یتیمون کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کرکے برابر کردیتے تھے کہ یہ بڑے ہوکر تقاضا نہ کر بیٹھین، اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی،

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا | اور اڑا کر اور جلدی کرکے اُن کا مال نہ کھاجاؤ کہ کہین

(نساء-۱) | یہ بڑے نہ ہوجائین،

صاحبِ جائداد یتیمون کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہون، تو اُن کے لئے ان یتیمون کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہون تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی،

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ج وَمَنْ كَانَ | اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہئے کہ بچتا رہے

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ؕ (نساء-۱) اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے

اور آخر مین یہ جامع تعلیم دی گئی،

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ؕ (نساء-۱۹) اور یہ کہ یتیمون کے لئے انصاف پر قائم رہو

سورۂ انعام مین یہودیون کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانورون کی حلت وحرمت مین بے معنی جزئیات پرستی، اور روحانی گناہون سے بے پروائی دکھاکر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی اُن مین ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ج (انعام-۱۹) اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہانتک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے،

سورۂ اسرار کے آٹھ اخلاقی اصول مین سے ایک یہ بھی ہے کہ سوا ے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیمون کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے، اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے، (سورۂ اسراء-۴)

یہ تو صاحب جائداد یتیمون کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب ومفلس ہون، اُن کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانون کا فرض ہے، چنانچہ قرآنِ پاک نے بقرہ، نسار، انفال اور حشر مین بار بار اُن کی پرورش اور انکے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے،

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح مین بے والی ووارث اُمت کے سرپرست (صلعم) نے اپنی امت کے اُن نیک دلون کو جو بے والی ووارث یتیمون کے کفیل ہون، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا "مین اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت مین یون دو انگلیون کی طرح قریب ہونگے"۔ یہ بھی فرمایا کہ جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے، اور اسکو

---

[۱] صحیح بخاری، باب فضل من یعول یتیماً وصحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم،

کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اُس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو[1]، نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس مین کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کیجاتی ہے، اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس مین کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کیجاتی ہو[2]؛

آنحضرت صلعم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس ناتوان یتیمون کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بنگیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے، اور ہر ایک اُس کی پرورش اور کفالت کے لئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا[3]، بدر کے یتیمون کے مقابلہ مین جگر گوشۂ رسول فاطمۂ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھالیتی ہین[4]، حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان[5] اور انصار وغیرہ[6] کی یتیم لڑکیون کو اپنے گھر لیجاکر دل وجان سے پالتی ہین، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہین کھاتے تھے[7]،

صحابہ نے صرف یہی نہین کیا کہ یتیمون کو اُن کا حصہ دینے اور اُن کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی مین دیانتداری برتنے لگے بلکہ انکی جائدادون کی حفاظت مین فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت صلعم کی عدالت مین ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلادیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا، اور اُس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو، خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابوالدحداح صحابی حاضر تھے، انھون نے اُس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلان باغ سے بدلتے ہو؟ اس نے آمادگی ظاہر کی، انھون نے فوراً بدل دیا، اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا[8]،

---

[1] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالۂ ترمذی (حدیث حسن صحیح) [2] ایضاً بحوالہ ابن ماجہ، وادب المفرد باب من یعول یتیماً، [3] صحیح بخاری باب عمرۃ القضاء [4] ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس، [5] مؤطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ و زکوٰۃ اموال الیتیمی، و زکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق [6] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۶۹ [7] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ صفحہ ۱۳۲ [8] ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیماً، [9] استیعاب ابن عبدالبر تذکرۂ ابوالدحداح،

آج دنیا کے شہر شہر مین یتیم خانے قائم ہین، مگر اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ صلعم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی مین ملیگا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی داد رسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہان کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہان جہان مسلمانون نے اپنی حکومتون کی بنیادین ڈالین، ساتھ ساتھ ان مظلومون کے لئے بھی امن و راحت کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادین وقف کین[1]، اور دنیا مین ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی، اور قانوناً اپنے قاضیون کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی سرپرست یتیمون کے سرپرست ہون، اُن کی جائدادون کی نگرانی، اُن کے معاملات کی دیکھ بھال اور اُن کی شادی بیاہ کا انتظام کرین[2]، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکون مین کیجاتی ہے، اور لندن کے لارڈ مئر یا آرفن کورٹ کے حکام مسلمان قاضیون کے ان فرائض کی نقل کرتے ہین،



[1] تاریخ اسلام مین یہ واقعات مذکور ہین،
[2] حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابون مین قاضیون کے یہ فرائض لکھے ہین، قاضیون کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے ان مین بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی،

بیوہ کیساتھ حسنِ سلوک

یتیمون کے بعد اصنافِ انسانی مین سب سے ناچار اور ناتوان گروہ جنسِ لطیف کے اُن افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہرون کے سایہ سے محروم کر دیا ہے، اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہین، نہ اُن کے کھانے پینے کا کہین سہارا ہے، اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے اور سترپوشی کی کسی کو فکر ہے، عورت جسکو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا، اور اس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی، اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے، اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر، نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہین، اور موقع کی تاک مین رہتے ہین، دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعین کافی سے زیادہ ثبوت ہین،

یہودی مذہب مین بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا تھا اُس سے معاملہ کر سکتا تھا، عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق مین کوئی دخل نہ تھا، عیسوی مذہب مین یہ جبری قانون تو جاتا رہا، مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کر سکا، ہندوؤن مین اب اُس کی زندگی کی ضرورت نہین سمجھی جاتی تھی، اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹکر بے موت مرجانا چاہئے، اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرایشون اور لذتون سے علٰحدہ ہو کر ساری عمر سوگ مین گذار دے، عربون مین رواج یہ تھا کہ وہ شوہرون کے وارثون کی ملکیت بنجاتی تھی، اور وہ جو چاہتے

اس کے ساتھ کرسکتے تھے، اس کو تکلیفین دے دے کر اس سے دینِ مہر معاف کراتے تھے، اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہین شادی نہین کرنے دیتے تھے،

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادرسی ہوئی، اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا، اور صرف اتنی مدت تک کے لئے رکھا جس مین تھوڑا بہت اسکا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہین، اس کے لئے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی، اور اس کا نام عدت رکھا یعنی "شمار کے دن" اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اُس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرایش کی اجازت دیدی، اس کا دینِ مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ مین سب سے اوّل ضروری ٹھہرایا، پھر اس ترکہ مین سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا، عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی، اور اس کے سسر، دیورون اور شوہر کے دوسرے عزیزون کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع و قمع کر دیا، اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق، بلکہ اسلام کے قانون کا جزبنا دیا،

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اورون نے نکال دیا ہے، اس مین دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے، اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے، اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ مین صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہین کی، بلکہ مسلمانون کو صریحاً یہ حکم دیا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔ (نور-۴) اپنے مین سے بے شوہر والی عورتون کا نکاح کردو،

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلعم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی، اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہین اور بہتر سے بہتر اور

نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی، اور پچیس برس تک اس طرح اُس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، اُن کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کئے جنمیں سے آٹھ حضرت سودہؓ حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا، اور اس طرح اپنے پیرووں کے لئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا،

یہ تو آپ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا، کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بآسانی کر سکتا ہے، فرمایا،

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالساعی	بیوہ اور مسکین کیلئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے،
فی سبیل اللہ واحسبہ قال کالقائم	جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے،
لا یفتر، وکالصائم لا یفطر[1]	کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا، اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا،

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں،

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد	بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا، خدا کی
فی سبیل اللہ وکالذی یصوم	راہ کے مجاہد کی طرح ہے، اور اس کے برابر ہے، جو
النہار ویقوم اللیل، (کتاب الادب)	دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے،

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں، اور اس لئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق،

بندھن مین نہین باندھتی ہین، جب تک وہ بڑے ہوکر اُن سے علٰحدہ نہ ہوجائین، اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہوجائین، یہ فرمایا" مین اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑجانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ مین ان دو انگلیون کی طرح قریب ہونگے، وہ حسن وجمال اور جاہ وعزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہوجائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچون کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہی، یہانتک کہ وہ اُس سے علٰحدہ ہوجائین، یامرجائین"۔ اسی مقصد کو ابویعلٰی کی مسند مین ہے کہ آپ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت مین بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن مین سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولونگا تو دیکھونگا کہ ایک عورت مجھسے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، مین پوچھونگا تو کون ہے، تو وہ کہیگی، کہ مین ایک بیوہ ہون جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے"۔



۱؎ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیما، ۲؎ حاشیۂ سنن ابی داؤد تحشیۂ ابوالحسنات محمد بن عبداللہ ابن نورالدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ،

حاجتمندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اُس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اُس کو دوسرون کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے، اور اس کو دوسرون سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے، اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجتمند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے، اور نہ یہ سمجھے کہ اُس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہین پڑے گی،

قرآنِ پاک مین دو موقعون پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے،

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ، (ذاریات-۱)	جن (مسلمانون) کے مالون مین مانگنے والون اور محروم کے لئے حق ہے،
فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (معارج-۱)	اور جن (مسلمانون) کے مالون مین مانگنے والے اور محروم کے لئے مقررہ حق ہے،

سائل مانگنے والے کو کہتے ہین، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہین ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو، **محروم** کی تشریح مین اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اُس کو محروم کہتے ہین، جسکا مالِ غنیمت مین کوئی حصہ نہین، کسی نے اس کے ظاہر معنی لئے ہین کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہو کہ اس سے

مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو، اور اب وہ دوسرون کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآنِ پاک [1] سے ہوتی ہے،

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونون آیتون مین دونون طرف گئے ہین، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات مین جس مین مطلق "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج مین جس مین مطلق "حق" کا نہین، بلکہ مقررہ حق، کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو، کیونکہ مقررہ حق، کا مفہوم عام صدقہ پر نہین، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجتمندون کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونون طرح سے مدد مسلمانون کے حقوق مین سے ایک حق ہے،

قرآنِ پاک مین دوسرے موقع پر ہے،

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (ضحیٰ-۱) اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر،

یہان "سوال کرنے والے" کے معنی غنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہین، مگر لفظ کا عموم، وسعت کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورتمند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی [2] ہو، یہانتک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت مین ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو، اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو،

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب مین اس کا بھی حصہ ہوگا، اور جو بری بات

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف اور تفسیر ابن جریر مین سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ، اور سورۂ قلم مین اصحاب الجنۃ کے قصہ مین محروم و موف اور سورۂ واقعہ مین بل نحن محرومون کے معنی، [2] طبری مین ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہوا اما من سألک من ذی حاجۃ فلا تنھر، زمخشری نے کشاف مین لکھا ہے کہ بعضون نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے،

سَيِّئَةً يَكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ	کی سفارش کریگا تو اس کے گناہ مین وہ بھی حصہ پائیگا
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝ (نساء-۱۱)	اور اللہ ہے ہر چیز کا نگہبان،

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم ونسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ مین ہے، یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ مین اسکی امداد کی سفارش کیجائے تو اس نیک کام مین اُس کی سفارش کیجائے اور وہ قبول کیجائے. تاہم الفاظِ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے، اور اُس مین یہ اصول بتادیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد مین جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب مین شریک ہوگا، ایسا ہی برے کام کی جدوجہد مین حصہ لینا اس کے گناہ مین شریک ہونا ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے،

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا	اور نیکی اور پرہیزگاری کے کامون مین ایک دوسرے
تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	کی مدد کیا کرو، اور گناہ اور زیادتی کے کامون مین
اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝	ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو، اور ڈرو اللہ سے،
(مائدہ-۱)	بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے.

غرض یہ ہے کہ حاجتمندون کی حاجت برآری ضرورتمندون کی ضرورت کو پورا کرنا، اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت مین ہو تو وہ اوس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے، آنحضرت صلعم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے،

من كان (الله) في حاجة اخيه كان الله	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے مین لگا ہوگا،
في حاجته ومن فرج عن مسلم كربة	تو خدا اسکی ضرورت پوری کرنے مین لگا رہے گا،
فرج الله عنه كربة من كربات يوم	جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کریگا تو اللہ قیامت
القيامة، (صحیحین)	کی مصیبتون مین سے کسی مصیبت کو اُس سے دور فرمائیگا،

ایک دوسری روایت مین ہے کہ فرمایا،

واللہ فی عون عبدہ ماکان العبد	اللہ اپنے بندہ کی مدد مین اُس وقت تک رہتا ہو جبتک
فی عون اخیہ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)	بندہ اپنے بھائی کی مدد مین رہتا ہے،

صحیح بخاری مین ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمھین بھی ثواب ملیگا[1] ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہوسکے تو بیکس حاجتمند کی مدد ہی کیا کرو[2]، یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ[3] ہے، یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلتے مین کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے، اور اُس کا گناہ معاف کرتا[4] ہے،



[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ، [2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ [3] ترمذی کتاب البر والصلۃ، [4] ایضاً،

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیون کا مستحق ہے، بیمارون اور مریضون کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت مین اپنی خبرگیری اور خدمت آپ نہین کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانون کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے، اور اس فرض کا نام عربی مین "عیادت"[1] ہے،

ان بیمارون کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے وہ بہت سے فرائض جنکے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہین، یا جن کے ادا کرنے سے اُن کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، اُن کو یک قلم معاف یا

---

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ لغت کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہین، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت مین دیکھنے کو جانا، لیکن واقعہ ایسا نہین ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہین، اور اس کی تیمارداری، غمخواری، اور خدمتگذاری کے بھی ہین، بیمار کو بیماری کی حالت مین صرف دیکھنے کو جانا تو عیادۃ کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اسکی پوری تیمارداری اور خدمتگذاری کرے، عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ مین تھا، کہتا ہے،

ذهب الرُّقاد فما يحس رقاد   مما شجاك ونامت العوّاد ،

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہین ہوتی، اور عیادت کرنے والے سو گئے،

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیماردار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت مین شب و روز اس کی خدمت مین جاگتے رہتے ہین، یہانتک کہ بسا اوقات اُن کی کئی کئی راتین جاگتے کٹ جاتی ہین، لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے، اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر اُن پر نیند طاری ہو جاتی ہے، اور وہ سو جاتے ہین، اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والون کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہوا کہ عیادت کی وسعت مین خدمتگذاری اور تیمارداری سے لیکر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہین، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہون تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اسکے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا،

کم کر دیا ہے، اور قرآن نے اس کے لئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے،

وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ، (نور - ۸)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے،
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد مین شریک ہو) اور نہ
حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ، (فتح - ۲)	لنگڑے پر اور نہ بیمار پر،
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى،	نہ کمزورون پر اور نہ بیمارون پر (جہاد کے عدم شرکت
(توبہ - ۱۲)	کی بازپرس ہے)

بیمارون کے لئے وضو معاف ہے، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ - ۲) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازین معاف ہین عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (خدا کو معلوم تھا کہ تم مین کچھ بیمار بھی ہونگے) (مزمل - ۲) اسی طرح حج کے احکام مین بھی بیمار کے لئے رعایت فرمائی گئی، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا (تو تم مین جو بیمار ہو) (بقرہ - ۲۴) روزہ توڑنے کی اسکو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندون کو کس حد تک اُن سے اپنے اخلاقی مطالبہ مین کمی کر دینی چاہئے،

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت مین غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے،

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا مین جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، وہ اُس کے گناہون کا کفارہ بنجاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفون کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لئے وہ اوس کے گناہون کا معاوضہ بنجاتی ہین، اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]،

آنحضرت صلعم نے بیمارون کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کئے ہین، اسکی دعائین

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد، اوائل کتاب الجنائز،

سکھائی ہین، اور اُس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کریگا خدا اُس[1] کے غم کو ہلکا کریگا، اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہین جنمین ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اسکی عیادت کرے[2]، صحابہ کہتے ہین کہ حضور صلعم نے ہم کو سات باتون کا حکم دیا تھا جن مین سے ایک بیمار کی عیادت ہے[3]، ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہین، اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لئے بارگاہ الٰہی مین دعا کرتے ہین[4]، یہ بھی آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[5]، فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو اُس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اُس کو تسلی اور دلاسا دے اور اسکو شفا پانے کے لئے خدا سے دعا کرے[6]،

آنحضرت صلعم اور آپکی تعلیم سے صحابۂ کرام کو بیمارون کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ مین مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپنے یہودیون کی عیادت فرمائی ہے[7]، منافقون کی عیادت کو تشریف لے گئے ہین[8]، اور اسی سے علما نے غیر مسلمون کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[9]، حضرت سعد بن معاذ جب زخمی ہوے تو آپنے اُن کا خیمہ مسجد مین نصب فرمایا، تاکہ بار بار اُن کی عیادت کیجا سکے[10]، رفیدہؓ ایک صحابیہ تھین جو ثواب کی خاطر زخمیون کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھین اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد مین رہتا تھا، تاکہ لڑائیون کے مسلمان زخمیون کی تیمارداری اور مرہم پٹی کرین[11]، غزوات اور لڑائیون مین بھی بعض ایسی بی بیان فوج کے ساتھ رہتی تھین جو بیمارون کی خدمت اور زخمیون کی مرہم پٹی کرتی تھین[12]، آپنے اپنے پیروون کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ، اور بیمار کی عیادت کرو[13]،"

۱؎ ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم، ۲؎ صحیح بخاری کتاب الجنائز، ۳؎ ایضاً، ۴؎ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز ۵؎ صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفہ، ۶؎ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز ۷؎ صحیح بخاری کتاب الجنائز ۸؎ ایضاً ۹؎ مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ ۱۰؎ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز ۱۱؎ سیرۃ ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ وادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت واصابہ ابن حجر وغیرہ مین حضرت رفیدہؓ کا حال ہے ۱۲؎

ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی" وہ کہیگا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیونکر کرتا" فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔[1]

تعلیم کی یہ طرزِ ادا، بیمار پرسی، بیماروں کی تیمار داری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے، اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے، اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے، اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کرکے خدا کا قرب پاتے ہیں،



[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

غلامون کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتوان طبقون مین غلامون کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قومون نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیرون مین جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بنکر عیش و راحت، سیر و تفریح، اور حکومت و شہنشاہی کے کام کئے، اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری، اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لئے، ہندوون مین اچھوت قومین اسی کی یادگار ہین، مصریون مین قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیون مین غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کامون مین مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربون مین بھی اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربون مین قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیون کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا، کیونکہ اُس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز مین ظالم قریشیون نے جن لوگون پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے،

اسلام زیردستون کی مدد اور کمزورون کی حمایت مین اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت صلعم نے جس معاہدۂ فضول مین شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستون کی حفاظت اور حمایت کیجائے اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسون سے پہلے، قریش کے غلامون اور کنیزون نے لبیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشی، یاسر عنسی، عمار، صہیب رومی، ابوفکیہہ، عامر بن فہیرہ اور سالم غلامون مین اور لبینہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس، اور سمیہ

لونڈیون مین سب سے پہلے اسلام کے آغوش مین آئین، اور زید بن حارثہؓ کے سوا جو آنحضرت صلعم کے سایہ مین پرورش پارہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت مین سخت سے سخت کڑیان جھیلین، اور بعض نے اسی راہ مین اپنی جانین بھی دین،

اسلام نے غلامون کی آزادی اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزو بنالیا تھا، غلامون کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد مین جو مکہ مین نازل ہوا تھا، جن کامون کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے، اُن مین ایک فَكُّ رَقَبَةٍ گردن سے غلامی کی رسّی کو کھولنا" بھی ہے، چنانچہ مکہ کی پُرخطر زندگی مین بھی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمانون نے بہت سے غلامون کو کافرون سے خرید خرید کر آزاد کردیا تھا،

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ یعنی گردن کو آزاد کرنا، بہت سی فروگذاشتون کا کفارہ قرار پایا، اور غلامون کے آزاد کرنے کے لئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز مین غلامون کی دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی، حضرت حکیم بن حزامؓ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہین، اسلام کے بعد سَو غلام آزاد کئے، حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ مین چالیس غلام آزاد کئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تیس ہزار غلامون کو آزادی کی نعمت عطا کی،

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندون کے ساتھ نیکی کیجائے، ان بندون مین سرِ فہرست جن لوگون کے نام ہین، اُن مین یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا	اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور مان باپ
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى	کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیمون کے

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان، [۲] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرۃ [۳] یہ دونون تعداد مین امیر اسمٰعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق مین نقل کی ہین،

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى — ساتھ، اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ — پہلو کے رفیق کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ اور اس کے

ابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ — ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (نساء) غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہین کرتا،

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہکر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کردی، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے، بلکہ فتائی میرا جوان کہے، اور اسی طرح غلامون کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤن کو رب نہ کہین، بلکہ مولی کہین[1]، اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کردیا، اور فرمایا کہ یہ جنکو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہین، جنکو خدا نے تمہارے تحت مین کردیا ہے، پس جسکو خدا نے تمہارے تحت مین کردیا ہے تو اسکو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دیدو، جو اس پر بھاری ہو جائے، اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام مین خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے[2]،

حضور کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلامون اور آقاؤن کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی[3]، ان بے خانمان افراد کو ان کے آقاؤن کے گھرون کا غلام بناکر نہین، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کریگا وہ اسی کے علاقہ مندون (موالی) مین شمار ہوگا[4]، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ مین اپنے فوجی افسرون کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہون ان کو ان کے قدیم آقاؤن کے خاندانون مین شمار کرو، جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو، اور اگر یہ غلام چاہین تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالین[5]، ان تعلیمات نے ان غلامون کو غلام نہین، بلکہ اسلام کا سردار، اور مملکتون کا بادشاہ بنا دیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آئندہ جلد مین اپنے مناسب موقع پر آئے گی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ما نہی عن السباب [3] ایضاً [4] حدیث مین ہے انما الولاء لمن اعتق، ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے، دوسری حدیث مین ہے او انتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت، امام نووی شرح مین لکھتے ہین بل ہو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے، صحیح مسلم

[5] صحیح مسلم کتاب العتق (...) کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ، ... صفحہ ۲۳۶

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدن مین گو مہمانی کی زحمت ہوٹلون اور ریسٹرانون نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گذشتہ نظامِ تمدن مین اسکی جگہ نہایت اہم تھی، اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر مین داخل ہے، اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام مین اسکی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کرینگے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کریگا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق مین مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کیساتھ نہین لیکن اہلِ عرب مین مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا،

قرآن مجید مین حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مہمانون کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتون مین آیا ہے،

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ	(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانون کی حکایت بھی تم تک
الْمُكْرَمِيْنَ، اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا،	پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) اُن کے پاس آئے تو آتے
قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ، فَرَاغَ اِلٰٓى	ہی سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا اور دل
اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ، فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ	مین کہا کہ یہ لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہین، پھر
قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ، فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً،	جلدی سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت
قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ،	بھنوا کر مہمانون کیلئے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انھون

نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیون

نہین (اس پر بھی انھون نے کھانے سے انکار کیا تب)

تو ابراہیم ان سے جی ہی جی مین ڈرے، انھون نے (انکی

یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کرین،

(ذاریات - ۲) اور اُن کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی،

اس حکایت سے آداب مہمانداری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہین،

(۱) مہمان اور میزبان مین کلام کی ابتدا، باہمی سلام سے ہونا چاہئے،

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہئے، کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہین،

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہون سے دیکھنے کے بھی ہین، اس لئے مہمانون کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہئے، کیونکہ اگر مہمانون کو یہ معلوم ہوجائیگا کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ ازراہ تکلف اُس کو روکین گے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہین کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے،

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے مہمانون سے الگ ہوجانا چاہئے، تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے مین تکلیف نہ ہو، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے اُن سے الگ ہوگئے،

(۵) مہمانون کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا،

(۶) کھانا مہمانون کے سامنے پیش کرنا چاہئے، اُن کو کھانے کا حکم نہین دینا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیون نہین کھاتے، یہ نہین کہا کہ آپ لوگ کھائیے؛

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے، کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے، کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا بچے اور اُن کے اہل و عیال کے کام آئے، اسی لئے جب اُن لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور اُن کے دل میں خطرہ پیدا ہوا، کہ یہ دشمن بنکر تو نہیں آئے ہیں،

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہئے، اسی لئے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہیں،

سورہ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ	کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھکو
وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ،	فضیحت نہ کرو، اور خدا سے ڈرو، اور مجھے رسوا
(حجر۔ ۵)	نہ کرو،

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ صلعم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک جزو قرار دیا، اور فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے، اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے، کہا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک

رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اسکے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1]، نیز فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اسکو چاہیئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے[2]"،

ایک حدیث مین ہے کہ رسول اللہ صلعم حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر نہین ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو، اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انھون نے کہا بیشک، فرمایا ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیونکہ تمھارے اوپر تمھارے جسم کا حق ہے، تمھاری آنکھ کا حق ہے، تمھارے مہمانون کا حق ہے، اور تمھاری بی بی کا حق ہے[3]،

ایک حدیث مین ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے پھر اگر مہمان کسی کے یہان رہ جائے تو مہمانی اُس پر قرض ہے، چاہے وہ لیلے، چاہے چھوڑ دے[4]"،

چونکہ کہین مہمان ہونا میزبان کے لئے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے، اور کسی کے ہان بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ جہان میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم کی ہدایت کی گئی ہے، وہان مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث مین یہ تصریح کردی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہان تین دن سے زیادہ نہین ٹھہرنا چاہیئے، کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اُس پر بار پڑیگا[5]، اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہوجائے گی جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذجارہ، [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالی ضیف ابراہیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف، [4] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف،

[5] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ،

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلعم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتون تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانون مین لڑائیون کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطرون مین گھرا ہوا پاتا تھا، اور اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اُس پر حملہ نہ کر بیٹھے،

آنحضرت صلعم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے، اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدّت کے بچھڑون کو ملا دیا، دشمنون کو بھائی بھائی بنا دیا، اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھکر اسلامی برادری کی یگانگی اُن کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتون کا خاتمہ کر دیا، اور باہمی دشمنیون کو انکے دلون سے ایسا بھلا دیا، کہ وہ حقیقت مین بھائی بھائی ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ	اے مسلمانو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق
وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝	ہے، اور نہ تم مرو لیکن مسلمان، اور خدا کی رسّی سب ملکر
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا	مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے
تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ	اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، تو اللہ
إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ	نے تمہارے دلون کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی
فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۝ (آل عمران۔۱۱)	ہوگئے،

مسلمانون کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنون کو باہم ملا کر ایک نہین کرسکتا تھا،

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال - ۸)

اور خدا نے مسلمانون کے دل ملا دیئے، اگر تو زمین مین جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا، تب بھی تو اُن کے دلون کو ملا نہ سکتا، لیکن خدا نے ملا دیا، بیشک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا، اور مصلحت جاننے والا ہے،

تو اب مسلمانون کو یہ چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کرین، اور سب مل کر خدا کے دین کی رسّی کو جو اُن کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبوط پکڑین، اور باہم اختلاف پیدا کرکے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائین، کیونکہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہین، فرمایا،

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال - ۶)

اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور آپس مین جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دوگے، اور تمھاری ہوا اکھڑ جائیگی،

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے، اور مسلمانون کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ مسلمانون مین باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے اُن مین اختلاف پیش آجائے، تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونون خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرین،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، (نساء - ۸)

تو اگر تم (مسلمانون) مین کسی بات مین جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو،

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانون کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑین اور اس کو صلح پر مجبور کرین، اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے اُن مین صلح کرا دین،

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا

اگر مسلمانون کے دو گروہ لڑ پڑین، تو اُن مین صلح کرا دو،

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا — پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے

عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى — لڑو، یہانتک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو اگر

تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا — وہ رجوع کرے تو اُن مین عدل کیساتھ صلح کرادو، اور انصاف

بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ — کرو، خدا منصفون کو دوست رکھتا ہے، مومن تو

الْمُقْسِطِيْنَ. اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا — آپس مین بھائی ہی ہین، تو اپنے دونون بھائیون کے

بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (حجرات-۱) — درمیان صلح کرادو،

آیت کے اخیر ٹکڑہ نے بتایا کہ باہم مسلمانون مین بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہین کٹتا، انہی آیتون کے تحت مین وہ حدیث ہے جس مین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا (بخاری مظالم) — تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کیجا سکتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کیجائے، فرمایا اس طرح کہ اُس کے ہاتون کو ظلم سے روکا جائے،

کیسا ہی بڑا سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا، اور شریعت اسلامی کو قبول کیا وہ دفعۃً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، خدا نے فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ — تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلین، اور نماز کھڑی کرین

فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (توبہ-۲) — اور زکوٰۃ دین تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہین،

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، تو وہ اسلام کے رشتہ مین داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہین معلوم تو کوئی حرج نہین وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ — تو اگر تم اُن کے باپون کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی

فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (احزاب-۱) — بھائی ہین، اور علاقہ مند،

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اُس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (بقرہ-۲۲) — تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا، (حجرات-۲) — کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے،

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیوں کا فرض ہے، اور اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جزء بنا لیں، اور ملا جلا کر خرچ کریں، تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہیں، جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہے، فرمایا،

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ، (بقرہ-۲۷) — اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں،

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ، (حشر-۱) — اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر،

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے، جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیئے اور کہنا چاہیئے،

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، (حشر-۱) — اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے

مسلمانون کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہین، خدا نے مدح فرمائی،

رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ۔ (فتح ۔ ۴) وہ (مسلمان) آپس مین رحم و شفقت رکھتے ہین،

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے، اور نرمی کا برتاؤ کرے،

اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِیۡنَ، (مائدہ ۔ ۸) مسلمانون سے جھکنے اور نرمی کرنے والے،

مسلمانون کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یون فرمائی ہے "مسلمانون کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے مین جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو مین بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بیخوابی مین مبتلا ہو جاتے ہین[1]" صحیح مسلم کی ایک اور روایت مین ہے کہ فرمایا "سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہین، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے، اور اگر سر مین درد ہو تو پورا جسم تکلیف مین ہوتا ہے[2]" مقصود یہ ہے کہ امتِ مسلمہ ایک جسم ہے، اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضا ہین، بدن کے ایک عضو مین بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہین، اور اس دکھ درد مین شریک ہوتے ہین، یہی مسلمانون کا حال ہونا چاہیئے، کہ اُن مین سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانون کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیئے،

ایک دوسری تمثیل مین آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہین جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے[3]" بخاری مین ہے کہ یہ کہکر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیون کو دوسرے ہاتھ کی انگلیون مین ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۹ کتاب الادب و صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۰۹ کتاب البر و الصلۃ و الآداب مصر، [2] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۰۹ مصر کتاب البر و الصلۃ و الادب، [3] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۰ و صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ و الآداب ج ۲ صفحہ ۳۰۹ مصر،

مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن وحصار بنجاتی ہے، اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اُسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اُس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائیگی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اس کی تحقیر کرے..... انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اُس کا خون، اس کا مال اور اسکی آبرو[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اُس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہیگا، تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اُس کی تنگی کو دور فرمائیگا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکا پردہ رکھے گا[2]"

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کریگا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا، اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا، اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھیگا، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے[3]"

فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں[4]" یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۸۲ مصر، [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۱، [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ ص ۱۹۴، [4] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

دوسری مین ہے کہ لوگون نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ سب سے اچھا مسلمان کون ہے، فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہین[1]، یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہین پہنچاتا، وہی سب سے بہتر مسلمان ہے،

جریر بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہین کہ مین نے رسول اللہ صلعم سے تین باتون پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا[2]، کئی روایتون مین ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے، اور اُس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے[3]، یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانون مین باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہین مانتا، اور یہ ایک معنی مین خدا کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لئے قرآن پاک مین مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے، جو کافرون کے لئے مخصوص ہے، فرمایا کسی مسلمان کو سزاوار نہین کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہوجائے:-

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ	اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا، تو اسکا
خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَ	بدلہ دوزخ ہے، وہ اس مین پڑا رہے گا، اور خدا
أَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ (نساء - ۱۳)	اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اُس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا،

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ مین آپ نے پہلے لوگون کو چپ کرایا، پھر فرمایا، دیکھو میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو[4]، ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو ہم (مسلمانون) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم مین سے نہین[5]،

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۳۶ مصر [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ و ج ۲ ص ۸۹۳ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان ص ۲۳ . [5] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۰ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۴ ،

کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے[1]۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ مین گرفتار ہو جس مین اُسکی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑیگا جس مین اس کی عزت پر حرف آتا ہو، اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دیگا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائیگا[2]

اگر دو مسلمانون مین کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے، تو آنحضرت صلعم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہین کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے ملاقات ہو تو وہ اودھر منھ پھیر لے اور یہ ادھر منھ پھیر لے، اور ان دونون مین بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے[3]" ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپنے فرمایا "آپس مین کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہین کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے[4]"

ایک مسلمان کے لئے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تمکو کوئی اپنے اظہار اسلام کے لئے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہین،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ	اُس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ
لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ (نساء - ۱۳)	تو مومن نہین،

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعوی کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہین پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہین، ایک لڑائی مین ایک صحابی نے ایک کافر کو زد مین پاکر حملہ کیا، اُس نے فوراً کلمہ پڑھدیا، مگر پھر بھی اُن صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت صلعم تک پہنچی، آپنے اُن کو بلا کر دریافت کیا، انھون نے عرض

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۵۹۔ [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲۔ [4] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۶،

کی، یارسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ نے کس بلیغ انداز مین فرمایا، تم اس کے لاالٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کروگے؟ ایک روایت مین ہے کہ فرمایا، کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا؟[1]

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے[2] یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کو اسے کافر کہے، تو وہ کفر دو مین سے ایک پر لوٹے گا[3] یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا، اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے،

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لئے دوزخ واجب، اور جنت حرام کریگا، ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیون نہ ہو[4]

فرمایا ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہین، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا، اور مرجائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا[5] یعنی یہ کم سے کم حقوق ہین، جن سے دو مسلمانون کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا کہ جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[6] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہانتک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے، اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اوسکو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے جنمین سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہوگی[7] یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جسکا ایک ذرہ اپنی بڑائی مین پہاڑ کا حکم رکھتا ہے،

---

[1] پہلی روایت صحیح بخاری غزوۂ حرقات اور کتاب الدیات مین ہے، دوسری روایت کے لئے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور، [2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۳ [3] ایضاً ص ۹۰ وصحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۴۳ مصر، [4] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۵ مصر [5] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱ [6] صحیح مسلم ۲ ص ۳۱۴ کتاب البر والصلۃ، [7] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲،

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اُس برادرانہ الفت و محبت کے فروع ہین جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہین ہوتا، اسی لئے آنحضرت صلعم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والون کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا، کہ تم مین سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے[1]" الغرض ملّتِ اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اُس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد مین ہے کہ آپ[2] نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے، اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس[3] کے نقصان کو دور کرتا ہے، اور اس[4] کے پیچھے مین اس کی حفاظت کرتا ہے[2]"

دیکھئے کہ آنحضرت صلعم نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادون پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتون پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیوارین ایسی شکستہ نہ رہین جیسی آج ہین، ہر جماعت انہی اصولون پر دنیا مین بنی ہے، اور آیندہ بھی بنیگی،



[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص۶، [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص۱۹۲، تیسرے فقرہ کے مطلب مین شارحین کا اختلاف ہے،

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہین، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانون کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے، اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے،

قرآنِ پاک نے توراتؔ کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جنمین سے ایک یہ بھی ہے،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، (بقرہ - ۱۰) اور لوگون سے اچھی بات کہو،

لوگون سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس مین کسی دین و مذہب کی تخصیص نہین، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ - ۲)

اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال مین) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے،

ہر قسم کا برا سلوک اور بیرحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق مین عدل سے کام نہین لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ آیتِ پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے

ابوہریرہؓ اور انس بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا،

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا	آپس مین ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے
وکونوا عباد اللہ اخوانا،	پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منھ پھیرو، اور
(بخاری۔۲)	سب مل کر خدا کے بندے اور آپس مین بھائی بنجاؤ،

بعض روایتون مین الفاظ یہ ہین،

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا	ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر
وکونوا عباد اللہ اخوانا	حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منھ پھیرو، اور
(بخاری)	اے خدا کے بندو آپس مین بھائی بھائی بنجاؤ،

اس حدیثِ پاک مین انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بنجائے، فرمایا من لایرحم لایرحم (بخاری) "جو رحم نہین کرتا، اس پر رحم نہین کیا جاتا" "جو بندون پر رحم نہین کرتا، اس پر خدا رحم نہین کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہین کرتا دوسرا بھی اُس پر رحم نہین کرے گا" مستدرکِ حاکم مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم زمین والون پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا[1]" یہ حدیث رحمۃ للعالمینؐ کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کیساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملیگا" (بخاری) اس فیض کے عموم مین انسانیت کی قید بھی نہین ہے، ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا، کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول کہ کیا جانورون کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین بھی ثواب ہے، فرمایا، ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین ثواب ہے، یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس مین زندگی کی تری ہے نیک سلوک

[1] مستدرک حاکم کتاب البر والصلہ، ج ۴ ص ۱۵۹،

کرنے مین ثواب ہے[1] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ مین ہر وہ ہستی شریک ہی جو زندگی سے بہرہ ور ہے،

جامع ترمذی مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت ابو ذرؓ سے ارشاد فرمایا "جہان بھی ہو خدا کا خیال رکھو برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دوگے، اور لوگون کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ" (باب اجارفی معاشرۃ الناس ص۲۳۱)

ابو ہریرہؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ حضورؐ نے پانچ باتین گنائین جنمین سے ایک یہ تھی، کہ واحب للناس ما تحب لنفسك، یعنی تم لوگون (ناس) کے لئے وہی چاہو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بنجاؤگے[2]" الناس کا لفظ عام ہے جس مین تمام انسان داخل ہین، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانون کی بھلائی کا جذبہ دل مین نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہین بنتا،

کیونکہ دوسرون کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث مین یہ تعلیم ان لفظون مین ہے، کہ تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو" بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے، اور ایک عام انسان بھی،

تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظون مین ہے کہ تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو" اسلام مین پڑوسیون کے حقوق کا بیان علحدہ باب مین گذر چکا ہے، اس پر یہان ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ صحابۂ کرام نے اس تعلیم کی پیروی مین یہودی اور عیسائی پڑوسیون کا حق بھی مسلمان پڑوسیون ہی کی طرح مانا ہے

صدقہ وخیرات کے باب مین گو فقرا، اور مساکین مین مسلمانون کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے، تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ مین نامسلمان ذمی مسکینون کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہون، حضرت عمرؓ

---

[1] یہ حدیثین صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب مین ہین، [2] ترمذی ابواب الزہد غریب،

اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے، اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگون کو دیکھو، خدا کی قسم ہم انصاف نہین کرینگے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی توکھائین اور اس کے بوڑھے ہوتے پر اس کی مدد چھوڑ دین، قرآن مین صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لئے ہے، فقراء تو وہی ہین جو مسلمان ہین، اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب مین ہین، ان سے جزیہ نہ لیا جائے[۱]،

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلمون کو دیئے جاسکتے ہین، آنحضرت صلعم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المؤمنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ دارون کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہین کہ قرآنؐ نے "اسیر" کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ مین مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہؓ اور عمرو بن میمون اور عمرو بن شرحبیل صدقہ فطر سے عیسائی راہبون کی مدد کیا کرتے تھے، آنحضرت صلعم کے زمانہ مین حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، اور خود حضورؐ نے بعضون کو ان کے مشرک والدین کی صلۂ رحمی کی اجازت دی[۲]،

تفسیر کی روایتون مین ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکون کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو آیت اتری،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ	ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہین لیکن اللہ جسکو چاہتا ہے
يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ (بقرہ-۳۷)	راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لئے ہے،

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملیگا،

مسند احمد مین ہے کہ آپ نے مسلمانون کو خطاب کرکے فرمایا،

لا يؤمن احد كم حتى يحب للناس ما يحب	تم مین سے کوئی اس وقت پورا مومن نہین ہوگا جبتک وہ اور
لنفسه وحتى يحب المرء لا يحبه الا لله عز وجل	لوگون کیلئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو، اور جبتک
(جلد ۳ ص ۲۷۲)	وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے،

اس حدیث مین محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے،

[۱] الخراج قاضی ابو یوسف صـ مصر، [۲] دیکھو ... کتاب الاموال امام ابو عبیدہ ص ۶۱۶ مصر، نووی کتاب المجموع ... [illegible] ... رازی،

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا مین لطف و محبّت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہو، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقون سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانورون کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگون سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھا جاؤ، اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت مین نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب مین موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اُس کی قبر پر باندھتے تھے، اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہین دیتے تھے، اور وہ اسی حالت مین سوکھ کر مرجاتا، ایسے جانور کو بلیّۃ کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا، عرب مین ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اُس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس قسم کے جانورون کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی رُوح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے[1]،

ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اُس کے خاندان مین آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ صفحہ ۲۵۵،

کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہین رسول اللہ صلعم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے[۱] اس سے بھی زیادہ بیرحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ صلعم نے مدینہ مین آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانورون کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مُردار ہے[۲]، یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانورون کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[۳]۔

بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[۴]، ایک حدیث مین ہے کہ کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا" صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہین کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے[۵]، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانورون کا گوشت کھایا نہین جاتا، اور وہ درندہ بھی نہین اُن کا مارنا جائز نہین، سنن نسائی مین ہے کہ جو شخص کنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہان فریاد کرے گی کہ فلان نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[۶]۔

جو جانور کوئی نقصان نہین پہنچاتے یا اُن سے انسانون کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اُن کا مارنا بھی جائز نہین چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[۷]،

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہین، اُن کے مارنے یا ذبح کرنے مین بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، تم مین ہر شخص اپنی چھری

---

[۱] بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [۲] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء ما قطع من الحی فہو میت [۳] بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ والمصبورۃ والمجثمۃ [۴] مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۲۰۸ [۵] مشکوۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۵۰ [۶] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۷۹ [۷] مشکوۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۶۲،

کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[1]،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کریگا[2]، یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دیکر جانورون کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[3] کیونکہ اس سے جانورون کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی، اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[4]، مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانورون اور پرندون کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہین، جانورون کے ساتھ جو بے رحمیان کیجاتی تھین اُن کا اصل سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانورون کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اسلئے رسول اللہ صلعم نے اہلِ عرب کو بتایا کہ جسطرح انسانون کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانورون کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے، چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپنے فرمایا کہ اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[5]، بلکہ لوگ چونکہ انسانون کی بہ نسبت جانورون کو زیادہ ستاتے ہین، اس لئے وہ اس معاملے مین بہت زیادہ گنہگار ہین، چنانچہ آپنے فرمایا کہ تم لوگ جانورون کے ساتھ جو بدسلوکیان کرتے ہو، اگر خدا اُن کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے[6]،

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ مین تھے، آپ ضرورت سے کہین تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے، جہان زمین مین یا درخت پر چیونٹیون کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپنے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے، اُن صاحب نے کہا یا رسول اللہ یہ مین نے کیا، آپنے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ[7]، (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیون کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائین)،

---

[1] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ [2] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۳۶ [3] نسائی صفحہ ۲۰۴ [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ، [5] بخاری کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۵ [6] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۴۴ [7] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبداللہ بن مسعود،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو اُن کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انھون نے پہلے اپنا سامان اُس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیون کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیون نہین جلایا[1] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیون کا قصور نہ تھا، ایک حدیث مین ہے کہ ایک سفر جہاد مین صحابۂ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرطِ محبت سے اُن کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ صلعم قضاے حاجت کے لئے گئے ہوے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچون کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچون کو چھوڑ دو صحابۂ کرام نے چیونٹیون کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے[2]،

اسی طرح اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانون کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہ اسی طرح جانورون اور پرندون کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے، اسی عدمِ واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ مین نے خاص اپنے اونٹون کے لئے پانی کے جو حوض بنائے ہین اُن پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہین، اگر مین اُن کو پانی پلادون تو کیا مجھکو اس پر ثواب ملیگا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[3]،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک شخص راستہ مین جا رہا تھا کہ اُس کو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اس کو ایک کنوان مل گیا اور اس نے کنوئین مین اوتر کر پانی پی لیا، کنوئین سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے، اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اُس پر ترس کھایا اور کنوئین مین اتر کر پانی لایا اور اُس کو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اُس کو بخشدیا، صحابۂ کرام نے اس واقعہ کو

---

[1] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق صفحہ ۴۶۴، [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار [3] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء،

سنا تو بولے کہ یارسول اللہ کیا جانورون کے ساتھ سلوک کرنے مین بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[1]، صرف جاندارون ہی تک نہین بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے، اور اُس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ[2] یعنی ثواب کا کام ہے،

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانورون کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اُس سے وہی کام لینا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ مین اس کے لئے نہین پیدا کیا گیا ہون، صرف کھیتی باڑی کیلئے پیدا کیا گیا ہون[3]، نیز فرمایا کہ اپنے جانورون کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے اُن کو تمھارا فرمانبردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات مین پہنچا دین جہان تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتین اسی پر پوری کرو[4]، اگرچہ رسول اللہ صلعم نے بعض موقعون پر اونٹ کی پشت پر بیٹھکر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانورون کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہین کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت مین اُس پر سوار ہونا چاہئے،

(۲) جانورون کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانے مین سفر کرو تو اونٹون کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانے مین سفر کرو تو اسکو تیزی کے ساتھ چلاؤ[5]، تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ مین ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپنے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بیزبان جانورون کے معاملہ مین خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو اُن کو اچھی حالت مین رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم، [2] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ [3] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ، [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ، [5] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق،

کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت مین رکھکر کھاؤ،[۱]

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ مین رفع حاجت کے لئے گئے، اُس مین ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلعم کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہوگیا، آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا اس جانور کے بارے مین جسکا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہین ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو،[۲]

(۳) جانورون کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا،[۳]

(۴) جانورون کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا،[۴] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہوکر تکلیف پاتے ہین،

یہ پچھلے صفحون پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ مین جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے،



[۱، ۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایؤمر بہ من القیام علی الدواب والبہائم [۳] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی وسم الدواب،
[۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں، کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکماے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک اُمہاتِ اخلاق، اور دوسری فروعِ اخلاق، امہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں، جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں، اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں، اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے،

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوتِ علمیہ، قوتِ شہوانیہ، اور قوتِ غضبیہ قوتِ علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور انھیں کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں،

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا، اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لئے اُس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے، اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لئے اپنی تعلیم میں اُس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے، اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے،

اسلام کی ہر شے مین خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہو کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اُس مین عقلی خوبیان، اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس مین عقلی برائیان اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمین ہین: وہ اخلاق جنکو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہین، اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہین، ہم نے اوپر اخلاق "محبتِ الٰہی" کے عنوان مین وہ آیتین لکھدی ہین جنمین اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہو،

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح مین فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہین اور قرآنِ پاک اور احادیثِ شریفہ مین جابجا اُن کی تصریح ہے لیکن اُن کے بیان مین اخلاقِ شرعی کے مصنفون نے کوئی خاص ترتیب نہین رکھی ہو اسی لئے اُن کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہین مقرر ہوئے،

میرا خیال یہ ہو کہ فضائل مین سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولون اور پیغمبرون کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانون کو اُس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوی مین زیادہ زور دیا گیا ہو، اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیون کی بنیاد ہو،

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے، اور غور و فکر کرنے والون مین اس بارہ مین اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہان تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے، اس مین کامیابی کی کوشش کرونگا

فضائل کی مختصر فہرست جن فضیلتون کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور جن کو گنا کر اُس نے اپنے اچھے بندون کی توصیف کی ہے، یا اُن اوصاف والون کے لئے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی مین جابجا اُن کی تفصیل ہے، جیسے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ	ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی نماز مین عاجزی کرتے
خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	ہین، جو بیکار باتون کی طرف رُخ نہین کرتے، جو زکوٰۃ

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ	دیتے، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے، کہ ان
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ	پر کوئی الزام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ	تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝	اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝	کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں، جو فردوس کے
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ (مومنون-۱)	وارث ہوں گے، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں، نیکی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاکدامنی امانت داری، اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى	فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان
حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	لایا، اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ	کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا، اور نماز کھڑی کی اور
اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ	زکوٰۃ دی، اور اپنے قول کو جب انھوں نے اقرار کیا
الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ،	پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی
(بقرہ-۲۲)	کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے،

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا، اور مشکلوں میں ثابت قدمی،

سورۂ آل عمران میں ہے،

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ (آل عمران-۲)

ثابت قدم رہنے والے، اور سچ بولنے والے، اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے والے، اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی، اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں اُن متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہونگے،

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران-۱۴)

جو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے،

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے،

وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ (معارج-۱)

اور جن کے مال میں مانگنے والے، اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ اُن کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے، کہ ان میں اُن پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں،

ان آیتوں میں سخاوت نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی اعلیٰ فضیلتوں

مین شمار کیا ہے جو اس کے جنت مین جانے کی سبب ہوئی ہین،

سورۂ احزاب مین اُن مردون اور عورتون کا ذکر ہے، جن کے لئے اللہ تعالٰی نے اپنی بخشایش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے،

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیان صبر کرنے والے اور صبر کرنے
وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ	والیان اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیان، اور صدقہ دینے والے
الْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَ	اور صدقہ دینے والیان، اور روزہ رکھنے والے اور روزہ
الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ،	رکھنے والیان، اور اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرنے
(احزاب ۔ ۵)	والے اور حفاظت کرنے والیان،

ان مین سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے،

سورۂ فرقان مین خدا کے اچھے بندون کی پہچان یہ بتائی گئی ہے،

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہین جو زمین مین ہولے
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ	چلتے ہین، اور جاہل جب اُن سے (جہالت کی) باتین کرین
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، (ع ۔ ۶)	تو وہ کہین سلامت رہئے،
(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا	(۲) اور جب وہ خرچ کرین تو نہ تو فضول خرچی کرین اور نہ
وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (۲)	تنگی کرین، اور دونون کے بیچ کی راہ ہو،
(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ	(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہین لیتے، اور نہ بدکاری
اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ (۳)	کرتے ہین،
(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۴)	اور جو جھوٹی گواہی نہین دیتے، اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (۵)	پاس سے گذرین تو شریفانہ وضع سے گذر جائین،

پہلی آیت مین عاجزی اور فروتنی، اور بردباری، دوسری آیت مین اعتدال اور میانہ روی، تیسری مین علم ظلم اور عفت اور چوتھی مین سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد مین وہ صفتین بتائی گئی ہین جو عقبیٰ مین کام آئین گی،

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہین، اور قول کو توڑتے
الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ	نہین، اور جس کے جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اُس کو جوڑے
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ	رکھتے ہین، اور اپنے مالک سے ڈرتے ہین، اور بری طرح
سُوْٓءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ	حساب ہونے سے سہمے رہتے ہین، اور جنھون نے اپنے
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا	مالک کی خوشی کے لئے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی، اور ہم نے
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ	جو اُن کو دیا اس سے چھپے اور کھلے اچھے کامون مین خرچ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ	کیا، اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہین، انھین کیلیے
(رعد-۳)	پچھلا گھر ہے،

اس ایفاے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہلِ قرابت اور حقدارون کے حقوق ہین، ان دو کے سوا ان آیتون مین اُن کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگون سے بھلائی کرتے ہین، یا یہ کہ بھلائی کرکے برائی کو دھو دیتے ہین،

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا	اس پچھلے گھر کو ہم اُن کے لیے کرین گے جو زمین مین
يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا	غرور اور فساد کرنا نہین چاہتے، اور آخر انجام پرہیزگارون
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (قصص-۹)	کے لیے ہے،

یعنی غرور و نخوت نہین کرتے،

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ — اور جو بڑے گناہون اور بیحیائی کے کامون سے بچتے ہین

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ ۝ (شوریٰ-۴) — اور جب اونھین غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہین،

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہین ہوتے اور معاف کر دیتے ہین،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ، (مائدہ-۶) — بیشک اللہ انصاف والون کو پیار کرتا ہے،

عدل وانصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ، (بقرہ-۲۴) — بیشک اللہ نیک کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے،

اس پیار اور محبت کے استحقاق مین ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے،

حدیثون مین جن اخلاقی فضیلتون کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحون مین گذر چکی ہین، اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئینگی،



صِدق

اُوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہو وہ میرے خیال مین سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتین آجاتی ہین،

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہو کہ اُس کے لئے اس کا دل اور اسکی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہون، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہین اُس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے، اور جو سچا ہے اُس کے لئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہین کہ ایک شخص آنحضرت صلعم کی خدمت مین حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ مجھ مین چار بری خصلتین ہین، ایک یہ کہ بدکار ہون، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہون تیسری یہ کہ شراب پیتا ہون، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہون، ان مین سے جس ایک کو فرمائیے، آپ کی خاطر سے چھوڑ دون، ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا، پھر اور بدکاری کے لئے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلعم پوچھین گے کہ رات تم نے شراب پی، اور بدکاری کی؛ تو کیا جواب دونگا، اگر ہان کہونگا تو شراب اور زنا کی سزا دیجائے گی، اگر نہین کی تو عہد کے خلاف ہوگا، یہ سوچکر ان دونون سے باز رہا، جب رات زیادہ گذری اور اندھیرا خوب چھاگیا تو چوری کے لئے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اُس کا دامن تھام لیا، کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہونگا، ہان کرونگا، تو ہاتھ کٹے گا اور نہین کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمتِ نبوی مین حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ

جھوٹ نہ بولنے سے میری چارون بری خصلتین مجھ سے چھوٹ گئین، یہ سنکر آنحضرت صلعم مسرور ہوئے،

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیون سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راستباز راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اُس کے دل مین نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اُس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگون کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کریگا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیون کی اصلی بنیاد قرار پائیگی،

صدق صفاتِ ربانی مین سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ مین خدا آپ فرماتا ہے،

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (نساء-۱۱) اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات مین،

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے،

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (نساء-۱۰) وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات مین،

خدا سچا ہے، اس لئے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا،

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (انعام-۱۸) اور ہم ہین سچے،

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (آل عمران-۱۰) کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا، تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو،

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو

ؔلہ اس قصہ کو مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ ن مین کتبِ سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے، لیکن مجھ کو اسکا ماخذ نہین معلوم ہوا،

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ، (زمر-۴) پرہیزگار ہین،

اس آخری آیت مین سچائی سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہی مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہو اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگارون کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہین، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہین، اور اپنے ہر قول اور عمل مین سچائی کو پیش کرتے ہین،

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولون کے وعدون کو سچا ہوتے اپنی آنکھون سے دیکھتے ہین تو پکار اٹھتے ہین،

وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ، (احزاب-۳) اور خدا اور اُس کے رسول نے سچ کہا،

چونکہ رسول، خدا سے علم پاتے ہین، اس لئے وہ بھی سچے ہوتے ہین،

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ، (یٰس-۲) اور پیغمبرون نے سچ کہا،

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبرون کا سب سے پہلا وصف ہے، کیونکہ اُن کی ساری باتین، دعوے، دلیلین اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہون تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبرون کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملتِ حنیف کے داعی حضرت ابراہیم کو اس سے متصف فرمایا ہی، ارشاد ہوتا ہے.

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ، (مریم-۳) اور کتاب مین ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ، (مریم-۴) اور کتاب مین ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

حضرت مریمؑ جنھون نے اللہ کی باتون کے سچ ماننے مین ذرا بھی پس و پیش نہین کیا، اس وصف سے ممتاز ہو مین فرمایا گیا

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (مائدہ-۱۰) اور اُن (عیسیٰ) کی ماں بڑی سچی تھین

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر مین ایسے سچے نکلے، بندون کی زبان سے صدیق کہلائے،

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف-۶) یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (مریم-۴) اور کتاب مین اسمٰعیل کا ذکر کر، بے شبہہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا،

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگون کو ملیگی اُن مین وہ بھی ہون گے جو دنیا مین دوسری صفتون کے ساتھ سچائی اور راستبازی سے ممتاز تھے،

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ (آل عمران-۲) صبر کرنے والے اور سچے،

خدا نے جن لوگون کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہین، اُن مین اسلام و ایمان اور خدا کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچون اور راستبازون کا ہے، فرمایا،

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ الآیہ ..... اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (احزاب-۵) بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتین ایمان لانے والے مرد اور عورتین اور فرمانبردار مرد اور عورتین اور سچے مرد اور سچی عورتین، ..... خدا نے اُن کے لئے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے،

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی مین ملیگا، اور وہ وہان ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے،

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ-۱۶) یہ دن ہے کہ سچے بندون کو اُن کا سچ کام آئیگا،

اس امتحان مین جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اُسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائیگا، چنانچہ فرمایا،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ (احزاب) تاکہ اللہ سچے اُترنے والون کو اُن کی سچائی کا عوض دیدے

اسلام مین سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہین کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم ہر جگہ دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچون کا ساتھ دو، سچون ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو، اور انھین کی صحبت مین رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعب بن مالک اور اُن کے دو ساتھیون نے جو تبوک کے سفر مین رسول اللہ صلعم کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفین سہکر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اُس کی طرف اشارہ کرکے خدا فرماتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ - ۱۵) اے ایمان لانے والو، خدا سے ڈرو، اور سچون کے ساتھ ہو،

اہل تفسیر کے نزدیک یہان ان سچون سے مراد آنحضرت صلعم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہین جن کی سچائی کا بار ہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہر حال آنحضرت صلعم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانون کو سچون کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے،

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہین، مگر اسلام کی نگاہ مین اس کے بڑے وسیع معنی ہین جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہین بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم مین بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمین کی ہین، اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہین، بات مین سچائی، ارادہ اور نیت مین سچائی، عزم مین سچائی، عزم کو پورا کرنے مین سچائی، عمل مین سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب مین سچائی، لیکن ذرا معنی مین وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسمون مین ساری سچائیان آجاتی ہین، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی،

زبان کی سچائی یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے، اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم مین داخل ہے، اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب مین ایک آیت ہی،

لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ، الآیة (رکوع-۳) — تاکہ اللہ سچون کو اُن کی سچائی کا عوض دے اور منافقون کو سزا دے اگر چاہے......

اس آیتِ پاک مین صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلعم نے بیان کے مختلف پیرایون مین ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہی کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہوسکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہوسکتا ہے، جواب دیا ہوسکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے فرمایا نہین[1]"، کئی صحابی کہتے ہین کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر[2] (نہین) مطلب یہ ہے کہ مومن مین ہر برائی ہوسکتی ہی، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہین ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہی اسی لئے ارشاد ہوا کسی بندہ کا ایمان پورا نہین ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہانتک کہ مذاق اور جھگڑے مین بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیون نہ ہو[3]" ان روایتون کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابون مین ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جس مین چار باتین ہون وہ پکا منافق ہے، اور جس مین اُن مین سے ایک بات ہو

---

[1] موطا امام مالک باب ما جاء فی الصدق والکذب، [2] عن ابی امامۃ عند احمد، وعن سعد بن ابی وقاص عند البزار وابی یعلی والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر، وقد روی مرفوعاً وموقوفاً، [3] مسند احمد عن ابی ہریرۃ وطبرانی، نیز مسند ابو یعلی عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثین حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہین،

تو اسمین نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اُس کو چھوڑ نہ دے، جب[1] امانت اُس کے سپرد کیجائے تو خیانت کرے، جب[2] بات کرے جھوٹ بولے، جب[3] کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، اور جب[4] جھگڑے تو حق کے خلاف کہے[1] یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتین تین[2] ہین جب[1] کہے تو جھوٹ بولے، جب[2] وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب[3] امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے"[2] صحیح مسلم مین اس کے بعد ہے "اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیون نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیون نہ کہتا ہو"[3]

ان روایتون سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے، اور بدکاری دوزخ کو لیجاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہانتک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہان جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے"[4]

دل کی سچائی صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونون ایک ہی چیز بنجاتے ہین، اور اس حالت مین بعض موقعون پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہین نکلا، منافق رسول اللہ صلعم کی خدمت مین آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی لیکن چونکہ یہ اقرار اُن کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منفقون-۱) اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہین،

یعنی اپنی شہادت مین جھوٹے ہین، زبان سے تو یہ کہتے ہین کہ ہم اقرار کرتے ہین کہ آپ خدا کے رسول ہین لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہین، اُن کے دل مین کچھ ہے، اور زبان پر کچھ اور،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان، و صحیح مسلم و ابو داؤد و ترمذی و نسائی، [2] صحیح بخاری کتاب الایمان و کتاب الادب و صحیح مسلم، [3] صحیح مسلم، [4] صحیح بخاری کتاب الادب،

اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کیجائے اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو، اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہی، ایک حدیث مین ہو کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم ایک شہید اور ایک دولتمند پیش ہونگے، اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کریگا، لیکن ان کارنامون کو سُنکر خدا کہیگا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہین گے"۔ یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہین کئے گئے تھے، تاہم چونکہ اُن مین اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھوٹ کہا، کہ اُن کے ان کارنامون کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہان کوئی معاوضہ نہین،

عمل کی سچائی عمل کی سچائی یہ ہو کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو یا یون کہئے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہون، مثلاً ایک شخص نماز مین خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اُس کا مقصود صرف نمایش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہی، ایک شخص نمایش کے لئے ایسا نہین کرتا، تاہم ظاہری طور پر اُس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے اُس کے باطن مین وہ خشوع و خضوع نہین ہے اس لئے اُس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہین کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال مین صادق نہین، اس لئے زبان کی سچائی، اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لئے جن مسلمانون نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ مین جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	مسلمان تو وہی ہین جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہین کیا، اور
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ	اللہ کے رستے مین اپنی جان و مال سے جہاد کیا، یہی

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ،

الصّٰدِقُوْنَ، (حجرات - ۲) سچے لوگ ہیں،

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کردی،

اس صدقِ عمل کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو، مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمایش کا وقت آتا ہے تو اُس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لئے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومنِ کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اُتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ	اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے
فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا	میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورۃ اُتری
الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ	ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں
مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ	کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم اُن کو دیکھو گے
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ، طَاعَةٌ	کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں
وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ	جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو، تو اُن پر تف ہو، (رسول
صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،	کی) فرمانبرداری چاہئے اور صاف و سیدھا جواب دینا چاہئے
(محمد - ۳)	اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو

ان کے حق میں بہتر ہو،

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدقِ عمل کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اُس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو،

اس لئے صحابۂ کرام مین جنلوگون نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کردکھایا ہے، خدانے اُن کو سچا کہا ہے، چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر مین شرکت کا موقع نہین ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انھون نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ مین شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤن گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد مین شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھاکر شہادت حاصل کی، ایفاے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان مین یہ آیت نازل فرمائی،[1]

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا	مسلمانون مین کچھ لوگ ایسے ہین کہ خدا کے ساتھ انھون
اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ	نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اُس مین سچے اترے
مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِيَجْزِيَ	سو (بعض تو) ان مین سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے
اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	(یعنی شہید ہوئے) اور بعض اُن مین سے ایسے ہین جو
الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ط	(شہادت کے) منتظر ہین اور انھون نے (اپنی بات
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا،	مین) ذرا سا بھی ترددو بدل نہین کیا، تاکہ اللہ سچون کو
	اُن کی سچائی کا عوض دے، اور منافقون کو سزا دے اگر چاہے
(احزاب – ۳)	یا اُن کو معاف کردے[2] بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم والا ہے

صدق عمل کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگون کو صدیق کہا ہے، اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہین، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھون سے اس کا مشاہدہ کرتے ہین، بعض بعض صحابیون کے حالات مین اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے حضور انور صلعم سے کہا کہ "مین خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہون" آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب، [2] یعنی ان منافقون کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بنجائین تو خدا اُن کو معاف فرمائے،

ہے، توتمھارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لئے رات کو جاگا کرتا ہون، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہون (روزہ) گویا مین علانیہ عرشِ الٰہی کو دیکھ رہا ہون، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہلِ جنت باہم مل جل رہے ہین، گویا مین دوزخیون کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہون" ارشاد ہوا کہ تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو"[1]

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے، اور رسول اللہ صلعم کی خاص صحبتون مین اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے، انھون نے پوچھا، حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے مین منافق ہوگیا، ہم لوگ رسول اللہ صلعم کی خدمت مین ہوتے ہین، اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہین تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہین لیکن جب پلٹ کر بال بچون، اور دنیوی کاروبار مین مشغول ہوجاتے ہین تو سب بھول جاتے ہین، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونون بزرگ رسول اللہ صلعم کی خدمت مین آئے، اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمھاری مجلسون مین مصافحہ کرتے لیکن یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے[2]

قرآنِ پاک کی اس آیت مین گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ، (تکاثر) — ہرگز نہین اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اُس کے نتائج الگ نہین ہوسکتے،

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآنِ پاک کی ان آیتون مین ہے؛

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	نیکی یہی نہین کہ (نماز مین) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	طرف کرلو، بلکہ نیکی تو اُن کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	اور فرشتون اور (آسمانی) کتابون اور پیغمبرون پر ایمان
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ	لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ دارون اور یتیمون اور

[1] اسد الغابۃ تذکرۂ حارث بن مالک، [2] ترمذی ابواب الزہد،

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ - ۲۲)

محتاجون اور مسافرون اور مانگنے والون کو دیا، اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگون کی) گردنون (کے چھڑانے) مین (دیا) اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کر لیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف مین اور ہل چل کے وقت مین ثابت قدم رہے یہی لوگ ہین جو سچے نکلے اور یہی ہین پرہیزگار"

ان آیتون مین جنکو صادق کہا گیا ہے، اُن کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہین، اول اُنکے ایمان کا کمال، دوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ مین اُن کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ علم اور عمل کے اِن تمام فضائل کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہین اُن کو شریعت کی زبان مین جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہین[1]، جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل مین نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا، اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمرہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہی،

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۔ (نساء - ۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت مین) اُن (مقبول بندون) کے ساتھ ہون گے جن پر اللہ نے انعام کئے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہین،

سورۂ حدید مین ایمانِ کامل اور جانی ومالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۔ (حدید - ۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسولون پر ایمان لائے وہی صدیق ہین،

---

[1] الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل، (مجمع البحار فتنی) — صدیق وہ ہی جنکے قول کی تصدیق عمل سے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اُس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ "انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے،

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی، اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راستباز اور صادق ہے۔



سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کردینے کے ہین، اور اس کی بہت سی صورتین ہین، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ مین ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ مین ڈال دینا، دوسرون کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت مین اپنی جان دیدینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمین ہین جن کے امتیاز کے لئے الگ الگ نام رکھے گئے ہین،

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنون کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمون کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرون کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کامون کی بنیاد ہے،

سورۂ بقرہ کے شروع مین اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندون کے کچھ اوصاف بتائے ہین، ان مین سے ایک یہ ہے

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ،	اور ہم نے اُن کو جو روزی دی اس مین سے کچھ (خدا کی راہ مین) خرچ کرتے ہین،
(بقرہ ۱-۱)	

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہین[1]

[1] تفسیر ابن جریر طبری اوائل بقرہ آیت مذکور

بلکہ یہان جس طرح روزی کی تخصیص نہین کیگئی، کہ کیا دی گئی پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس مین سے کچھ خدا کی راہ مین دینے کی صورت کی بھی تعیین نہین کیگئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہو اسکو اس مین سے اس شخص کو دینا چاہیئے جس کو یہ نہین ملا، یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس مین سے کچھ اُن کو دینا جو اُس سے محروم رہے ہین، یا جو اس کے محتاج ہین متقیون کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح مین سخاوت اور فیاضی ہو،

ایمان کے بعد اسلام کے دوسرے اہم رکن نماز اور زکوٰۃ ہین، زکوٰۃ کی اصلی رُوح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر مین اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہو، یعنی جسطرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندون کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی مین یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اُس مین اپنے ہم جنسون کیساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کرکے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ مین خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ مین خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہین کہین اسکو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس مین سے کچھ خرچ کرو
مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا	جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے
خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ	جس مین نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہو،
الظَّالِمُونَ ۝ (بقرہ-۳۴)	اور کافر ہی ہین ظالم،

اس آیتِ پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہین ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہو کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کرکے خدا کی راہ مین اپنی کوئی چیز خرچ نہین کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے، جو خدا کی روزی کی نعمت پاکر اُس کے شکرانہ مین اس مین سے کچھ خدا کی راہ مین نہین دیتا،

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے، کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے، اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو، کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے،

خدا کی راہ میں جو سخاوت کیجائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر- ۱) اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائیگا اس کی مزدوری خدا دیگا، اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھیگا، ارشاد ہے،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اسکے
ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى	خرچ کئے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اولاہنا
لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ ۳۶)	دھری ہے، اور نہ ان کو ڈر ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہونگے

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے، اس میں سے جو تم نے کمایا
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ	اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بری چیز کے دینے
بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۝	کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالانکہ تم اب اس کو لینے والے
(بقرہ ۳۷)	نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو،

مطلب یہ ہو کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہو تم کو ہاتھ نہیں آسکتا، صاف فرمایا

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ۔ (آل عمران-۱)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اُس مین سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو خدا جانتا ہے

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر اس سب دلون کے حال جاننے والے سے تو نہین چھپ سکتی ہے، اور اسی لئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے، اور اس طرح نیکی کے کام مین جو کچھ تم دیتے ہو اسکا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملیگا، دنیا مین تو اسطرح کہ جماعتی کامون کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجون کی مدد مین جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہو جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو، اور دین مین تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملیگا جو کرے گا، فرمایا،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (بقرہ-۳۷)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمھارے ہی لئے ہے اور تم نہین خرچ کرتے مگر اللہ کے لئے، اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دیا جائے گا، اور تمھارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کیجائے گی،

اور اسی لئے کہ دنیا مین جو کچھ دیگا وہ آخرت مین اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالی نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے، اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ (بقرہ-۳۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اسکے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے،

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (حدید-۱)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اسکو اس کے واسطے دونا کرے، اور ہے اس کے لئے [illegible]

آگے چل کر پھر فرمایا،

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ	بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیان
قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ	اور قرض دیتے ہین اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائیگا
كَرِيْمٌ، (حدید-۲)	اور اُن کے لئے عزّت والی مزدوری ہے،

کہین حکم کی صورت مین ہی،

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (مزمل-۲)	اور اللہ کو اچھا قرض دو،

قرضِ حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے، اور اُس کے بدلہ مین لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اُس پر احسان دھرا جائے نہ اُس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتون کا عہد لیا تھا، اور اُن کو قرآن مین مسلمانون کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، اُن مین نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے، اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے،

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (مائدہ-۳)	اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے،

تو ان باتون کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ	تو مین تم سے تمھاری برائیان اتارون گا، اور تم کو ان
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، (مائدہ-۳)	باغون مین داخل کرونگا، جن کے نیچے نہرین بہتی ہین،

آنحضرت صلعم کے زمانہ مین جو بدوی ایمان لائے، اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر مین خرچ کرتے تھے، خدا نے اُن کی تعریف فرمائی،

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	اور بعض بدوی ایسے ہین جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان
الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ	لائے ہین، اور ٹھہراتے ہین جس کو خرچ کرتے ہین اللہ
وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ، (توبہ-۱۲)	سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا،

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی،

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ	ہاں، وہ اُن کے حق مین نزدیکی کا سبب ہے، اُن کو اللہ
فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ	اپنی رحمت مین داخل فرمائے گا، بے شک اللہ بخشنے
(توبہ - ۱۲)	والا مہربان ہے،

متقی سخیوں کیلئے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے، اور اسکی طرف جھپٹ کر جانے کی دعوت دی ہے،

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو
عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ	جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں
لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ	کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) مین
وَالضَّرَّآءِ ، الآیۃ ، (آل عمران ۱۴)	خرچ کرتے ہین، . . . .

سورہ بقرہ مین اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ مین کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گونا کیونکر ہوگا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا،

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ مین خرچ کرتے
اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ	ہین، ایک دانہ کی سی ہے، جس سے سات بالین
فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ	اُگتی ہین، ہر بال مین سَو دانے ہوتے ہین، اور اللہ
يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	جس کے لئے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے، اور اللہ گنجایش والا ہے سب جانتا ہے،
(بقرہ - ۳۶)	

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑون دانے بنجاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑون دانے پیدا کر لیتا ہے، خدا گنجایش اور کشایش والا ہے، اس کے ہان ایک کا سو بنجانا کچھ مشکل نہین ہے، اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی رکوع کے آخر مین اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خدا کی خوشنودی کے لئے اچھی نیت سے

اپنا مال دیتے ہین ایک اور مثال دی ہے،

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ، فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ، وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ، (بقرہ ۔ ۳۶)

اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوشنودی چاہنے کے لئے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہین، ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا، اور اگر مینہ نہین پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمھارے کام دیکھتا ہے،

اس مثال مین ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین مین پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ مین جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ مین سو ہو جاتا ہے، اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لئے ہماری نیتون کے بھید سے بھی آگاہ ہے،

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل مین بیان کیا گیا ہے، فرمایا،

۱۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی، (لیل ۔ ۱)

تو جس نے (راہِ خدا مین) دیا، اور پرہیز کیا، اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لئے (نیکی کی) سہج بات کا راستہ آسان

۲۔ وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی، الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی، وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی، وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۝ (لیل ۔ ۱)

اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائیگا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے، اور اس پر کسی کا احسان نہین جس کا بدلہ دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لئے، اور وہ خوش ہو جائیگا،

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا مین دینے کی عادت، اطاعت و عبادت، یا نیک کامون کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اُس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا

فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ اپنے شقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو، بلکہ مقصود صرف خدا ہو، اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اُس کا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو خدا فرماتا ہے تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائیگا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت مین یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اُس سے دل مین پاکیزگی آتی ہے،

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلون کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف، اور جمعِ مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروون کے دلون سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لئے جاتی رہے،

وَيْلٌ لِّكُلِّ .... الَّذِي جَمَعَ — پھٹکار ہو ہر اُس پر جو .... جس نے
مَالًا وَّعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ — دولت اکٹھی کی، اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے
أَخْلَدَهُ، (ھُمزہ ۔ ۱) — کہ اس کی یہ دولت اُس کو سدا رکھے گی،

ایک اور آیت مین مال کی محبت پر کافرون کو طعنہ دیا ہے،

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا، (الفجر۔ ۱) — اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو

یہی محبت، سچائی، اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر مین نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے اِنفاق (خدا کی راہ مین دینا) کے سلسلہ مین ان لفظون مین ادا کیا ہے،

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ — شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے، اور تمھین

بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ — بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے، اور خدا تم سے اپنی

فَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ، — طرف سے گناہون کی بخشایش اور فضل وکرم کا وعدہ کرتا

(بقرہ ۴-۳۷) — ہے، اور اللہ کشایش والا ہے، جانتا ہے،

قرآن کی اصطلاح مین دین ودنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھُل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اُس وقت تک کسی کو نہین ملتا جب تک اُس کے دل سے دنیا کے مال ودولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا،

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ — وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے، اور جسکو سمجھ

فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ (بقرہ ۴-۳۷) — (حکمت) دی گئی اُس کو بڑی دولت ملی،

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہوجائین گے، اس کا سراسر دھوکا ہے، اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل وکرم کا دروازہ کھلیگا، دُرست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے کہ مال ودولت کی محبت ایک آزمایش ہے، اس آزمایش مین پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لئے پہلی شرط جان ومال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤن اس بازی مین ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا، اور جس کے اُکھڑ گئے وہ نامراد رہا،

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ — تمھارا مال اور تمھاری اولاد تو جانچ ہے، اور اللہ کے

عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ — پاس بڑی مزدوری ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہوسکے

وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ — اور (اس کی باتون کو) سنو اور مانو، اور (راہ خدا مین)

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ — خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو، اور جو اپنی جان کی لالچ

الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا — سے بچایا گیا وہی کامیاب ہین، اگر اللہ کو قرض دو اچھا

يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ — قرض، تو وہ اس کو تمھارے لئے دونا کرے گا، اور تمھارے

حَلِیْمٌ۔ گناہ معاف فرمائیگا، اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے
(تغابن-۲) اور (برائی کا بدلہ لینے مین) بردبار ہے،

ان آیتون مین انفاق اور کار خیر مین دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قومون کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کامون مین لگائین اور افراد مین بانٹتی رہین یعنی جماعت کے کامون اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مد مین اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہین، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی، اور تمول کی برائیون سے لوگ بچے رہین گے، اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کامون کے کرنے سے ہچکچایا نہ کرینگے، اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے،

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہین،

۱- میری چیز ہے مین دوسرون کو کیون دون،

۲- دوسرون کو دونگا، تو میرے کمی ہو جائے گی جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی،

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونون وسوسون کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرون کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت مین میرا تیرا کسی کا نہین، وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے، اور اسی کی راہ مین دی جانی چاہئے،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (حدید-۱) اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے، اور آسمانون اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے،

بخل کی برائی مین کہا،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ اور نہ سمجھین وہ لوگ جو اس مین بخل کرتے ہین جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انھین دیا ہے کہ یہ ان کے حق مین بہتر

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (آل عمران - ۱۸۰)

بلکہ یہ اُن کے حق مین برا ہے، قیامت کے دن اُن کے گلے مین اس کا طوق ڈالا جائے گا، جسکا بخل کیا تھا، اور آسمانون کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے،

ذرا ذرا سے فرق سے قرآنِ پاک مین بیسیون جگہ یہ آیت ہے،

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ،

اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانون مین اور زمین مین ہے،

اسی طرح بیسیون مقام پر تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے،

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ،

آسمانون اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اسی کی ہے،

منافقون نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلعم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کرین، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہین، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائین، اللہ تعالیٰ نے منافقون کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی، اور ساتھ ہی منافقون کے اس زعمِ باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہو گا، تردید کی، فرمایا،

هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ، (منافقون)

وہی لوگ ہین جو کہتے ہین، کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہین اُن پر خرچ نہ کرو تاکہ[1] وہ چھوڑ کر الگ ہو جائین اور اللہ ہی کے ہین خزانے آسمانون کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہین ہین،

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغِ نبوی کی کل چل رہی ہے، اُن کے بل بوتے سے ہے، خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ مین جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہان سے جس کو چاہے جو چاہے دیدے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا،

لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَبْسُطُ

اسی کے پاس ہین آسمانون کی اور زمین کی کنجیان۔

[1] (یا) یہانتک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائین،

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ	پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لئے چاہے اور ناپ دیتا
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ، (شوریٰ - ۲)	ہے وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے،

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونون انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہین اگر ایک مین انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار، اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے مین انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبۂ صبر کی آزمایش ہے، فرمایا،

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ	سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک اس کو جانچے پھر اُ
فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَ	عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے
اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ	مالک نے مجھے عزت دی، اور جب اس کو جانچے تو
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۚ كَلَّا	اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے
(فجر)	مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہین،

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونون خدا کے کام ہین اور مصلحت سے ہین، دولتمند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی مین کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چارون طرف سمٹی آرہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لئے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہین، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظون مین کھینچکر اس کی غلطی بتائی ہے،

(حاشیہ: یہی مضمون دوسرے لفظون مین قصہ والی آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے، دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۲۰، مع قصص ۱۲)

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ؗ ثُمَّ	سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے تو ہم کو پکارے
اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ	پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دین
عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	تو کہے کہ یہ تو مجھے علم[1] پر ملا ہے، (خدا فرماتا ہے) بلکہ

[1] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا، دوسرا یہ ہے کہ دولت کے حصول کے طریقون کا مجھ کو ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص

لَا يَعْلَمُوْنَ، قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا، وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ، اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ، (زمر-۵)	تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہین سمجھتے، یہی بات انکے پہلون نے کہی تھی[1]، تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی اور جو کمایا تھا اس کی برائیان اُن پر پڑین، اور جو ان مین سے گنہگار ہین، اُن پر بھی ان کی کمائی کی برائیان پڑنے والی ہین، وہ تھکا نہین سکتے، کیا اُن کو یہ خبر نہین کہ اللہ ہی روزی جس کے لئے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے، اور (جسکو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس مین ایمان والون کے لئے البتہ نشانیان ہین،

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اُس کے لئے آسان ہوجائے، اسلام نے انسانون کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ، (هود-۱)	کوئی چلنے والا نہین زمین مین، مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ جانتا ہے جہان اُس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہان اس کو سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الٰہی کی) کھلی کتاب مین موجود ہے،

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی مین سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے، وہ تقدیر مین اُسی کا حصہ تھا، اس لئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہین، اسلام نے اپنے پیروون کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لئے اُن یقینیات کو مسلمانون کے ریشہ ریشہ مین رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، خدا تعالیٰ جو

[1] چنانچہ قارون کو جب راہِ خدا مین خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی، تو اس نے بھی یہی کہا تھا،

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ، (قصص-۸) — قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے،

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ — اور تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے،

مَّعَ اللّٰهِ ؕ (نمل - ۵) — اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے،

روزی دینا اُسی کا کام ہے،

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ — بے شبہہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے،

(ذاریت - ۳) — زور آور، مضبوط،

احادیث میں رسول اللہ صلعم نے طرح طرح کے پُر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم باندھو نہیں ورنہ تم پر باندھا جائیگا[1]" یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منھ بند کروگے اور دوسرون کو نہ دوگے، تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منھ تم سے بند کرے گا، اور تم کو نہیں دیگا، ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا تم مین سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگون نے کہا ہم مین کوئی ایسا نہیں جسکو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہے" فرمایا تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اُس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اُس کے وارث کا مال[2] ہے" ایک دفعہ آپ نے قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت مین ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال؛ اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا، یا کھا لیا تو اُس کو فنا کر چکا، اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا[3]،

فرمایا "اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ برابر سونا ہو، اور تیسرے دن تک اُس مین سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہجائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑون مین کہونگا کہ اس کو خدا کے بندون مین ایسے ایسے داہنے بائین پیچھے بانٹ دو" پھر فرمایا "ہان جن کے پاس یہان زیادہ ہے، اُنھین کے پاس وہان قیامت مین کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائین پیچھے بانٹ دو[4]"

---

[1] صحیح مسلم ۲ باب الحث علی الانفاق، [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ماقدم من ماله فهوله، [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزهادة فی الدنیا حدیث حسن صحیح، [4] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم ما احب ان لی مثل احد ذهبا،

فرمایا رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔[1]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی،

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے، اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی ملکر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع ملجائے تو اسکو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بےبسی کا نظارہ کس پُراثر انداز میں کھینچا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ (منافقون-۲)	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا،

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا،

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (منافقون-۲)	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آجائے، اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو،

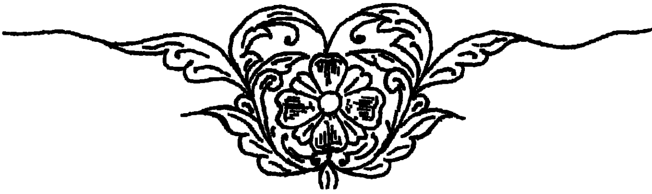
اس لئے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہئے، ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم،

بڑا ہے، فرمایا "یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو، اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمھارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا[1]"

فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لئے بہتر، اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لئے برا ہے[2]"



[1] صحیح مسلم ا ص۳۳۱ مصر باب بیان فضل الصدقہ، [2] ایضاً باب الید العلیا،

عفّت و پاکبازی

عفت و پاکبازی اُن ساری اخلاقی خوبیون کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لئے اسلام نے اُس کو اُن اخلاقی محاسن مین گنایا ہے، جو مسلمانون کے چہرہ کا نور ہین، چنانچہ سورۂ مومنون مین مسلمانون کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہین، اُن مین اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہون کی پاسبانی کرتے
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ	ہین، مگر اپنی بیبیون یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیون)
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ	سے، تو اُن پر کچھ الزام نہین لیکن جو اس کے علاوہ کے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ، (مومنون-۱)	طلبگار ہون، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہین،

سورۂ معارج مین مسلمانون کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، اُن مین ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ، (معارج-۱)	اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہین،

جن مسلمانون کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، اُن مین وہ بھی ہین، جو عفیف اور پاکدامن ہین،

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ، (احزاب-۵)	اور اپنی شرمگاہون کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی بیبیان

ان دونون آیتون سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظِ فروج" ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہین، اور فروج اپنے معنی مین ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہین جو شرم کے قابل لفظون سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم مین بالکل ہی بے پردہ ہوگئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزون کے درمیان خلا کے ہین، اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہین جدھر سے دشمنون کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانون کے اعضا مین سے اُس خلا کا نام ہے جو اُن کے دونون پاؤن کے بیچ مین ہے، اور جدھر سے دشمنون کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو، اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظون کے اندر پوست ہے، وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے،

عفت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ اِحصان ہے، جو حِصن سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہین، اس سے حِصانٌ، اِحصانٌ، مُحصِنٌ اور مُحصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہین، پہلا لفظ قرآن مین نہین آیا، مگر عرب کے اشعار مین آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہین، دوسرے کے معنی حفاظت مین لینے، یا حفاظت مین رکھنے کے ہین، یہ قرآن مین تین موقعون پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان مین، ماضی معروف کے صیغہ مین،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا، (تحریم - ۲)	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا، (انبیاء - ۶)	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس مین اپنی روح پھونکی،

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ شوہر نے اُس کو اپنے نکاح مین لاکر اپنی حفاظت مین لے لیا، لونڈیون کے بیان مین ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح مین آکر بدکاری کرین تو اُن کی سزا کیا ہے، فرمایا،

فَاِذَآ اُحْصِنَّ، (نساء - ۴) تو جب وہ نکاح کی قید مین آچکین،

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت مین لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَۃٌ (حفاظت مین لائی گئی)

نکاح کے سلسلہ مین قرآن مین آیا ہے،

مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ط (نساء - ۴) حفاظت مین لانے والے نہ مستی نکالنے والے،

مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ ط (" ") حفاظت مین آنے والیان نہ مستی نکالنے والیان،

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید مین لایا جائے، صرف حیوانی خواہش کا

دفع کرنا نکاح کا مقصد نہین، اسی لئے قرآنِ پاک مین اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت مین رکھی ہوئی بی بیان)

دو معنون مین آیا ہے، ایک بیاہی عورتون کے معنی مین، جیسے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، (نساء - ۴) اور بیاہی عورتین، (یعنی جو عورتین کسی کے نکاح مین ہین

وہ دوسرے مرد پر حرام ہین)

دوسرے شریف آزاد بی بیون کے معنی مین جیسے،

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ، (نساء - ۴) اور جس کو تم مین سے مسلمان شریف وآزاد بیویون کے نکاح کا مقدور نہ ہو، (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتون کی عصمت کے بیان مین قرآنِ پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے،

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ، (نساء - ۶) پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیان،

یعنی اپنے شوہرون کی غیر حاضری مین اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کرتی ہین،

اسلام مین عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت ورسالت کا لازمی جزء ہے، نبی، نبی کے سلسلۂ

نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰؑ کی مان حضرت مریمؑ کی نسبت

یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی اور انکی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی، اور دو موقعون

پر اس شہادت کی تصریح کی،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم) — اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا — اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے

(انبیاء-۶) — اُس مین اپنی رُوح پھونکی،

حضرت یوسفؑ نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی،

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ (یوسف-۴) — اور مین نے اُس کو اوس سے چاہا تو وہ بچا رہا،

خدا نے فرمایا مین نے ایسا اس لئے کیا،

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ — تاکہ ہم اُس سے برائی اور بے حیائی کو دور کرین، وہ بے شبہہ

عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ (یوسف-۳) — ہمارے چنے بندون مین تھا،

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتون سے پاک رکھے جاتے ہین'

حضرت یحییٰؑ کی تعریف مین فرمایا گیا،

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ — اور سردار ہوگا، اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا'

(آل عمران-۴) — اور نبی ہوگا صالحون مین سے،

اسلام مین اہل بیتِ نبویؐ کی زندگی جس عفت عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی غیب کے دانائے راز نے

اس کی گواہی ان لفظون مین دی،

اُولٰۤىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ — یہ لوگ تہمت سے پاک ہین، اُن کے لئے بخشائش ہے

مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (نور-۳) — اور عزت والی روزی،

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان مین فَاحِشَةٌ[1] آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہین جیسے

[1] اسکا یہ منشا نہین ہو کہ قرآن مین ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی مین آیا ہے، بلکہ وہ لغت کے رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے،

اِلَّآ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (نساء-۳) مگر یہ کہ وہ عورتین کھلی برائی کرین،

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ (نساء-۳) اور تمھاری عورتون مین سے جو کھلی برائی کرین،

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت مین مسلمانون کو اس برائی سے روکا گیا ہے،

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیۡلًا، (بنی اسرائیل-۴) اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بیشک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے،

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہین فرمایا کہ تم زنا نہ کرنا، بلکہ یہ کہا کہ تم زنا کے قریب نہ جانا، اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گذرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جسطرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کامون سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظرون سے یا بیحیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی مین ملنا جلنا بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے،

اسی لئے اسلام نے اُن ساری باتون کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہین حرام قرار دیا مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردون اور مسلمان عورتون دونون کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہون تو اپنی نظرین نیچی رکھین،

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ وَیَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَہُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَزۡکٰی لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ۝ (نور-۴) اے پیغمبر ایمان والون سے کہدے کہ وہ ذرا اپنی آنکھین نیچی رکھین، اور اپنے ستر کی حفاظت کرین، یہ ان کے لئے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہین،

عورتون کی ذرا سی بیباکی بھی مردون کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لئے اُن پر شرافت کی چند پابندیان عائد کی گئین، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہین نیچی رکھین، غیرون کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائین، اپنے

زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لئے زمین پر ہوئے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارے کنارے چلیں مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں۔ فرمایا،

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ	اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے کہدے کہ اپنی
وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ	آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت
إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ	کریں، اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو
عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا	طبعًا کھلا رہتا ہے[1]، اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں
لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ، الآية	(یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں، اور اپنا سنگار نہ
وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ	کھولیں مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر کے
مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا	باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے
أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ،	بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں
	یا اپنے غلاموں یا اپنے اُن مرد نوکروں کے آگے
(نور - ۴)	جن کو غرض نہیں یا اُن لڑکوں کے آگے جو عورتوں
	کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں، اور نہ مسلمان
	عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار
	کو وہ چھپاتی ہیں اسکا پتہ لگ جائے اور تم سب

ایمان والو خدا کے آگے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ،

[1] جیسے انگوٹھی کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی، یا انگلیوں کی انگوٹھی اسی لئے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں، یعنی بیبیاں اُن کا اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہو (روح المعانی) ۱۲

اور حسب ذیل ادب اگو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لئے اس میں پیروی کا نمونہ ہے

يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ	اے پیغمبر کی بیویو، تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت،

اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ	اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مردسے) بات نہ کرو
فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَقَرْنَ	کہ جس کے دل مین روگ ہو، وہ خواہش کرے[1] اور نیک
فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ	بات کہو، اور اپنے گھرون مین وقار سے رہو، اور جیسے
الْاُوْلٰی،	نادانی کے پہلے زمانہ مین دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار
(احزاب-۴)	کرکے دکھاتی نہ پھرو،[2]

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ	اے ایمان والو! نبی کے گھرون مین اس کے بدون کہ تم کو
النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ الآیۃ، (احزاب-۷)	اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہ ہو،

گو یہ حکم یہان خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی صلعم کے گھرون کے ساتھ خاص نہین، چنانچہ عفت و پاکدامنی کے سلسلہ مین سورۂ نور مین اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھرون کی نسبت بھی ہے،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ	اے ایمان والو! تم اپنے گھرون کے سوا دوسرے گھرون
بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا	مین نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کرلو، اور اُن گھر والون کو
ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ، (نور-۴)	سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمھارے حق مین، شاید تم یاد رکھو،

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہین کہ دھڑدھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانۂ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے،

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ	اور جب تم مانگنے جاؤ اُن بیویون سے کچھ چیز کام کی تو
وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ	مانگ لو پردہ کے اوٹ سے، اس مین تمھارے اور
وَقُلُوْبِھِنَّ، (احزاب-۷)	اُن کے دلون کی بڑی ستھرائی ہے،

---

[1] یعنی تم سے جراءت کرکے تمھارا خواہان ہو، [2] التبرج اظہار الزینۃ للناس الاجانب، (لسان العرب)

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے، مگر اس مین عام مسلمان گھرون کے لیے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتین جب گھر سے باہر نکلین تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لین، تاکہ اُن کی زیبایش و آرایش کا ہر نقش راہ چلتون کی آنکھون سے اوجھل رہے، اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیان ہین، ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا،

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ	اے نبی! اپنی بیویون، اور اپنی بیٹیون اور مسلمانون کی
نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ	عورتون سے کہدے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادرین
جَلَابِيْبِهِنَّ ۚ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يُّعْرَفْنَ	نیچی لٹکالین، اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑینگی (کہ یہ
فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○	شریف ہین) تو اُن کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا
لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ	مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق، اور جن کے دلون
مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ	مین (بے حیائی کا) روگ ہے، اور مدینہ مین جھوٹ
بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ إِلَّا قَلِيْلًا ،	اُڑانے والے نہ رُکے، تو ہم تجھے ان پر بھڑکا ئین گے
	پھر وہ نہ رہنے پائین گے اس شہر مین تیرے ساتھ مگر
(احزاب-۸)	تھوڑے دن،

ان آیتون مین اشارہ مدینہ کے بعض شریرون اور منافقون کی طرف ہے جو مسلمان بی بیون کو جو خاص خاص ضرورتون کے لیے اپنے گھرون سے نکلتی تھین چھیڑتے تھے، اور جب انھین اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالی نے دونون کو دو حکم دیئے، شریرون کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئین تو انھین کافی سزا دیجائے، بلکہ اُن کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے، اور مسلمان بی بیون کے لئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھرون سے باہر نکلین تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف

معلوم ہون، اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتون سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھین، اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگین تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لین جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور، اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائین، اور دیکھنے والون کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانون کی بی بیان ہین جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے،

عرب مین اسلام سے پہلے لونڈیون سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1]، اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہین سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیون کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، اگرا سکے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ مین وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا، کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتین بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھین، سینون کی پوشش کا لحاظ نہین کرتی تھین، بدکار عورتین شراب کی محفل مین ساقی گری کرتی تھین اور گریبان کھلا رکھتی تھین کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[2]، اور نشان کے لئے اپنے گھرون پر جھنڈیان لگاتی تھین، اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری،

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ	اور تمھاری لونڈیان اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہین
إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ	تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی
الدُّنْيَا وَمَن يُكْرِههُّنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِن	بدکاری نہ کرایا کرو، اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا
بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ، (نور-۴)	تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیون مین سے قرار دیا ہے[3]، اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہین سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتون کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح مین لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی سا

[3] صحیح مسلم باب تحریم مہر البغی وغیرہ

---

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورۂ نور ص ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر، [2] سبعہ معلقہ مین طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھئے،

رحیب قطاب الجیب منها رفیقة　　بجس الندامی بضّة المتجرّد

آب وہوا زہر آلود ہو جاتی سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) مین ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ صلعم سے اس کی اجازت چاہی، وحیِ الٰہی نے انکی اس درخواست کا یہ جواب دیا،

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ — بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کریگا

لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ — اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کریگا

عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ، (نور-۱) — ایمان والون پر یہ حرام ٹھرایا گیا ہے،

اس آیت مین انسانی فطرت کی تصویر ہے، کہ بدکار عورتون کو اپنے قبضہ مین لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردون کے دل مین آسکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا.

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ — گندی عورتین، گندے مردون کے لئے ہوتی ہین، اور

وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ — گندے مرد گندی عورتون کے لئے، اور پاک عورتین

(نور-۳) — پاک مردون کے لئے، اور پاک مرد پاک عورتون کے لئے

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت مین پسندیدہ نہین بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے[1] جائز نہین، اور اُن کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اُس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہ کہتے ہین کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے[2]،

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے، اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسون سے نکاح کرین، یا انکحوا الایامٰی منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے، بلکہ اگر زن وشو مین سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ مین یہی فیصلہ کیا، ابوداؤد کی حدیث سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن وشو مین کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہین ہو سکتا، اس لئے یہ نکاح فریقین مین سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہین رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے، (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی وتفسیرات احمدیہ ملا جیون وتفسیر کبیر رازی وروح المعانی تفسیر آیت مذکورہ)

[2] ابوداؤد کتاب النکاح،

غرض اہلِ ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے، اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہئے، چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا،

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ	اور جو خدا برحق کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے،
وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ	اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے خون نہیں
وَلَا يَزْنُونَ، (فرقان-۶)	بہاتے، اور بدکاری نہیں کرتے،

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اُس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے، قرآنِ پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں اُن کی مزید تشریح رسول اللہ صلعم نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے،

چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں[1]، حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں[2]، حکم دیا کہ مخنث زنانخانوں میں نہ جانے پائیں[3]، فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو، کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو[4]، فرمایا کہ عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے[5]، سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے[6] تاکہ مردوں

[6] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق،

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرۃ الفجاءۃ، [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأۃ من زینتھا، [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین، [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت، [5] ابوداؤد کتاب الترجل باب فی المرأۃ تطیب للخروج،

کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اُس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے[1]
کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کیگئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں
یا اُن پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا، تو اُس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے[2]،

یہ ساری ہدایتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو،
لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ اُن کے لئے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں،
شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے،

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا	بدکاری کرنے والی عورت، اور بدکاری کرنے والے مرد
مِائَةَ جَلْدَةٍ، (نور-۱)	ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ،

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بدکاری میں پکڑ آئیں اُن کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے،
اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لئے قرآنِ پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے

بیوی والا شوہر والی بیوی

جن باتوں پر بیعت لیجائے، اُن میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرینگی، فرمایا،

وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا	اور وہ بدکاری نہ کریں گی، اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کرینگی
يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ	اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر
وَاَرْجُلِهِنَّ، (ممتحنہ-۲)	لایا کریں گی،

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی
حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو، یا یہ بات[3]
بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو، اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج
کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ اُن میں سے

[1] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیہا، [2] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت، [3] مفسرین میں بھی حسب بیان روح المعانی کا
ادھر خیال گذرا ہے،

کس کا لڑکا ہے، بعض عورتین دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہرون کے سر تھوپتی تھین، یہ ساری باتین عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھین، اس لئے ان سے باز رکھا گیا، اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہین، فتحِ مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویون سے[1]، اور مدینہ مین انصاری خاتونون سے بھی اس پر عہد لیا[2]، بلکہ مسلمان مردون سے ان باتون کا عہد لیا گیا، اور صحابہ نے آنحضرت صلعم سے ان پر بیعت کی[3]،

دوسری طرف عورتون کو مردون کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت مین چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر پیش نہ کر سکے تو اسکو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم مین اسی کوڑے مارے جائین گے، اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی، اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہون تو مرد قسم کھائے، اور نہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے، اور اگر دونون اپنے دعوون پر قائم رہین، تو اسلام مین دستور یہ ہے کہ اپنے دعوی کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا[4]،

اسلام کی نظر مین حقوق اللہ مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے، اور حقوقِ عباد مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے، اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکبازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا، بولے اسکے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائیگا، بولے اس کے بعد فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالی نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی[5]،

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکارین
وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا	اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ مارین کہ اس کو

[1] صحیح بخاری فتح مکہ، [2] تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ، [3] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان، [4] اس کی تفصیل سورۂ نور مین ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہین، مگر شرع سے عمدا آمادہ سی پرہے، بخاری باب اللعان، [5] بخاری کتاب الادب باب قتل اولد خشیۃ ان یاکل معہ،

بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ، (فرقان-۶۰) خدانے حرام کر رکھا ہے، اور نہ زنا کے مرتکب ہون،

حدیث مین اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دونون جرم اپنی نوعیت مین بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہین کہ جن سے یہ امید نہین ہوسکتی اُن سے یہ فعل ظہور مین آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا،

ایک حدیث مین ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے، اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھون کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہین رہتا"[1] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھکر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہین کرتا، اس حالت مین ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی مین گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور پھر جب اس کا نشہ اُتر ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے،

اسلام مین زانیون کی سزا بعض حالتون مین سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتون مین سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت مین جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب مین رسول اللہ صلعم کو بہت سے لوگون کے اُخروی عذاب کی دردناک صورتین دکھائی گئین، اُن مین بدکارون کے عذاب کی صورت اُن کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اُس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس مین بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتین تھین جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے اندر سے نکل آئین گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے[2] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہیگا،

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگون کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز مین بیان کئے گئے ہین، ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا خداوند تعالیٰ سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لے گا جن مین ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہکر

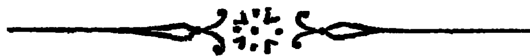
[1] بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شرب الخمر،
[2] بخاری کتاب التعبیر،

انکار کر دیا کہ مین خدا سے ڈرتا ہون[1]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازون کو آخرت مین حاصل ہوگا، لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتین بھی کچھ کم نہین، ایک حدیث مین آپ نے زمانۂ قدیم کے تین آدمیون کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعۃً پانی برسنے لگا، تینون نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار مین پناہ لی، سو ر اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منھ بند ہوگیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے خدا سے دعا کرین، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان مین پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی،

خداوندا میرے ایک چچازاد بہن تھی جس سے مین بڑی محبت رکھتا تھا مین نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک مین اس کو سو دینار نہ دیدون وہ راضی نہ ہوئی، مین نے سو دینار کما کر جمع کئے، اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ خدا سے ڈرو، مین فوراً رک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ مین نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا دے، چنانچہ وہ سرک گیا[2]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو اُن اعمال مین شمار کرتی ہے، جن سے خدا کا قرب ملتا، اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے،



[1] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش، [2] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ،

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملون مین جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار مین ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اُس کو پوری دیانت سے رتی رتی دیدے اسی کو عربی مین امانت کہتے ہین، اللہ تعالی نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اُس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ہم نے (اپنی) امانت آسمانون پر اور زمین پر اور پہاڑون
وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	پر پیش کی تو انھون نے اُس کے اٹھانے سے انکار کیا
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا،	اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بیشبہہ
(احزاب - ۹)	ظالم اور نادان ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانون کے سپرد ہوئی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کرین، اگر ہم ایسا نہ کرین تو خائن ٹھہرینگے،

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اُس کے خاص بندون پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندون کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لئے قرآن مین اُس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ، (شعراء - ۱۱) اس پیغام کو لیکر امانت والی روح اتری،

مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ، (تکویر - ۱) اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہان امانت والا ہے،

اکثر پیغمبرون کی صفت مین بھی یہ لفظ قرآن مین آیا ہے کہ انھون نے اپنی اپنی اُمّت سے یہ کہا،

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ، (شعراء - ۱۰) مین تمھارے لئے امانت دار قاصد ہون،

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہون، اس مین اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہین ہے،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والون کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا، کیونکہ آپ اپنے

کاروبار مین، دیانتدار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جون کا تون اُن کو واپس کرتے تھے،

نیک عمل مسلمانون کی صفت یہ بتائی گئی،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، (مؤمنون - ۱) اور جو اپنی امانتون اور وعدہ کا پاس رکھتے ہین،

بعض روایتون مین ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتحِ مکہ کے وقت وہ

اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتون کو اُن کے

اَهْلِهَا، (نساء - ۸) مالکون کے حوالہ کر دیا کرو،

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی، انھون نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم

دیا ہے، وہ اُس وقت تک مسلمان نہین ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا اُن پر یہ اثر

ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے[1]، بہر حال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے، اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر

اُس کا اطلاق یکسان ہوگا، اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت مین وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے

جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی ہے[2]، اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکمون کو

اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[3]، اور وہ تمام امانتین بھی اس مین داخل ہین جن کو اُن کے مالکون کے سپرد

[1] تفسیر کشاف زمخشری، [2] ایضاً، [3] تفسیر ابن جریر طبری،

کرنا ضروری ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپیے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہین جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہین، بلکہ ہر مالی قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپکے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یون بھی اس کو جون کا تون دیدینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اُس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس مین آپ ہون، اور کچھ باتین آپ دوسرون کے متعلق وہان سُن لین تو اُن کو اُسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسرون تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنے کسی نجی کے کام مین مشورہ مانگا تو اس کو سنکر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اُس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری محسوس کرکے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے، اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرالیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے

قرآنِ پاک اور حدیثون مین ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے،

اُن مسلمانون مین جنکو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہین،

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَٰنَٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ۝ (مومنون-۱)	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہین،

پھر جن مسلمانون کو جنت مین عزت کی جگہ دی جانے والی ہے اُن مین بھی وہ داخل ہین،

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَٰنَٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ۝ (معارج-۱)	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہین،

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر مین گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی،

فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۝ (بقرہ ۴ - ۳۹)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے،

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرّف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے،

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (انفال - ۳)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو،

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی، اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی، اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے،

يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ (قصص - ۳)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو،

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو، اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے، اور اس کو پوری دیانتداری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چپکے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے،

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے، اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کے رو سے

وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہین،

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ صلعم کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ مین نے آنحضرت صلعم سے دو باتین سنی تھین ایک کو تو آنکھون سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپنے فرمایا کہ امانتداری لوگون کے دلون کی جڑ مین اتری ہے، (یعنی نکی فطرت ہوتی ہے) پھر انھون نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا، (یعنی فطری امانت کے جوہر مین کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ پھر آپنے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا، اور امانت اُس کے دل سے نکال لیجائے گی، اور اُس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائیگا، اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی، اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اُٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہین ہوتا، لوگ ایسے ہو جائینگے کہ لین دین کرینگے لیکن کوئی امانتداری نہین کرے گا، اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کیاب ہو جائے گی، کہ لوگ مثال کے طور پر کہین گے کہ فلان قوم مین ایک امانتدار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل مین رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی"[1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے مین انسانون مین ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے آخر زمانہ مین وہ ایسا ہی رہ جائیگا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے،

طبرانی کبیر مین ہے کہ آپنے فرمایا جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس مین دین نہین، اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ مین محمدؐ کی جان ہے، کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا، . . . . . . اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس مین سے خرچ کرے گا تو اس کو اس مین برکت نہین دیجائے گی، اور اگر اس مین سے خیرات

---

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ و کتاب الفتن والرقاق و صحیح مسلم و مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ،

کرے گا تو قبول نہین ہوگی، اور جو اس مین سے بچ رہے گا وہ اُس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا بری چیز بری چیز کا کفارہ نہین بن سکتی ہو، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے[1]

حدیث کی کئی کتابون مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین"[2]۔ اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے،

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اُس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کیجاتی ہے[3]، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ مجلس مین جو باتین ہون وہ امانت ہین یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے، الایہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت صلعم نے فرمایا المجالس بالامانة یعنی نشستین امانت کیساتھ ہون، مگر تین موقعون پر کہین کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبروریزی کی یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو، تو متعلقہ لوگون کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے[4]،

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہو، بلکہ میان بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتین ہوتی ہین، وہ بھی ایسے راز ہین جنکا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے[5]، راز کے یہی معنی نہین ہین کہ جسکو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہین چاہتا، آنحضرت صلعم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے[6]، امانت مین خیانت کرنا آنحضرت صلعم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے[7]،

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطون کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لے کر اس کے حقوق ادا کرنے مین کمی کرتا ہے، یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص۱۵۷ حیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعود [2] کنز العمال ج ۲ ص۱۵۷ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان [3] ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن، [4] ابوداؤد باب فی نقل الحدیث، [5] ابوداؤد کتاب الادب، [6] ایضاً، [7] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق

کردیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت مین خیانت کرتا ہے حضور صلعم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ عورتون کے باب مین خدا سے ڈرو، فرمایا کیونکہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت مین لیا ہے[1]

قیامت کی نشانیون مین آیا ہے کہ سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہیگا، اور سب سے آخر مین جو چیز رہجائے گی وہ نماز ہوگی، اور کتنے نمازی ہین جن کی نمازون کا کوئی حصہ خدا کے ہان نہین[2] فرمایا میری امت اسوقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہین سمجھے گی[3] یعنی جو امانت سپرد کیجائے گی اس کو آمدنی اور کارخیر مین دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہین سمجھین گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی،



[1] صحیح مسلم، حجۃ الوداع، [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۱ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس،

[3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۱ از سنن سعید بن منصور،

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اُس کی بہت سی اخلاقی خوبیون کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والون کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس مین ایک دوسرے کیساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے، اور بہت سے گناہون سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے، اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہان وہی ہونگے، جو اسکی ذات اقدس کے لائق ہین، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندون کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن اُن کو پکڑتا نہین، اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہین لوٹاتا، حدیث مین آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونون ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اُس کو نامراد لوٹاتے ہوئے[1] شرماتا ہے" ایک دفعہ تین صاحب مجلس نبوی مین آئے، آپ کے اردگرد صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہان ذرا سی جگہ ملی اس مین بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ نے فرمایا کہ مین ان صاحبون کی خبر نہ دون؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ مین آکر بیٹھا، وہ خدا کی پناہ مین آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی، اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اس نے خدا سے منھ پھیرا[2]، تو خدا نے بھی اس سے منھ پھیرا،

سورۂ بقرہ مین ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا۔ — خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہین

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء والصفات الہ آباد ص ۳۱، [2] بخاری کتاب العلم و صحیح مسلم باب السلام،

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے مین وہ شرماتا نہین، جیسا کہ قرآن مین دوسری جگہ ہے، وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیِ مِنَ الْحَقِّ، (احزاب) "خدا حق بات کہنے سے نہین شرماتا"، حدیث مین بھی ہے، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ، "اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہین"۔ قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو اُسکی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث مین آتا ہے کہ "خدا سب سے زیادہ غیرتمند ہے اور اسی لئے اس نے بدکاریون کو حرام کیا ہے[1]"

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر مین جن دو لڑکیون سے سابقہ پڑا تھا وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھین تاہم یہ وصف اُن مین ایسا نمایان تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیون کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیون کو پانی نہین پلاتی تھین، تاکہ مردون کی کشمکش سے الگ رہین، اور جب ان کے باپ نے ان مین سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لئے بھیجا

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ، (قصص ۳) تو ان دو لڑکیون مین سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی،

اس آیت مین واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستایش بھی مقصود ہے،

یہ وصف انسان مین بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے، اور اگر اس کی مناسب تربیت کیجائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے، اور اچھے لوگون کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اسلئے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، سترِ عورت کا خیال، نگاہین نیچی رکھنا، بیحیائی کی باتون کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہانتک کہ غسل خانہ اور خلوت مین بھی اس کی اجازت نہ دینا، اسی لئے ہے کہ آنکھین شرم کے منظر سے جھینپتی رہین، اگر تھوڑی تھوڑی بیحیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی، تو رفتہ رفتہ انسان پکا بیحیا بنجائیگا،

[1] بخاری کتاب الادب باب مالایستحی من الحق ۔ [2] مسلم کتاب التوبہ عربی مین غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے، مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب ہو جاتے ہین غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے مین جو محبت مین شرکت کو نہین چاہتی،

آنحضرت صلعم جب بچہ تھے تو خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹین اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپکے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپنے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہو گئی، ہوش مین آیا تو زبانِ مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا[1]، نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا[2]	رسول اللہ صلعم پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے،

بعض موقعون پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہین کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب مین مذکور ہے،

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ (احزاب ۔ ۷)	تمھاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا،

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس مین بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہین کر سکتا، بلکہ بعض حالتون مین اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لئے حیا کی حقیقت مین بزدلی کا جو جزء شامل ہے، شریعتِ مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ امرِ حق کے اظہار مین شرم و حیا دامنگیر نہ ہو، لیکن دوسرون کی مروّت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی مین تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانہ مین ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ صلعم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے[3]،

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزء ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ و بنیانہا، [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء، [3] ایضًا

سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزون سے روکتی ہے، اس لئے وہ دونون ایک ہی ہین لیکن جن لوگون مین فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے، اُن کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے مین مدد ملتی ہے، اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہین بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہانتک اظہارِ حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے، اور شریعت نے اِن موقعون پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآنِ مجید مین جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتون کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندون کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہین شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہین چھوڑ دیتا، فرمایا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے مین (ذرا بھی) نہین
مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَہَا ، (بقرہ ۳-۳)	جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھکر
	(کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ مین صحابۂ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتین کرتے رہے، جس سے رسول اللہ صلعم کو تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن فطری حیا رکی بنا پر اس کا اظہار نہین کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگون کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمھارا لحاظ
مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ،	کرتے تھے، اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) مین (کسی کا
(احزاب-۷)	کچھ) لحاظ کرتا نہین،

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگون کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ صلعم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا اس لئے

خداوند تعالیٰ نے لوگون کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے مین شرم وحیا کا موقع نہین،

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابۂ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہین اور یہ سمجھتی ہین کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم وحیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہدیتی ہین کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہین شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزان نہین آتی، اکابر صحابہ اس درخت کے نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے اس لئے شرم سے چپ رہے لیکن چونکہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس مین آزادی کی ضرورت تھی، اس لیے جب حضرت عمرؓ سے انھون نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی[1]

انصاریہ عورتین رسول اللہ صلعم سے عورتون کے مسئلے پوچھتی تھین، اور یہ اُن کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہین،

نِعمَ النِّسَاءُ نساء الانصار لم یکن یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فِی الدین[2]،	انصار کی عورتین کس قدر اچھی تھین کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہین روکتی تھی،

ان موقعون یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا، انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا،

[1] بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین، [2] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم،

الحیاء لایاتی الا بخیر[1]   حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے،

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے مین باک نہین ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہین ہے، بلکہ بیحیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبۂ حیا ہے جو انسان کو برائیون سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے' کوئی روک نہین سکتا، اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ   لوگون نے پرانے پیغمبرون کی جو باتین پائی ہین ان مین

الاولی اذا لم تستحی فاصنع ما شئت[2]   ایک یہ ہے کہ اگر تم مین شرم وحیا نہین تو جو چاہو کرو،

امام نووی[3] نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے، کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہین کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو،

قرآن وحدیث مین جہان جہان فحش، منکر، اور سوء، وغیرہ کے لفظ آئے ہیں انسے بیحیائی کے یہی سب کام مراد ہین، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کیساتھ ان تمام کامون سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث شریف مین آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے[4]، یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخین ہین، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[5] فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہان تک کہ تنہائی کی حالت مین بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہین چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیونکہ تمھارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہین جو صرف بول براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہین تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو،[6] مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھون سے گرنے نہ پائے،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء [2] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت [3] فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۲۳ [4] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ما جاء فی الحیاء [5] صحیح بخاری کتاب الایمان [6] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ما جاء فی الاستتار عند الجماع،

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق مین سے ہے، دنیا مین ہم ایک دوسرے کیساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہین، ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ مین رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئیگا، جس کے دل مین اس جذبہ کا کوئی ذرّہ نہ ہوگا، اس سے دوسرون کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم مین اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص نامون مین سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی "بڑا رحم والا" ہے اسی کے ساتھ دوسرا نام "رحیم" آتا ہے، یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک مین پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا مین جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلوون کے سوا کچھ اور نہین ہے، خدا کے فرشتے اپنی دعاؤن مین کہتے ہین،

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا، (مومن-۱)	اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم مین ہر چیز کو سما لیا ہے،

اس رحمت الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، (حشر-۳)	وہی رحم والا مہربان ہے،

مسلمانون کو بتایا گیا ہے، کہ وہ دعاؤن مین کہین،

وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ، (مومنون - ۶) | اور تو سب رحم کرنے والون مین سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے

دنیا مین رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہین وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہین چنانچہ حدیث مین ہے کہ خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے جنمین سے ننانوے ۹۹ ٹکڑے اپنے پاس رکھ لئے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا، اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہین، یہانتک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پانون نہین رکھتا کہ کہین اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔[1]

بنی نوعِ انسان مین محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبرون کی ذات ہے، اور پیغمبرون مین سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ صلعم کی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کیساتھ متصف کیا ہے،

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ، (توبہ - ۱۶) | (لوگو) تمھارے پاس تمھین مین کے ایک رسول آئے ہین، تمھاری تکلیف ان پر شاق گذرتی ہے، (اور) اُن کو تمھاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانون پر بہت شفیق (اور) رحیم ہین،

پیغمبرون کے بعد اگلے پیغمبرون کی امتین ہین، اور ان امتون مین سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے،

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ، (حدید ۴) | اور جو لوگ اُن کے پیرو ہوئے اُن کے دلون مین ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا،

اور اس وصف مین امتِ محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے،

وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ، (فتح - ۴) | اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہین وہ کافرون پر زور آور ہین، آپس مین رحمدل ہین،

آپس کے تعلقات مین ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہین کیونکہ قرابتیان

[1] بخاری کتاب الادب،

کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہین، اور رحم رُحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہین، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا مین پیدا ہوا ہے، حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا،

الرحم شجنة من الرحمٰن[1]، رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے،

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے اور ساری رحمدلیون کے جذبے اسکی شاخین ہین، بچون کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہین کہ رسول اللہ صلعم ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؑ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونون زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونون پر رحم کر کیونکہ مین ان دونون پر رحم کرتا ہون[2]،

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لیکر رسول اللہ صلعم کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپنے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ "تم اس پر رحم کرتے ہو؟" اس نے کہا "ہان" ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، اور وہ سب رحم کرنے والون سے زیادہ رحم کرنے والا ہے[3]،

ایک بار رسول اللہ صلعم نے حضرت حسن علیہ السلام کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہین، مین نے ان مین سے کسی کا بوسہ نہین لیا، آپنے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "جو شخص رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا"[4]

ایک اور بدو نے آپسے کہا کہ آپ لوگ بچون کو چومتے ہین، لیکن ہم لوگ نہین چومتے، ارشاد ہوا کہ "خدا نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے"[5]

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹون پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اسلئے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹون پر رحم نہین کرتا وہ ہم سے نہین ہے[6]، اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹون اور زیردستون پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹون تک نہین، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹون تک وسیع ہے،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ [2] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ [3] ادب المفرد باب رحمۃ العیال [4] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ [5] ایضاً [6] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان،

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے،

اسی لئے قرآن مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے، "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" یعنی وہ لوگ آپس مین رحمدل ہین
اور حدیث مین اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال مین بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانون کی باہمی رحمدلی باہمی دوستی
اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دُکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[1] جس کے
معنی یہ ہین کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانون کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک
جسم ہو گئے ہین، اور انفرادی طور پر مسلمانون کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہین، اس لئے جس طرح ایک عضو
کے درد دُکھ مین تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد دُکھ مین تمام مسلمانون کو شریک ہونا چاہئے،

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ اُس کا دائرہ نہایت وسیع
ہے، اور اس مین تمام بنی نوعِ انسان شامل ہین، چنانچہ رسول اللہ صلعم نے متعدد حدیثون مین عام رحم کی تعلیم دی ہے اور
فرمایا ہے کہ جو شخص انسانون پر رحم نہین کرتا خدا بھی اُس پر رحم نہین کریگا، یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنے والون پر رحم کرنے والا
خدا رحم کرے گا، زمین والون پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا[4]

رحمدلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوعِ انسان ہی تک محدود نہین ہے بلکہ اُسمین بے زبان جانور بھی شامل ہین، چنانچہ آپنے فرمایا کہ اگر
کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کریگا، تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کریگا، ایک شخص نے آپکی خدمت مین عرض کی کہ مین بکری کو ذبح
کرتا ہون تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، آپنے دوبار فرمایا کہ اگر تم بکری
پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا،[3]

جانورون کے لڑانے کا جو بیرحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحمدلی کے بالکل مخالف
تھا اس لئے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا، اور رسول اللہ صلعم نے اس کی ممانعت فرمائی،[5]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم، [2] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس، [3] ادب المفرد باب رحمۃ البہائم
[4] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض، [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلعم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظون مین دی ہے، جو بلاغت کی جان ہین، فرمایا،

من لا یرحم لا یرحم[1] — جو رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا،

ان دو لفظون کی تشریح دفترون مین نہین سما سکتی، رحمدلی کا ہر منظر، اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ انہین دو لفظون سے اُبھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسرون پر رحم نہین کرتا اُس پر خدا بھی رحم نہین فرمائیگا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسرون پر رحم نہین کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہین کھائین گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح مین لکھا ہے کہ "اس مین تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دیگئی ہے، اس لئے اس مین مسلمان کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہین، اور اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، اُن پر ہلکا بوجھ لادنا اور اُن کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزین اسی رحم مین شامل ہین[2]" غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیمون کی غمخواری، بیکسون کی تسکین، بیوائون کی تسلی، غریبون کی امداد، مظلومون کی حمایت، اور زیردستون کی اعانت کرتے ہین، اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لئے مبارک ہین وہ جو رحم کرتے ہین، کہ اُن پر رحم کیا جائیگا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم،

[2] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۰، مصر،

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دونوں میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں[1]، اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں،

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عَدل (عدل والا) بھی ہے، علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[2]، قرآنِ پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا،

وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ۔ (مومن-۲) — اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے،

یہ عدلِ عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے،

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ۔ (احزاب-۱) — اور اللہ حق بات کہتا ہے،

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونوں باتیں قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں،

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ (انعام-۱) — اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کیساتھ پوری ہوگئی،

---

[1] مفردات راغب اصفہانی، [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی، صفحہ ۱۱ (الہ آباد)

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لیکر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات مین اپنی شہنشاہی پورے انصاف کیساتھ قائم کئے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے،

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ، (آل عمران ۲)

خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے (بھی) وہی خدا انصاف کو لیکر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لئے مخصوص نہین ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین عدل کی ضرورت ہے، اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت مین جن اچھی باتون کا حکم دیا ہے، ان مین سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل ۱۳) بے شبہہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے،

عدل قانون کا اقتضا ہے، اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے، اور بتایا ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہین کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبون کو لے کر ان مین عدل و انصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی مین عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگون کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتون سے نکاح کرتے ہین، اس لئے ان لوگون کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ، (نساء ۱۰۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیون مین) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضے مین ہو،

عورتون کی طرح یتیمون کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لئے فرمایا،

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ، (نساء ۱۹۰) اور (خاصکر) یہ کہ یتیمون کے حق مین انصاف کو ملحوظ رکھو،

عام معاملات مین عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید وفروخت مین وزن وپیمانہ مین ہے اس لئے فرمایا،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ، (انعام-۱۹)	اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو، اور (پوری پوری) تول،

قرآن مجید کی متعدد آیتون مین بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول مین بے انصافی نہ کیجائے، کیونکہ خرید وفروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لئے وزن وپیمانہ مین کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام ووسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار مین کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے، اور اس سے روح مین سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے،

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات مین ہوتی ہے، اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو مین عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ، (بقرہ-۳۹)	اور (تمھارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے،
فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا	پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا معذور
اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ	یا خود ادائے مطلب نہ کرسکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار
فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ، (بقرہ-۳۹)	(ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتون مین اکثر لوگون کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابتدار ہو یا اُس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت مین بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہین رکھتی،

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى	اور گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو

(انعام-۱۹) (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى

مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (یہی) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے،

(مائدہ-۲)

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے، اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے، اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے، یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسولِ اسلام علیہ السّلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے،

وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ

اور کہدے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری، اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے، اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے،

(شوریٰ-۲)

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیتِ پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کیجائے

بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے، اور تیسرا یہ کہ اب تک تم مین مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہو کہ دولتمندون اور عزت والون کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگون کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے، میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص، اور امیر وغریب سب کے ساتھ یکسان اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہین اس لئے اس کے سب غلامون کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے، ہم کو ہمارے اعمال، اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملیگا، اس مین جھگڑنے کی کوئی بات نہین، سب کو قیامت مین اُس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا، اس کو ویسا انعام ملے گا، اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملیگی،

عدل وانصاف کی راہ مین ان دونون سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی عدل وانصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ صلعم کی پاک تعلیم کی روشنی مین اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہوا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ	اے ایمان والو! انصاف کی حمایت مین کھڑے ہو،
شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ	اللہ کے لئے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس مین نقصان
وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ	ہی ہو، یا مان باپ کا، یا رشتہ دارون کا، اگر وہ
اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ	دولتمند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ اُن کا
تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ	خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے مین اپنے نفس کی
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝	خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملوگے یا کچھ بچا
(نساء - ۲۰)	جاؤگے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے،

ان آیتون مین عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات مین عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی مین

نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ مین آئے، نہ عزیزون اور قرابت دارون کا، نہ دولتمند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی مین کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی مین دولتمند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کر دیا کہو، پھر سچ کہنے مین کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہہ مین پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو تو یہ سب باتین عدل اور انصاف کے خلاف ہین، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ مین رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ مین ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے، جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ مین کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لئے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے،

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی مین مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہین ہو سکتا، اس لئے نہ گواہون کو اس لئے طرفداری کرنی چاہیئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل مین لانا چاہیئے، بلکہ دونون کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیئے کہ وہی اُن کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے،

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی مین اسی لئے غلط بیانی کرتے ہین کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونون بندون کے حق مین تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر مین سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندون کے ساتھ وہ کرتا ہے جس مین اُن کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظون مین عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی مین کسی خاص انسان کی بھلائی کے لئے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لئے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے

فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہین ہے کہ اُس نے اس طرح حقیقت مین سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی، اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان کی محدود نگاہ مین صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم مین سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہی،

اسی لئے رشوت دے کر حاکمون کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین گناہ ہے، اور بعض مفسرن کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت مین

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ. (بقرہ ۲۳)

اور نہ مال حاکمون تک پہنچاؤ تاکہ لوگون کے مال مین سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو،

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے[1]،

دو شخصون یا دو گروہون مین مصالحت کرنا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لئے اس مین بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے، اور کس حالت مین دیا گیا ہے جب دونون طرف سے تلوارین میان سے نکل چکی ہون، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہون یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیون مین بجھ رہا ہو اس عالم مین بھی مسلمانون سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھون سے نہ چھوٹے، فرمایا،

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. (الحجرات ۱-)

اور اگر تم مسلمانون کے دو فرقے آپس مین لڑ پڑین تو ان مین صلح کرا دو پھر اگر اُن مین کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہانتک کہ وہ حکمِ خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونون مین برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بیشک اللہ انصاف کرنے والون کو محبوب رکھتا ہے،

[1] تفسیر روح المعانی،

عدل وانصاف حکومت وسلطنت کی عمارت کا ستون ہی اسی لئے اسلام نے ہرقسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لئے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہین، اسی لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی	بیشک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتین امانت والون
اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا	کو پہنچاؤ، اور یہ کہ جب لوگون کے درمیان جھگڑے
بِالْعَدْلِ، (نساء-۸)	فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو،

اہلِ تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک مین "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہئے، خدا نے اس آیت مین اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہی، اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکسان عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہئے، چنانچہ خود رسول اللہ صلعم کو یہودیون کے معاملات مین حکم ہوا،

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ	اور اگر فیصلہ کرو تو ان مین انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ
یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ، (مائدہ-۶)	اللہ انصاف کرنے والون کو دوست رکھتا ہے،

عدل وانصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل وانصاف کرنے والون کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے،

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لئے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید مین اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہین کی گئی ہی، تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُھُمَآ	اور خدا (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی

اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّھُوَ کَلٌّ عَلٰی	(ہیں) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ
مَوْلٰہُ اَیْنَمَا یُوَجِّھْہُ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ھَلْ	پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ
یَسْتَوِیْ ھُوَ وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَھُوَ	سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اُسکو
عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ،	بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور
	وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل
(النحل-۱۰)	وانصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے رستے پر ہے

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکیگا، اور قادر ہونا چاہیئے کیونکہ حکم سے علوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا، اور عالم ہونا چاہیئے تاکہ ظلم وانصاف میں تمیز کر سکے اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیئے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیئے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیئے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے،

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو،

ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیئے تاہم امام وحاکمِ وقت کے لئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے اس لئے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لیگا جنمیں ایک شخص امام عادل ہوگا[1]،

---

[1] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش،

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آل عمران اور رعد)	بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،
لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ، (زمر-۲)	اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،
اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آل عمران-۲۰)	(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،
وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ، (روم-۱)	اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا
وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ، (حج-۶)	اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ،
فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗ، (بقرہ-۹)	تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا،
وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ، (توبہ-۱۴)	اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں، اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے،

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہین لیکن اسلام کی نگاہ مین اس کی حقیقت بہت وسیع ہے وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی اُن تمام صورتون پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً شرعاً قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے، اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآنِ مجید مین بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتون سے آیا ہے؛ ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ مین ہے،

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (بقرہ-۲۲) اور اپنے قرار کو جب قول دین پورا کرنے والے،

بعض آیتون مین اس کو کامل الایمان مسلمانون کے مخصوص اوصاف مین شمار کیا گیا ہے؛

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون) اور وہ جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہین

ایک دوسرے سورہ مین حقیقی مسلمانون کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اُس تصویر کا ایک رخ یہ ہے؛

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (معارج-۱) اور وہ جو اپنی امانتون کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہین

کسی کی امانت کو رکھ کر بلاکم وکاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی مین داخل ہے، اسلئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا، اور اسکے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانون کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت مین پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا،

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل-۴)

اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت مین) عہد کی بازپرس ہوگی، اور جب ناپ کر دو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھکر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے،

قانون یا رسم ورواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لئے تاکیداً پابندیِ عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لئے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول وقرار ہیں،

تمام عہدون مین سے سب سے پہلے انسان پر اُس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو خدا اور اس کے بندون کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندون نے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا انکی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت مین کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل مین بندون مین آپس مین ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے، اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے،

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ، (رعد-۳)	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہین اور اپنے اقرار کو نہین توڑتے اور جو خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُن کو جوڑے رکھتے ہین،

اس آیت مین پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اُس قول وقرار کا جو باہم انسانون مین ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے، سورۂ نحل مین اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاضر وناظر بتا کر یا خدا کی قسمین کھا کر بندے آپس مین کرتے ہین، فرمایا،

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا، (نحل-۱۳)	اور اللہ کا نام لیکر جب تم آپس مین ایک دوسرے سے قرار کرو تو اسکو پورا کرو، اور قسمون کو پکی کرکے توڑا نہ کرو، اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے،

اس معاہدہ کے عموم مین صحابۂ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہین جو اسلام لاتے وقت انھون نے رسول اللہ صلعم سے کئے، اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہین، جو جاہلیت مین کسی اچھی غرض سے کئے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس مین آجاتے ہین، جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمین کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کرین،

سورۂ انعام مین ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا،

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (انعام-۱۹)	اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے، تاکہ تم دھیان رکھو،

اس عہدِ الٰہی مین خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہین جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے، یا خدا نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے، جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے، اور انسانون کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمین کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہین،

صلح حدیبیہ مین مسلمانون نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی، اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت مین اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس مین مسلمانون کے مذہبی اخلاق کی آزمایش کیجا سکتی تھی، کہ اپنی قوت اور دشمنون کی کمزوری کے باوجود وہ کہان تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہین، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال مین اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، ان سے لڑنے کی اجازت گو دیدی گئی تھی، اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینون کی مہلت دو،

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ، (توبہ-۱)	اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکون کو جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو!) ملک مین چار مہینے، اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہین سکتے،

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکون اور مسلمانون کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہین رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکون کے ساتھ ایفاے عہد کی تاکید کی گئی جنھون نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا،

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ	مگر جن مشرکون سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انھون نے تم سے
لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ	کچھ کمی نہین کی، اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی، تو
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ	ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (توبہ-۱)	کرو، بیشک اللہ کو خوش آتے ہین تقوی والے،

اور ان مشرکون کے ساتھ اس ایفاے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کرین اُن کو متقی فرمایا، اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر اُن مشرکون سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، اللہ تعالیٰ مسلمانون کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش مین ان عہد شکن مشرکون کے ساتھ اُن مشرکون کے ساتھ بھی خلاف ورزی کیجائے جنھون نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے،

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ	مشرکون کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس
وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ	کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا	کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہین تم ان سے سیدھے
لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (توبہ-۲)	رہو، بیشک اللہ کو تقوی والے خوش آتے ہین،

"سیدھے رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہین تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو، اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کرین، اُن کا شمار تقویٰ والون مین ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ مین تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے، اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہین، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے، اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے،

قرآن مجید مین قریب قریب اسی عہد کے معنی مین ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے،

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ) مسلمانو! (اپنے) قرارون کو پورا کرو،

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہین، اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیون کی گرہ ہے، اور اصطلاح شرعی مین یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر مین لکھتے ہین۔

"اوفوا بالعهد" خداوند تعالی کے اس قول کے مشابہ ہے، یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ

اور اس قول مین تمام عقد مثلاً عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہین، خلاصہ یہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانون کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار دیا جائے اس کے مطابق دونون پر اس کا پورا کرنا واجب ہے[1]"

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے یہانتک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہوجاتی ہے، حسن عہد مین داخل ہے، صحیح بخاری مین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہین آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر اُن کا انتقال ہوچکا تھا لیکن رسول اللہ صلعم ان کا ذکر کیا کرتے تھے، اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت اُن کی سہیلیون کے پاس ہدیۃً بھیجا کرتے تھے[2] یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی سہیلیون کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو اُن کی زندگی مین جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب مین ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "حسن العهد من الایمان" اور اس باب کے تحت مین اسی حدیث کا ذکر کیا ہے،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حاضر ہوئی آپ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہین، تمھارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمھارا کیا حال رہا؟

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۸۰۵، [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العهد من الایمان،

اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا "عائشہ، یہ خدیجہ کے زمانہ مین ہمارے یہان آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے" یعنی اپنے ملنے جلنے والون سے حسب توقع یکسان سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے،

آنحضرت صلعم نے اپنی ایک مشہور حدیث مین فرمایا ہے، اور حضرت انسؓ کہتے ہین کہ آپ خطبہ مین اسکو ضرور فرمایا کرتے تھے

لادین لِمن لاعہد لہٗ ، (احمد طبرانی وابن حبان) جس مین عہد نہین، اس مین دین نہین،

یعنی اُس قول و قرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہین کرتا، وہ دین کی روح سے محروم ہے،



احسان
یعنی
بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اور اس لئے اس کی صورتین اتنی بے شمار ہین کہ اُنکا احاطہ نہین کیا جاسکتا، البتہ ان تمام صورتون کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اُس کو آرام پہنچے،

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حد و پایان نہین، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے ڈ اسی کے احسانون کی جلوہ نمائی ہے،

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط — اور اگر اللہ کے احسان گنو، تو ان کو پورا نہ گن سکوگے،

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۔ (ابراہیم-۵) — بیشک انسان بے انصاف ناشکرا ہے،

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان[1] کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر اُن کو قیدخانہ سے نجات دی اور وہان کے مان باپ اور بھائیون کو مصر لے آیا، ان لفظون مین ادا کرتے ہین،

---

[1] اس موقع پر ایک بات خیال مین رہے، عربی مین اِحسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہین اُردو مین جن معنون مین ہم احسان کا لفظ بولتے ہین، عربی مین جب خاص وہ معنی مراد ہون گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات مین اِلیٰ یا

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ، (یوسف-۱۱)
اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا، اور آپ لوگون کو گاؤن سے یہان لے آیا،

اسی طرح قارون کے قصہ مین اللہ تعالیٰ کے صفتِ محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے، فرمایا،

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (قصص-۸)
تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا،

اس دنیا مین جہان قدم قدم پر اولا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہرو کو دامنگیر ہے، احسان حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے، محمد رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے، اور قرآن مجید مین جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل مین حکم کی صورت مین ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی۔ (نحل-۱۳)
اللہ انصاف اور (لوگون کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والون کو دینے کا حکم دیتا ہے،

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہین کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان مین اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور مقدم صورت یعنی قرابت دارون کی مالی امداد کا ذکر کیا لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہین، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہین، اور عام لوگون کے علاوہ باپ، مان، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۰) کے صلہ کے ساتھ ہوگا، قرآن پاک مین جہان جہان محسن یا محسنین یا محسنون کے لفظ بلا صلہ آئے ہین ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائین گے، اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت مین احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہین ہو، جیسے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، (توبہ-۱۵)
بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والون کی مزدوری بیجا نہین کرتا

لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ، (زمر-۶)
کاش اگر میرے لئے لوٹ کر جانا ہوتا تو مین اچھا کام کرنے والون مین سے ہوتا،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، (آل عمران-۱۴)
اور اللہ احسان کرنے والون کو دوست رکھتا ہے،

آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اس لئے خداوند تعالیٰ نے سورۂ نسا، کی آیت میں (رکوع ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے، (بقرہ-۹ زخرف ۷ انعام ۱۶- اسرائیل ۳)

بہرحال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے، اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا،

وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ،	اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے
(قصص-۸)	تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر،

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ	اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے)
(یوسف-۱۱)	احسان کئے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو
	قید سے نکالا،

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی سیکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جنکو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا جس سے روکا گیا، اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کردو، فرمایا،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ	طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دو ہی
اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ، (بقرہ-۲۹)	طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر

(دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت
میں) رکھنا ہے یا حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کرو، اور اس کی ادائی میں لیت و لعل
اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا -

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ
بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ،
(بقرہ ۲۲-۲۲)

پھر جب (قاتل) کو اس کے بھائی (طالبِ قصاص) سے کوئی جزء (قصاص) معاف کر دیا جائے، تو (جان کے بدلے خونبہا اور وارثِ مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارثِ مقتول کو خوش معاملگی

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور اُن کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان
کو یہ درجہ دیا ہے، کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہوں گے،

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ، (آل عمران - ۱۴)

اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کئے بغیر اس کو طلاق دیدے[ع]
تو شوہر پر نصف مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف
کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ خلق ہے، اور یا شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں، تو یہ مرد کا حسنِ خلق ہے
اس کے بعد ارشاد ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، (بقرہ ۲۱-۳۱)

اور آپس میں فضل کو مت بھولو[1]، بیشک اللہ تمہارے
کاموں کو دیکھ رہا ہے،

ع یعنی جس حالت کہ مہر مقرر ہو چکا ہو ورنہ صرف جہیز لازم آتے ہیں،

[1] سعید سے روایت ہے "آپس میں فضل کو مت بھولو" یعنی احسان کو مت بھولو" (ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر)

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والون کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کرین اور اپنے احسان سے باز نہ آئین[1]، فرمایا،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ	اور تم مین جو احسان اور کشایش والے ہین وہ
أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	قرابت دارون، غریبون اور خدا کی راہ مین ہجرت
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا،	کرنے والون کو نہ دینے کی قسم نہ کھالین ان کو چاہیے
(نور - ۳)	کہ معاف کرین اور درگذرین،

احسان کے اسی وسیع معنی مین اسلام نے ایک اور جامع لفظ "معروف" کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف مین داخل ہے، قرآن کا حکم ہے وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (اعراف-۲۴) اور نیکی کرنے کو کہہ، اور اس کی نسبت رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ

کل معروف صدقة،	ہر نیکی ثواب کا کام ہے،

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لئے غریب و امیر کی تخصیص نہین بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے" اصحابہ نے عرض کیا کہ "اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا "کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے" صحابہ نے عرض کیا کہ "اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے" فرمایا "غریب حاجتمند کی اعانت کرے" صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا نیکی کے کرنے کا حکم دے، صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرسکے، ارشاد ہوا کہ برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث مین آیا ہے کہ آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی مین داخل ہے[2]"

اسی معنی مین قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بِرّ" کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرے مین کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے

---

[1] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکورہ بعضون نے یہان فضل سے فضیلت دینی، اور کسی نے فضل مالی مراد لیا ہے، [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقة مع فتح الباری،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	جو لوگ تم سے دین کے بارے مین نہین لڑے اور
فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	انھون نے تم کو تمھارے گھرون سے نہین نکالا انکے
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ	ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ،	خدا تم کو منع کرتا نہین (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ
(ممتحنہ - ۲)	کرنے والون کو دوست رکھتا ہے ،

صحابہ مین کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلمون پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہین سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمھارا نہین، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی، اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہئے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملیگا، [1] ارشاد ہوا،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ	تیرا تو ذمہ نہین ان کو راہ پر لے آنا لیکن اللہ راہ پر لے آتا
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ	ہے جس کو چاہے، اور تم جو دوگے خیرات سو اپنے واسطے
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ	اور تم نہین دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر، اور جو دوگے
مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ - ۳۷)	خیرات وہ تم کو پوری مل جائیگی، اور تمھارا حق مارا نہ جائیگا،

گو یہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت مین ساری دنیا سمائی ہے،

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے، جو نیک کام کرینگے ان کو خدا کے ہان سے نیک ہی جزا ملیگی، ارشاد ہوا،

وَهَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ، (رحمان - ۳)	اور بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی،

گو یہ آیت پاک اپنے سباق کے لحاظ سے آخرت مین نیک کامون کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظون کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونون کو شامل ہے،

---

[1] ابن جریر و ابن کثیر بحوالۂ نسائی، تفسیر آیت مذکورہ،

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضدارون پر احسان کرنا، ضرورت مندون کو قرض دینا اور تنگدست مقروضون کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہون، اُن کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے،

عرب مین سود خواری نے لوگون کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہین ادا کر سکتے تھے، وہ غلامون کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے، اور جو قیمت ملتی تھی اس سے اُن کا قرض ادا کیا جاتا تھا آج اس تمدّن کے زمانہ مین قرض کی زنجیر مقروضون کے لئے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے،

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ	اور اگر (کوئی تنگدست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی
وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ،	تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق مین
(بقرہ - ۳۸)	یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو،

اور رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث مین خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ "قیامت کے دن مین خود تین آدمیون کا فریق ہون گا، جن مین ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی"[1] اس کو اور بھی موکد کر دیا، اور قرض کے معاملے مین تنگدستون پر احسان کرنے کی متعدد صورتین بتائین یعنی مہلت دینا قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا، اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہین کرتا تھا، لوگون کو قرض دیتا تھا، اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازمون سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو، شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ مین اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث مین ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتون نے سوال

[1] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری،

کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں، فرشتون نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ مین لوگون کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے مین آسانی کرتا تھا اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا، یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا، اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا[1]،

اس قسم کی بہت سی روایتین ہین، ایک حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے، یا اس کا قرض معاف کرنے[2]، یہی روایت مسند ابن حنبل مین ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کردیگا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ مین ہوگا[3]،

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسرون کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی مین محدود نہین کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ مین وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت مین بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہین کیا ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو اگر تمہین کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کیساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو[4]،

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہئے، محمد رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے آکر پوچھا کہ "یا رسول اللہ مین کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہون تو وہ میری مہمانی نہین کرتا، تو کیا جب اس کا گذر مجھ پر ہو تو مین بھی اسکی کج خلقی کا بدلہ یہی دون" فرمایا "نہین، تم اس کی مہمانی کرو[5]"

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا "ایسے نہ ہو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسرون کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کرینگے تو ہم بھی احسان کرینگے، اور اگر وہ ظلم کرین تو ہم بھی کرینگے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کرو کہ اگر دوسرے احسان کرین تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کرین تو تم ظلم نہ کرو[6]"

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب من انظر معسرا و باب من انظر موسرا و صحیح مسلم باب فضل انظار المعسر [2] مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر،

[3] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۰ [4] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح، جامع ترمذی [5] باب ما جاء فی الاحسان والعفو [6] ترمذی ابواب ۱۲

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتموّل یا اور دوسری بڑی بڑی باتون کے ساتھ خاص کرتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ غریب کیا احسان کا کام کرسکتے ہین لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگون کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہین، دل کی ضرورت ہے، اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے، حضرت براءؓ بن عازبؓ صحابی کہتے ہین کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلعم کی خدمتِ مبارک مین حاضر ہوکر درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلعم مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا "تمھاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمھارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانون کو آزاد کرو، اور گردنون کو چھڑاؤ" اس نے کہا یا رسول اللہ صلعم کیا یہ دونون باتین ایک ہی نہین؟ فرمایا "نہین اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر کسی کی آزادی کی قیمت مین مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے، اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کرسکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو، اور برائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کرسکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتون سے روکو"[1]

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلعم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا "جو روزی خدا نے دی اس مین سے دوسرون کو دے" عرض کی "اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی اگر اس کی زبان معذور ہو، فرمایا "مغلوب کی مدد کرے" عرض کی اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو، فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کردے" عرض کی اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو، فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگون کو بچائے رکھے"[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب، [2] مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۳،

عفو و درگذر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے، اور دم کے دم مین یہ گناہون سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص نامون مین سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ، غَفُوْرٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہی) اسکی شان یہ ہے،

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ — اور وہی ہے جو اپنے بندون کی توبہ قبول کرتا ہے

يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ، (شوریٰ-۳) — اور برائیون کو معاف کرتا ہے،

وہ چاہے تو انسانون کے گناہون کے سبب سے اُن کو ایک دم ہلاک کر دے، یا اُن کو معاف کر دے، فرمایا

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ، (شوریٰ-۴) — (اگر خدا چاہے تو) گنہگارون کو اُن کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتون کو معاف کر دے،

وہ اپنے شرمندہ بندون کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یون دلاتا ہے،

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى، (طہ-۴) — اور اس مین شبہہ نہین کہ مین البتہ اس کی بڑی بخشایش کرتا ہون جو توبہ کرے اور یقین لائے، اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے،

قرآن پاک مین اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غَافِرٌ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غَفَّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتون مین غَفُوْرٌ (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا

کہ اُس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، خدا نے اپنی ساری صفتون مین سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندون مین پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہو، فرماتا ہے،

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا، (نساء - ۲۱)

یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بیشک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا،

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے، تو اُس کی قدرت بہرحال کامل نہین لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہین، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروارون کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصورون کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصوروارون کو معاف کرین[1]،

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصوروارون کو معاف کرین گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصورون کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت مین اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، (نور - ۳)

اور چاہئے کہ وہ معاف کردین اور درگذر کرین کیا تم نہین چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے، اور اللہ معاف کرنے والا مہروالا ہے،

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے لوگون کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسرون کو معاف کرو تو خدا تمھین معاف کرے گا، اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹین پڑنی چاہئین، چنانچہ جن مومنون کے لئے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، اُن کی ایک صفت یہ بتائی ہے،

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ، (شوریٰ)

اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہین،

سکون کی حالت مین معاف کرنا اتنا مشکل نہین جتنا غصہ کی حالت مین جب انسان کو اپنے آپ پر قابو

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان،

نہین رہتا لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جنہین یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت مین بھی اپنے آپ کو قابو مین رکھتے ہین، اور قصور والون کو معاف کر دیتے ہین،

یہ تو کسی ذاتی غیظ وغضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہان مذہبی اختلاف درمیان مین ہے کہ ان احمقون کو اچھی بات بتائی جاتی ہے، اور وہ نہین مانتے، ان کے دعوی کی کمزوری ثابت کیجاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہین، اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہکر دیتے ہین، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ،	اور اگر تم اُن کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو تمہاری (ایک) نہ سنین اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہین کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہین، حالانکہ وہ دیکھتے نہین، (اے پیغمبر) درگذر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگون سے) نیک کام (کرنے) کو
(الاعراف - ۲۴)	کہو اور جاہلون سے کنارہ کش رہو،

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتین ہو سکتی ہین، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ مین ان ناگواریون کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریون کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہین بلکہ اس سلسلے مین برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو،

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ،	(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت
(مومنون - ۶)	کہا کرتے ہین وہ ہم کو خوب معلوم ہے،

مذہبی جماعت کیلئے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ اُن لوگون کو بھی اُن سے الگ کرنا چاہتے ہین جو ان کی جماعت مین شامل ہو چکے ہین، لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانون کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم	(مسلمانو!) بہت سے اہل کتاب باوجودیکہ ان پر حق ظاہر
مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ	ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے
أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ	ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنادیں
فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ	تو معاف کرو اور درگذر کرو یہانتک کہ خدا اپنا
(بقرہ ۔ ۱۲)	حکم صادر فرمائے،

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہئے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اسکا بدلہ اُن کو مل جائے گا، فرمایا۔

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ	ایمان والوں سے کہدے کہ اُن کو جو اللہ کے جزا و سزا
أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ	کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں، تاکہ
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ	لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے جس نے اچھا کیا
فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ،	اس نے اپنے بھلے کے لئے کیا، اور جس نے برا کیا اس
(جاثیہ ۔ ۲)	نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤگے۔

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، اور مسلمانوں کو عفو و درگذر کی[1] نصیحت فرمائی، (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

---

[1] اس قسم کی آیتوں کے متعلق جنہیں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے، عام مفسرون کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لئے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے، لکھتے ہیں،

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲) ... اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ) میں رسول اللہ صلعم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں، اور اُن کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے، اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں، کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں، اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہوسکتی ہیں، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔ (جلد ۲ صفحہ ...)

ایک اور آیت (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

"کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہو، جبتک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔" (ج ۶ ص ۳۰)

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں،

"کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کردیا، لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا، اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہو، اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہو۔" (ج ۶ ص ۱۹۷ طبع دار الطباعة العامرة مصر)

آیت یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ کفار پر عفو وکرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہو کہ ان سے قتال نہ کیا جائے، لیکن جب خدا نے اُن سے قتال کا حکم دیا تو عفو وکرم کے حکم کا نسخ ہوگیا، لیکن قریب بصحت یہ ہو کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے، اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کی جائے۔"

(جلد ۷ صفحہ ۴۰۸ طبع مذکور)

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے اُن ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے، اور وہ حقوق عباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں، تو مسلمان معاف کردیں، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر وشرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہو جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں، اور قتال وجہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہو، اس لئے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو ودرگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں،

درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانی صحابی کا ایک واقعہ نقل کیا ہو کہ انھوں نے اپنی ایک کافر لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھکر معاف کیا تھا، اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ ص ۳۵ مصر)

مالی امداد بند کر دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ	اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے
أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا	کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں
تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ	بلکہ (چاہیئے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگذر کریں
رَحِيمٌ،	(مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف
(نور - ۳)	کردے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا،

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	اور اپنے پروردگار کی بخشایش اور اس جنت کی طرف
عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ	لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان،
لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ	(کا پھیلاؤ بھی بجائی) ان پرہیزگاروں کے لئے تیار
وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ	ہے جو خوشحالی اور تنگدستی (دونوں حالتوں) میں خدا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ،	کے نام پر خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے
(آل عمران - ۱۴)	قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں، اور (لوگوں کے
	ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے،

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ خدا میں دینا، اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور

درگذر کرنا اور اُن کے لئے دو جزائیں ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت، بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حد و پایان آسمان و زمین ہیں اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی، اور وہ احکم الحاکمین ہمکو بھی معاف کریگا، عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزء شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جائے، اسی لئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے، اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طپانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اسکی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ	اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر کسی طرح بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لیتے ہیں،
وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا	اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف
وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ	کر دے اور صلح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے،
الظّٰلِمِيْنَ،	بیشک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،
(شوریٰ - ۴)	

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے، اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے، کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں یا وہ ہوں جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، خدا کی محبت سے محروم ہیں،

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے، کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھکر عفو و درگذر کرتا ہے، اسی لئے فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوریٰ - ۴)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں،

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے،

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (حٰم السجدہ - ۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے ناتے والا، اور یہ بات ملتی ہے اُنہیں کو جن میں صبر ہے، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے، اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ، بیشک وہی ہے سنتا جانتا،

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، کہ انہوں نے کہا،

"خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا، اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا، اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو خدا اُن کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا[1]"

ابو مسعود صحابیؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی جان لو جان لو مڑکر دیکھا

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور،

تو آنحضرت صلعم تھے، فرما رہے تھے کہ اے ابومسعود جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے،
ابومسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا،

ایک شخص نے حضور انور صلعم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں، آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا تب آپ نے فرمایا "ہر روز ستر دفعہ[1]" اس سے مقصود کوئی تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے،

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے اُن کے رعب و داب اور وقار میں فرق آجائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہوجاتی ہے، اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے[2]،

وما زاد اللہ رجلاً بعفو الا عزاً، اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں،



[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں، [2] ایضاً باب ماجاء فی التواضع،

حلم و بُردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے، اور قصور وار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، اور انتقام نہیں لیتا، اور اسی لئے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا:

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ، (بقرہ-۲۸ مائدہ-۱۴) اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (آل عمران-۱۶) بیشک اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ، (اسرائیل-۵ ملائکہ-۵) بیشک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار،

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے، دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ، (نساء-۲) اور اللہ ہے جاننے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ، (حج-۸) بیشک ہی اللہ جاننے والا بردبار

وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا۔ (احزاب-۶) اور ہے اللہ جاننے والا بردبار،

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے، یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم، اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے،

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ۔ (بقرہ - ۳۶) اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے،

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لئے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے،

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ میں علم اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لئے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے، کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے،

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے، اور اسی لئے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اس نے اپنے علم اور دار و گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دیا ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی، اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا،

وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (بقرہ-۳۰) اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمھارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا،

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ میں ہے یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چوری چھپے بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے، اور نکاح نہ کرے، دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے

کہ اللہ کو تمھارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لئے ایک طرف تو اسکی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لئے اس سے پُر امید بھی رہنا چاہیے نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے، اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے اس موقع پر اس کا ارشاد ہے،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ	اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا
لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ۭ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ	کرے گا، اور تمھیں معاف کرے گا، اور اللہ ہے
(تغابن ۲۰)	قدردان اور تحمل والا،

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا، اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کریگا، اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں، اور اس کی خوبیاں نظرانداز ہوجاتی ہیں، اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہوجاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے، یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں، تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کرکے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہوجاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے،

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیاد ڈالی پر محمد رسول اللہ صلعم کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے انھوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہوکر اس سے علٰحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے

جب تک ان کو پوری مایوسی نہین ہوگئی، اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہین ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے، اس واقعے سلسلہ مین ہے،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ، (توبہ-۱۴)	اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کرلیا تھا، پھر اون کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہوگئے، بیشک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کرلیا تھا)

دوسری آیت مین اس موقع پر جہان قوم لوطؑ کی بربادی کی خبر پاکر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہین اُن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ (ھود-۷)	بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے،

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خدا وند تعالیٰ نے اپنی توصیف مین حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف مین اَوّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لئے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہین لیکن ایک اور آیت مین حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا ہے،

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ، (والصّٰفٰت-۳)	تو ہم نے اُن کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسمٰعیل کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی،

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انھون نے کہا ہے،

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ، (والصّٰفّٰت - ۳) — اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اسکی تعمیل کیجئے انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائین گے ،

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزء ہے، حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم مین دو خصلتین ایسی ہین جنکو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلدبازی نہ کرنا[1] یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ مین کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے ،

ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، آپنے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو"[2] اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ پہلوان وہ نہین ہے جو لوگون کو کشتی مین پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو[3] رکھے، ایک اور حدیث مین ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصے کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعامِ خاص کا مستحق ٹھہرائے گا[4]"

حضرت ابوہریرہ کہتے ہین کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلعم کی خدمت مین ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے کچھ رشتہ دار ہین، مین ان کے ساتھ ملتا ہون[5] وہ کاٹتے ہین، مین بھلائی کرتا ہون، وہ بدی کرتے ہین، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہین، مین تحمل کو راہ دیتا ہون، آنحضرت صلعم نے یہ سن کر فرمایا کہ "اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ مین گرم راکھ بھرتے ہو، اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی[6]"



---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التانی والعجلہ ، [2] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ، [3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب ، [4] یعنی صلۂ رحم کرتا ہون ، [5] صحیح مسلم باب صلۃ الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم ،

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہین کہ معاملات مین سختی اور سخت گیری کے بجاے نرمی اور سہولت اختیار کیجائے، جو بات کیجائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے، اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلون کو موہ لے، اور پتھر کو بھی موم کردے،

اللہ تعالیٰ نے کئی آیتون مین اپنے کو "لطیف" فرمایا ہے[1]، اور حدیثون مین اس کا نام رفیق[2] آیا ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندون کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے مین رفق ولطف فرماتا ہے، اور اپنے اس لطف مین وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہین کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف[ع] کو

---

[1] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہین :

"وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے" (لفظ لطف)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہین :

"خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے، اور ان کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے، ...... لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا، اور اس طرح ان کی مصلحتون کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہین ہوتا، ..... ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے" (ص۴۹ الہ آباد)

امام غزالی کہتے ہین :-

"اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر انکو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں ان تک پہنچاتا ہے جن کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں، اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے" (روح المعانی تفسیر سورۂ شوریٰ)

[2] صحیح مسلم کتاب ... باب فضل ...

بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور اُن کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعون سے مصر تک لایا، اور دشمن بھائیون کو جس طرح اُن کے سامنے نادم و شرمندہ کرکے اُن کے آگے سرنگون کردیا، اس کو یاد کرکے وہ فرماتے ہین،

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۔ (یوسف - ۱۱) — بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے، بیشک وہی علم والا حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلین پیش آئین، اور پھر وہی مشکلین جس طرح اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنین، ان کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت مین اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے،

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ۔ (شوریٰ - ۲) — اللہ اپنے بندون پر لطف فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے، اور وہی قوت والا غالب ہے،

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنون اور کافرون کا ذکر ہے، اور نیچے بھی ان دونون قسمون کا تذکرہ ہے، بیچ مین یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونون کے ساتھ ہے کہ دونون کو یکسان وہ رزق پہنچاتا ہے[1]، اور اسی لئے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کران کا ایک نتیجہ ہے،

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق مین جب دعاے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی مین گو یہ دعا مستجاب[2] نہ ہوئی، مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ۔ (توبہ - ۱۴) — بیشک ابراہیم نرم دل بردبار تھے،

اسی طرح جب وہ قومِ لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیم کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ۔ (ھود - ۷) — بیشک ابراہیم بڑا بردبار نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے

---

[1] تفسیر روح المعانی مین مقاتل کا یہی قول ہے، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو اوضح جانتے ہین [2] حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت کی اطلاع پاکر اس کے بعد ان سے اپنی علٰحدگی ظاہر کردی،

اَوَّاہٌ کے معنی مین مفسرون کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائین مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینون باتین پوری اترتی ہون، وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اس لئے جلد پسیج جاتے تھے، اور یہ اس لئے ایسا تھا کہ ملتِ حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا، چنانچہ اسی لئے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار مین اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہین، تو اُن کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہین،

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی، (طٰہٰ-۲)	سو تم دونون اس سے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت پائے یا (خدا سے) ڈرے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے، اور اسی لئے دینِ حنیف کے مبلغِ اعظم اور توحید کے داعیِ اکبر محمد رسول اللہ صلعم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصۂ وافر عنایت فرمایا تھا، خود حضور صلعم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے،

فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ، (آل عمران-۱۷)	تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم اُن کے لئے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے،

اسلئے ایک پیغمبر کے لئے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگون کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائین، اور اسی لئے رحمتِ عالم صلعم کی ذاتِ پاک مین یہ وصف سب سے نمایان طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا،

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض اُن تمام اخلاق کے عطر کا نام جن مین شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے، جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرایش سے بالا و

ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے، آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظون مین سمجھائی، فرمایا،

اِنَّ الرِّفق لایکون فی شئ الّا زانه ولا	نرمی جس چیز مین ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز
ینزع من شئ الا شانه[۱]	سے الگ کرلیجاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے،

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز مین نرمی کام کو بناتی، اور سختی بگاڑتی ہے، الّا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو،

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدا نرم خو (رفیق) ہے، اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہین دیتا[۲]، جریر بن عبداللہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا، وہ بھلائی سے محروم رہا[۳]" اور فرمایا کہ "تین خصلتین جس شخص مین ہونگی خدا اپنے سائے کو اس پر پھیلائے گا، اور اس کو جنت مین داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ مان پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا[۴]"

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ نے دوسرے الفاظ مین یون دی،

الا اخبرکم بمن یحرم علی النار وتحرم	کیا مین تم لوگون کو بتاؤن کہ کون شخص آگ پر حرام ہے
علیه النار علی کل قریب هین سهل[۵]	اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگون سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو،

ایک بار یہودیون کی ایک جماعت رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئین، اور انھون نے جواب مین کہا "وعلیکم السام واللعنة" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ صلعم نے سنا تو فرمایا کہ عائشہ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کامون مین نرمی کو پسند کرتا ہے، بولین یا رسول اللہ

---

[۱] و [۲] و [۳] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل الرفق، [۴] ترمذی ابواب الزہد، [۵] ایضاً۔

انھون نے جو کچھ کہا کیا آپنے نہین سنا، فرمایا مین نے بھی تو کہدیا کہ علیکم یعنی تم پر[1]

آنحضرت صلعم کے جواب مین یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس مین سختی کا نشان نہین، اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو،

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اُس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی مین سے کسی حد کو توڑ ڈالے، اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھین اور اپنی ضد پر اڑے رہین، بلکہ مسلمانون کو آزار پہنچانے کے درپے ہون، تو اُن کے شر کو روکنے، اور اُن کی سازشون کے قلع وقمع کرنے کے لئے اُن پر پوری سختی کیجا سکتی ہے، فرمایا،

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ. (تحریم-۲) — اے پیغمبر! کافرون اور دغابازون سے جہاد کر اور ان پر سختی رکھو،

دوسری جگہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً. (توبہ) — اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافرون سے لڑتے جاؤ اور چاہیے وہ تم مین کراپن پائین،

اسی طرح شریعت کے گنہگارون کو جب سزا دی جائے، تو مسلمانون کو چاہیئے، کہ اس کے اجرا مین نرمی نہ برتین مسلمان بدکار مردون اور بدکار عورتون کی سزا کے متعلق فرمایا،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور-۱) — اور اللہ کے حکم چلانے مین تم کو ان دونون پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو،

آنحضرت صلعم کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس مین بھی نرمی اور سختی کے مواقع مین یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے، ام المومنینؓ فرماتی ہین کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے ذاتی معاملہ مین کبھی کسی سے بدلہ نہین لیا، البتہ

[1] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ،

جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کیجاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے[1]"۔ امام بخاری نے ایک خاص باب مین اس قسم کی متعدد حدیثین نقل کی ہین جنمین آپ نے مسلمانون بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات مین سختی برتی ہے[2]، حافظ ابن حجر اس باب کی شرح مین لکھتے ہین:-

"گویا امام بخاری اس باب مین یہ اشارہ کرتے ہین کہ جس حدیث مین یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم تکلیفون پر صبر کرتے تھے وہ آپکے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق مین آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا" (فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلعم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو، سختی نہ کرو[3]"۔ شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات مین سختی نہ برتی جائے، اور شریعت نے جس حد تک گنجایش اور وسعت رکھی ہو اس مین تنگی نہ کیجائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ مین ایک شرعی غلطی ہوگئی، انھون نے اپنی قوم کے لوگون سے کہا کہ مجھے حضور کی خدمت مین لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انھون نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی مین حاضر ہو کر حقیقتِ حال عرض کی، ارشاد ہوا کہ "ایک غلام کی گردن آزاد کرو"۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھکر بولے کہ یا رسول اللہ صلعم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہین، فرمایا "لگاتار دو مہینے روزے رکھو"، گذارش کی کہ "یا رسول اللہ روزہ ہی مین تو یہ حرکت ہوئی، پھر روزہ رکھون"، فرمایا "ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ" عرض پرداز ہوے کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک مین رات گذاری ہے"، فرمایا کہ "صدقہ کے فلان محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو، اس سے ساٹھ مسکینون کو کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ"۔ وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم مین آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ مین نے تمھارے پاس تنگی اور بری رائے، اور نبی صلعم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی[4]۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلعم یسّروا و لا تعسّروا، [2] باب ما یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ، [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسّروا ولا تعسّروا [4] سنن ابی داؤد باب فی الظہار،

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، جس مین کوئی اُس کا شریک نہین،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ — اور اُسی کو بڑائی ہے، آسانون مین اور زمین مین اور

هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، (جاثیہ-۴) — وہی زبردست ہے حکمت والا،

اس لئے بندون کی شان نہین کہ وہ کبریائی کرین، اُن کی بندگی کی شان اس مین ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کرین، اور عاجزی وفروتنی برتین،

تواضع وخاکساری کے بہت سے مظہر ہین، قرآن مجید نے ان مین سے نمایان مظاہر کو لے کر بعض موقعون پر اُن کا حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعون پر اُن کو اپنے خاص بندون کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ صلعم کو پہلے کفار سے درگذر کا پھر مومنون کے ساتھ پرمحبت تواضع کا حکم دیا ہے،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ، (حجر-۶) — اور اپنا بازو مومنون کے لئے جھکا دے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، (شعراء-۱۱) — اور اپنا بازو جھکا رکھ اُن کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہین ایمان والے،

اولاد کو مان باپ کے سامنے اسی پرمحبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہئے،

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل) — اور مان باپ کے لئے عاجزی کا بازو مہر ومحبت سے جھکا دے

"تخفض جناح یعنی بازو جھکا دینا، تواضع وخاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ لیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف آ جائے[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص) بندے تو وہ
هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا	ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل
سَلٰمًا،	اُن سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو)
(الفرقان - ۶)	سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی، کہ خدا جب رحمت اور مہر و کرم والا ہے، تو اس کے بندوں میں خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو،

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی،

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر، اور زمین پر اترا کر نہ چل
فِي الْاَرْضِ مَرَحًا، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ	(کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں
مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ	کرتا، اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور
مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ	(کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری
الْحَمِيْرِ، (لقمان-۲)	سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے،

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو،

---

[1] المثل السائر باب نوع التشبیہ و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۳۶۶، دار الطباعۃ العامرہ،

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع وخاکساری اور دنائت وپستی میں بڑا فرق ہے، تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر وغرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے، اور دنارت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لئے انسان اپنی خودداری کو کھودے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر وغرور کا حکم دیا ہے، صحابہ جب حجۃ الوداع کے لئے آئے، تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے اُن کو کمزور کر رکھا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور ان کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر اُن کی طاقت کا اظہار ہو،[1] قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے، اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند،[2]

بہرحال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے، اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے، ضعف وذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے، لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کے لئے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے"[3] ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے"[4]

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لئے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بیجا استعمال نہ کرنے پائے جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے، رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے"[5] اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہئے،

---

[1] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع [4] ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتین کرنے مین ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے تاکہ آپس مین خوشگوار تعلقات پیدا ہون، اور باہم مروت اور محبت بڑھے، سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائین دینا، اچھی باتین کرنا، اچھی باتین سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہین، خدا تعالیٰ نے توراۃ مین بنی اسرائیل کو لوگون کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک مین بھی دہرا دیا ہے،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، (بقرہ ۔ ۱۰) اور کہیو لوگون سے اچھی بات،

اس اچھی بات کہنے مین لوگون کے فائدہ اور کام کی باتون کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتون کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت مین یہی حکم دوسرے لفظون مین اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندون کی پہچان بنتا ہے، ارشاد ہے،

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ	اور (اے پیغمبر) میرے بندون سے کہدے کہ وہ
اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ	بات کہین جو سب سے اچھی ہو، بیشک شیطان جھگڑا تا
كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا، (بنی اسرائیل ۔ ۶)	ہے آپس مین، بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے

آیت کے پچھلے حصہ مین دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی، اور خوش کلامی آپس مین میل ملاپ پیدا کرتی ہے، اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے، وہ اسکے ذریعہ سے لوگون مین غصہ، نفرت، حسد اور نفاق

کے بیج بوتا ہے، اس لئے اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں، کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو، اسی لئے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے، کسی کو یا کافر، یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اُس اچھی بات کے خلاف جو آپ اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ (حجرات - ۲)

اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو، اور نہ چڑھ کا نام لے کر پکارو، ایمان کے بعد گنہگاری بُرا نام ہے۔

اسی لئے برائیوں کے تذکروں، اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ، (نساء - ۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے"[1] اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہئے، اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیر خواہی، اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے، رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "جو اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے"[2] اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا، اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل رہیگی، ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا، اور روئے اور پھر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی اللعنۃ و [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا "دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو کوئی اچھی بات سے"[1]

ایک دفعہ آپنے جنت کا ذکر فرمایا، اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی مجلس مین حاضر تھے، بیتابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکون کو کھلایا، اکثر روزے رکھے، اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو[2]

ایک اور حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا "اچھی بات صدقہ ہے"[3] یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کیجاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخمون پر پھاہا رکھا جاسکتا ہے، اور سچی سعی وسفارش سے اس کو مدد پہنچائی جاسکتی ہے،

ایک صحابی نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ نجات کیونکر ملے" فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو، اور تمھارے گھر مین تمھاری گنجایش ہو، اور اپنے گناہون پر رویا کرو"[4] ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلعم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے، آنحضرت صلعم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا "اس کا ڈر ہے"[5]



[1] صحیح بخاری باب طیب الکلام [2] ترمذی ماجاء فی قول المعروف، [3] صحیح بخاری کتاب الصلح، [4] ترمذی باب حفظ اللسان [5] ترمذی ایضاً

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے اس کے معنی یہ ہین کہ دوسرون کی ضرورتون کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرون کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسرون کو آرام پہنچائے صحابۂ کرام مین انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانمان ہوکر اور اپنا سب کچھ مکہ مین چھوڑکر مدینہ آئے تو انصار نے اُن کو ہاتھون ہاتھ لیا، ان کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتون مین اُنکو شریک[1] کیا، اور خود ہرطرح کی تکلیفین اٹھاکر اُن کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانون کے ہاتھ آئی، اور آنحضرت صلعم نے دو انصاریون کے سوا باقی ساری زمین مہاجرون کو دیدی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کرلیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور انکی مدح وستائش[2] کی،

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ،

(حشر - ۱)

اور ان کے واسطے جنھون نے ان (مہاجرون کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) مین اور ایمان مین جگہ پکڑی، اور محبت رکھتے ہین اس سے جو اپنا گھر چھوڑکر ان کے پاس چلا آیا، اور ان (مہاجرون) کو دیئے جانے سے دل مین کوئی مطلب نہین رکھتے، اور اپنے اوپر تنگی کیون نہ ہو (ان مہاجر بھائیون کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہین اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہین،

---

[1] صحیح بخاری اوّل مناقب انصار، [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری،

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلعم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیرون مین تقسیم کردینا چاہتا ہون، ان ایثار کے پیکرون نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیون کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہین، فرمایا اگر یہ منظور نہین، تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچیگی کہ لوگ لے لینگے، اور تم کو نہین پوچھین گے،[1]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بُن کر آنحضرت صلعم کی خدمت مین پیش کی، آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے عنایت ہو، آپنے اسی وقت اتار کر اُن کے حوالہ کر دی، صحابہ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کو اس کی حاجت تھی، اور آپ کسی کا سوال رد نہین فرماتے، تم نے کیون مانگ لی، بولے ہان مین نے تو برکت کے لئے لی ہے، کہ یہی چادر میرا کفن بنے،[2]

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلعم کی خدمت مین آیا، کاشانۂ نبوی مین اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے آپنے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے، اور بیوی سے پوچھا کہ گھر مین کچھ ہے؟ بولین، صرف بچون کا کھانا، بولے بچون کو سلادو، اور چراغ کو بجھادو، ہم دونون رات بھر بھوکے رہین گے، البتہ مہمان پر ظاہر کرین گے کہ کھا رہے ہین، چنانچہ انھون نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حاضر ہوئے، تو آپنے فرمایا "خدائے تعالیٰ تمھارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا"[3]

بعض روایتون مین ہے کہ اوپر کی آیت مین انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے،[4] لیکن قرآنِ پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے، جس مین یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہون گے،



[1] صحیح بخاری اول باب مناقب انصار، [2] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء و باب من استعد الکفن، [3] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف و فضل ایثارہ، و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر، [4] ایضاً،

اعتدال و میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس مین وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسلون مین افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک نے مسلمانون کو اُمَّۃً وَّسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے اُن مین ایک یہ بھی ہو کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے[1]، اس لئے اُس نے اکثر معاملون مین اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات مین بھی اس اصول کو وہ نہین بھولا ہے،

دعا یا نماز مین ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے،

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا — اور تو نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) مین اور نہ چپکے پڑھ اس

وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا۔ (بنی اسرائیل-۱۲) — ڈھونڈ لے اس کے بیچ مین راہ،

یعنی نہ چلا کر دُعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمایش ہو جائے، یا مخالف اس کو سنکر برا بھلا کہے، اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکین، بلکہ دونون کے بیچ کی راہ اختیار کیجائے،

ہماری چال ڈھال کیسی ہو، اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح مین ہے،

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ ، (لقمان-۲) — اور چل بیچ کی چال،

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال مین متانت اور وقار نہ باقی رہے، اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدون کی نمایش[2]

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ)، [2] دیکھو ابن جریر طبری اور روح المعانی،

چال بن جائے،

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہین، سارے مذہبون نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اس راہ مین بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے، اور اسکو اچھا نہین سمجھا ہے کہ دوسرون کو دے کر تم خود اتنے محتاج بنجاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آجائے، اور محتاجون مین ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ	اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن مین باندھ لے، اور نہ اسکو
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا	بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ
مَّحْسُورًا، (بنی اسرائیل-۳)	بنکر تھکا ہارا،

مسلمانون کی اخلاقی خصوصیتون کے سلسلہ مین کہا،

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ	اور جو خرچ کرین تو فضول خرچی نہ کرین اور نہ بہت
يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا، (فرقان-۶)	تنگی کرین، اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے،

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو،

صحیح بخاری مین ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا،

اکلفوا من الاعمال ما تطیقون،	اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو،

"عمل" کا لفظ گو یہان عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد، نماز روزہ وغیرہ عبادتین ہین[1]، مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہین بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزاز مین حضرت حذیفہ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا[2]،

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۱، [2] بروایت کنز العمال جلد ثانی صک حیدر آباد دکن،

ما احسن القصد فی الغنی، ما احسن القصد فی الفقر، ما احسن القصد فی العبادۃ، دولتمندی مین درمیانگی کتنی اچھی ہے، محتاجی مین درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت مین درمیانگی کتنی اچھی ہے

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہوجائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولتمند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہین کہ اعتدال سے خارج ہوجاتے ہین، اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہوجاتے ہین کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہین، اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونون حالتون مین اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت مین نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہئے، نہ محتاجی کی حالت مین اپنی حیثیت سے گرجانا چاہئے،

عبادت سے بڑھ کر اسلام مین کوئی نیکی کا کام نہین، اسلام نے اس مین بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندون کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہوجائے، حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت مین کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انھون نے جب راتین نمازون اور دن روزون مین بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلعم نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمھارے ذمہ اور بھی حق ہین،

خودداری
یا
عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے، زندگی میں اس کے موقع کثرت سے پیش آتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائیگا، اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہونگے، اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا،

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اُس بلند و برتر ذاتِ الٰہی میں ہے، جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عزیز[1] لیا گیا ہے، عزیز کے معنی ہیں، عزت والا اور غالب کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے،

---

[1] عزت کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عسرت و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائینگے جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے کہ کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اسکو کوئی دبا نہ سکے، (دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورۂ بقرہ و نساء و ص و منافقون)

اس لئے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو، اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانون کی دوستی کا دم بھرتے تھے، اور اُدھر کافرون کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے اُن کی دوستی کے بھی طلبگار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی مین کھول دیا،

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَ هُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۔ (نساء - ۲۰) کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہین، تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے،

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے،

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا (فاطر) جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے،

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ، (آل عمران - ۳) (اے خدا!) تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے،

ایک دفعہ ایک غزوہ مین منافقون کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معزز ان ذلیل لوگون یعنی مسلمانون کو یا (نعوذ باللہ) محمد (رسول اللہ صلعم) کو نکال دینگے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب مین فرمایا،

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (منافقون - ۱) اور عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کیلئے اور ایمان والون کے لئے لیکن منافق نہین جانتے،

اس آیت پاک نے مسلمانون کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی، اس لئے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہئے، اور اسی لئے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بنکر دنیا کے سامنے آنا چاہئے، تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت صلعم نے منظور فرما لیا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ اُن کے اندر کام کر رہا تھا حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ صلعم کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہین ہین، ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے" عرض کی تو پھر ہم یہ مذہبی

ذلت کیون برداشت کرین؟ ارشاد ہوا مین خدا کا رسول ہون، اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہین کر سکتا، حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہان تک کام کر رہی تھی، رسول خدا صلعم کی نظر اس کے بہت آگے تھی اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا،

غزوۂ خندق مین آنحضرت صلعم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لئے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصارؓ کے سردارون کو بلا کر آپ نے مشورہ کیا، تو انھون نے عرض کی،

یارسولؐ اللہ جب ہم بتون کی پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو اُن کو ہم سے لینے کی ہمت نہین ہوئی، اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے، اور اس کے اور حضور کے بدولت ہم عزت پا چکے ہین، ہم ان کو یون اپنا مال دینا منظور کرینگے، خدا کی قسم ہمین اس معاہدہ کی ضرورت نہین۔[1]

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ مین قیصر و کسریٰ کے مقابلہ مین صف آرا تھے ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے دربارون مین بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جبتک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیون اور اولوالعزمیون کا باعث تھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے، اور ہر وقت اس کے کان مین یہ آواز آتی رہتی ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، — تم بہترین امت ہو جو لوگون (کی سربراہی) کے لئے ظہور مین لائی گئی،

(آل عمران — ۱۲)

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہین کہ آپ مین غرور ہے فرمایا غرور نہین، خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہین اور وہ دولت ہے جس کے

[1] مجمع بحار، باب الشرو طعافی المهادنہ۔ [2] طبرانی بحوالہ تاریخ طبری ذکر وفد (جواب غیبت)

ساتھ مفلسی نہین"۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (منافقون-۱) ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولین کیا مین مسلمان نہین، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہین، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہین"۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہین کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے، کہ وہ فانی باتون کی پستی مین نہ پڑجائے، اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کرجانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپرے جانے کو کہتے ہین[1]۔

یہ خودداری عین شرافت ہے جس مین یہ خودداری نہین، لوگون کی آنکھون مین اُس کا وقار نہین، اس وقار اور خودداری کے لئے اگر ہاتھ مین قدرت نہ ہو، یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتون سے اعراض اور درگذر کرنا پڑتا ہے۔

قرآن مین سچے مسلمانون کے وصف کے سلسلہ مین ہے،

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا، اور جب وہ ہو نکلین بیہودہ باتون کی طرف سے تو گذر جائین شریفانہ، (فرقان-۶)

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ، اور خودداری کی شان سے گذر جائین کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہون، اور نہ ان شریرون کو اونھین اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے،

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنک ظرفی یا غرور و نمائش کی بو تک نہ آئے یعنی اس مین اپنی بڑائی اور دوسرون کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو یہی چیز ہے، جس سے خودداری، غرور اور نمائش مین فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "جس شخص کے دل مین ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا" اس پر ایک شخص نے کہا کہ "مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون کی آیت وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ کی تفسیر مین لکھے ہین،

مطلب یہ کہ یہ تو غرور مین داخل نہین، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگون کی تحقیر کیجائے[1]۔

اسلام مین صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسرون کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے، تو فرمایا "کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟" ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا "کیا کپڑے دھونے کے لئے اس کو پانی میسر نہ تھا؟" ایک شخص آپ کی خدمت مین نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا "تمھارے پاس کچھ مال ہے"؟ اس نے کہا "اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام سب کچھ ہین" ارشاد ہوا کہ "جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل واحسان کا اثر تمھارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے[2]"۔

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے اسی لئے اسلام نے ہر حالت مین وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے،

اِذا سمعتم الاقامة فامشوا الی الصلاة	جب تم اقامت سنو تو نماز کے لئے سکون اور وقار
وعلیکم بالسکینة والوقار ولا تسرعوا[3]	کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو،

لوگون کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع مین جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہین تو بے تحاشا بھاگتے ہین کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلعم نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار مین داخل ہے،

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس مین بہت سی چیزین شامل ہین، ابوداود نے کتاب الادب باب الوقار مین یہ حدیث نقل کی ہے،

الھدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد	نیک طور طریق، نیک انداز، اور میانہ روی نبوت

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الکبر، [2] ابوداود کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان [3] بخاری کتاب الصلوٰة باب لا یسعی الی الصلاة ولیأتها بالسکینة والوقار،

جاذءٍ من خمسة وعشرين جزءً من النبوة کے پچیس اجزاء مین سے ایک جزء ہی،

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیون کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے، اور وہ خود بھی ان خوبیون کے بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کرکے خوددار بنتا ہے،

صحیح بخاری مین ایک اور لفظ "دَلّ" کا ہے، اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہین کہ انسان رفتار، گفتار، شکل و صورت، وضع و لباس اور اپنی عام روش مین باوقار رہے اور نیک مسلمانون کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل مین نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا "وقار" بولے "خداوندا میرے وقار کو اور بڑھا" [1]

فقر و فاقہ کی حالت، یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح مین تعفف اور استعفاف ہے، اور شریعت مین وہ ایک قابلِ ستایش اخلاقی وصف ہی، اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے،

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	(خیرات تو) اُن حاجتمندون کا حق ہے جو اللہ کی راہ
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	مین گھرے بیٹھے ہین، ملک مین کسی طرف کو جانہین
الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ	سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے انکو
بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا،	غنی سمجھتا ہی، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے
	ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہین) وہ
(بقرہ ۔ ۳۷)	پست کر لوگون سے نہین مانگتے،

اس آیت مین فقر و فاقہ کی حالت مین خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے

[1] ادب المفرد باب الختان للکبیر

بعض فقروں کی تفسیر سے ہوسکتا ہے، صاحب کشاف نے "لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں" لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اُن کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں اُن کو دولتمند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی؟ اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کرکے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے، اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لئے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا" یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوا دی تھی، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے رسول اللہ صلعم سے کچھ مانگا، آپ نے دیدیا، پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ "میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶ و ۵۲۷۔

خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا؛"

فقر و فاقہ کی حالت مین عام آدمیون سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہو کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانون کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دور نہین ہوتی لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے خواہ فوری مال کے ذریعہ سے"

روزمرّہ کے معمولی کامون مین لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہین جانتے لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتون مین بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھدو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہین معلوم ہوتا لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچیگا، اسی لئے کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستون سے بھی احتراز کیا جائے،

ایک بار رسول اللہ صلعم نے کچھ لوگون سے چند باتون پر بیعت لی جنمین ایک بات یہ تھی،

لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا، تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا،

ان مین سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہین کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلعم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ نے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہین دی، پھر فرمایا کہ اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو[1]، صالحین کی تخصیص غالباً اسی لئے کیگئی ہے، کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کرین گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دین گے،

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے، جس کے مقابلہ مین ساری نعمتین اور دولتین ہیچ ہین، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہین کرتا، وہ کسی کے

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف مین یہ کل حدیثین ہین،

سامنے نہین جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہین پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لئے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لئے ہے، اور اس کے واسطے سے مسلمانون کے لئے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے، اور اسی فیضِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہین تو یہ کہکر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہین کہ مسلمان ہوکر ایسا کرتے ہو؟ گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے، جس کے برقرار رکھنے کیلئے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیئے،

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہین جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ ترکِ احتشام، تکلف و تصنع، اور جاہ و حشم کی نمایش کا نام نہین، بلکہ یہ ہو کہ نفس کے تواضع، اور دل کی خاکساری کیساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اسکو اتنا اونچا کردے کہ اگر وہ غریب مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ مین سربلند رہے، اور اگر وہ صاحبِ امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کیلئے ظاہری نمایشی چیزون کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیون سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جارہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالارِ اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ مسلمانون کو لیکر استقبال کو نکلے جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہان کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اُتر آئے، پاؤن سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لئے، اور ناقہ کی مہار پکڑکر پانی مین گھسے، اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیون کے مقدس شہر مین داخل ہونے کیلئے بڑھا حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی یا امیرالمؤمنین آپ یہ کیا کررہے ہین، کہ موزے اُتار کر آپنے کندھے پر ڈال لئے ہین اونٹنی کی نکیل آپکے ہاتھ مین ہو اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑکر اسکو پانی مین لے چل رہے ہین، یہ وہ موقع ہو کہ سارا شہر آپکے دیکھنے کو امنڈ آیا ہو، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو مین اسکو سزا دیکر امتِ محمد صلعم کیلئے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہمکو دی ہو اسکو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہینگے تو خدا ہمین ذلیل کریگا۔

سلہ مستدرک حاکم جلد اول ص۶۲ کتاب الایمان علی شرط الصحیحین،

شجاعت اور بہادری

قَدِیر (قدرت والا) قَادِر، مُقْتَدِر، قَوِی، جَبَّار (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قَاهِر (جو ہر کوئی کو دبا دے) غَالِب اور عَزِیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہین، جب کسی بندہ مین ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس مین اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے،

تمام مذاہب مین اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروون مین شجاعت وبہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگون مین یہ خیال پیدا تھا، کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خونریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لئے یہ مٹانے کے قابل ہے لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہین، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لئے تعلیم محمدی نے بہادری وشجاعت کو سراہا، اور اس کے موقعون کی تعیین کی، کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لئے کام مین لانا چاہئے کیونکہ اگر نیکون مین یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام، اور باطل قوتون کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکین، اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیاب ہو سکے،

اُن مسلمانون کی جو سختیون اور مصیبتون کا بہادرانہ مقابلہ کرین اور لڑائیون مین دادِ مردانگی دین، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ (بقرہ ۔ ۲۲)

اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہین، وہی لوگ ہین جو سچے ہوے اور وہی متقی ہین

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راستباز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے، اور جب وہ ایسا کرگذرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راستباز اور سچا ٹھہرتا ہے، اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا	اے ایمان والو جب تم کافروں سے میدان جنگ
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ، (انفال-۲)	میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو،

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "ایمان والے" کہکر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی "ایمان" مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا،

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا	اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی
لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ	پیچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملتا ہو، تو وہ
بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَ	اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،
بِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (انفال-۲)	اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے،

یہ تو سلبی تعلیم تھی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہئے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایجابی حکم دیتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا	اے ایمان والو جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو
(انفال-۲)	ثابت قدم رہو،

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم مین سے سوا ے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو، اپنی جگہ سے نہ ہٹے،
مسلمانون کی تعریف مین فرمایا کہ وہ کافرون کی قوت کو کبھی خاطر مین نہین لاتے،

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (فتح - ۴) وہ کافرون پر زورآور ہین،

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت مین زورآور زورمند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک
مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفون کے مقابلہ مین طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے،

اور آیت مین ارشاد ہے،

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ اَللّٰهُ یَعْلَمُھُمْ (انفال - ۸)

اور اُن کے لئے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا، تیار رکھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنون اور اپنے دشمنون کو اور دوسرون کو جنھین تم نہین جانتے اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو،

اس قوت کے لفظ کی تفسیر اُس زمانہ کے سامانِ جنگ و قتال سے کی گئی ہے،[۱] مثلاً قلعون کی تعمیر اور تیراندازی مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ بعض مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے، اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس مین داخل کیا ہے،[۱] غرض اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور اُن کے استعمال کے طریقون کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن اُن کی تیاری سے مرعوب اور خوفزدہ رہین، اور اُن سے معاہدہ کرکے توڑنے کی ہمت نہ کرسکین،

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ مین سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی، متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحیِ الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا،

---

[۱] تفسیر طبری آیت مذکور،

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ، (انفال-۱)	گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہین اور وہ دیکھ رہے ہین،

سورۂ احزاب مین منافقون کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے،

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ، (احزاب-۲)	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہین، اُن کی آنکھین گردش کھاتی ہین جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے،

سورۂ محمد مین ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے،

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ، فَاَوْلٰى لَهُمْ ؕ (محمد-۳)	جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہوا اس مین لڑائی تو تو ان کو جن کے دلون مین روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہین تیری طرف، جیسے ٹکٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے، سو خرابی ہو ان کی،

ایک اور آیت مین یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا،

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ، وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ، كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ، يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ (منافقون-۱)	اور جب تو انھین دیکھے، تو اُن کے بدن اچھے معلوم ہون، اور اگر بولین تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیان ہین، جو کوئی چیخے سمجھین ہم ہی پر کوئی آفت آئی،

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہین بلکہ دل کی طاقت سے ہے، جس سے منافق محروم ہین، دیکھنے مین تو اُن کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوے خوبصورت معلوم ہوتے ہین، مگر دل کی کمزوری کا یہ عالم ہے، کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھین، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی ٹھونٹھ

ٹیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے مین تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہین، مگر چونکہ ان کی جڑین مضبوط نہین اس لئے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آرہتے ہین،

اسلام اپنے پیرؤون مین شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گو اس مین مادّی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہین ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہین کی ہے، اسی لئے اوپر کی آیت مین دیکھئے، کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے، کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی روح سے خالی ہے، اس لئے اُن مین شجاعت اور بہادری نہین، اسی بنا پر وہ اپنے پیرووں مین شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہین،

۱- جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اُس کے حکم کے بغیر کچھ نہین ہوسکتا، اس لئے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہین، صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہئے،

۲- ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہین سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہین سکتا،

۳- خدا کی راہ مین مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا مین مارا نہین گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابون کا مستحق ہے،

تعداد کی قلت وکثرت

تعداد کی قلت وکثرت پر جدّ و جہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہین، بلکہ جدو جہد کرنے والون کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس مین ایمان و یقین کی قوت موجود ہے تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ مین قرآن نے ان مختصر لفظون مین سمجھا دیا ہے،

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً — کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج

بِإِذۡنِ اللّٰهِ، (بقرہ - ۳۳)	پر غالب آگیا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں، تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑینگے، اِنَّ فِیۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ، (مائدہ - ۴) "اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے" اس وقت اُن کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں،

فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ وَعَلَى اللّٰهِ	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤگے تو تم ہی
فَتَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ، (مائدہ - ۴)	غالب ہو، اور اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو،

بدر اور اُحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا،

وَلَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـًٔـا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ تعداد میں بہت
وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ، (انفال - ۲)	ہو، اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے،
فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بیشک
يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ۝ اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ	اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری
فَلَا غَالِبَ لَـكُمۡ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ	مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا، اور اگر وہ تم کو
ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ وَعَلَى	چھوڑ دے گا، تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا،
اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ، (آل عمران - ۱۷)	اور مومنوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں،

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے،

وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے، بیشک
عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ، (انفال - ۱)	اللہ غالب حکمت والا ہے،

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لئے خوشخبری سنا دی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے

کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہون گے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ	اے پیغمبر! مومنون کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانون
إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا	مین سے بیس صابر (ثابت قدم) ہون تو وہ دو سو
مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا	پر غالب ہون، اور اگر تم مین سے سو ہون تو ہزار کافرون پر
مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (انفال-۹)	غالب ہون، کیونکہ وہ سمجھ نہین رکھتے،

ثابت قدم مسلمانون کے غالب آنے اور کافرون کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانون کے دل مین خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے، اور کافرون کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہین،

اس کے بعد اس آزمایش کی سختی مین تھوڑی نرمی کردی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے، اور اس کے قدم نہ ڈگمگائین،

فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہین تو دو سو پر غالب
مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا	ہون، اور اگر تم سے ہزار ہون تو دو ہزار پر بحکم خدا
أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال-۹)	غالب ہون، اور اللہ صابرون کے ساتھ ہے،

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانون مین پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی مین دو کافرون پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین و ایمان کے بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہین کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسا رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافرون کے دلون مین اُن کا وہ رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	ہم کافرون کے دلون مین (تمھارا) رعب ڈال
(آل عمران-۱۶)	دین گے،

سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ، (انفال) مین کافرون کے دلون مین (تمھارا) رعب ڈال دونگا

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جنکو اپنے قلعون اور لڑائی کے سامانون پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانون سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے،

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ، (احزاب-۳) اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب ڈال دیا،

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ، (حشر-۱) اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب ڈال دیا،

اور جب تک مسلمانون مین ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہیگا،

موت کا وقت مقرر ہے انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے، اور نہ بلائے آسکتا ہے، اس لئے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہین ہے،

وحیِ محمدی نے مسلمانون کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہانتک کہ یہ چیز مسلمانون کی رگ رگ مین سرایت کر گئی ہے، غزوۂ اُحد مین مسلمانون کے پاؤن اُٹھ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی، اور اس عقیدہ کو یاد دلایا،

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا (آل عمران-۱۵) اور کسی جان کے بس مین نہین کہ اللہ کے حکم سوا وہ مر سکے، لکھا ہوا وقت مقرر ہے،

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیون ہو، اور اس سے بزدلی کیون چھائے،

جنگ احزاب مین جب منافقون کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا،

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ، (احزاب-۲) (اے پیغمبران سے) کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا،

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی مین شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے، جن کی قسمت مین یہان موت لکھی تھی وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا،

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ (اے پیغمبران سے) کہدے کہ اگر تم اپنے گھرون مین

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ، (آل عمران-۱۶)

ہوتے تو بھی جنکا مارا جانا لکھا جاچکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آجاتے،

یہ سمجھنا کہ ہم چونکہ لڑائی مین شریک ہوئے اس لئے مارے گئے، یون بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ مین ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانون سے کہا گیا کہ تم کافرون جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہین،

لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ (آل عمران-۱۷)

اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، (اور یہ خیال اسلئے ان کے دل مین آتا ہے) تاکہ اللہ اُن کے اس خیال کو اُن کی دلی حسرت بنائے، اور (واقعہ تو یہ ہو کہ) اللہ جِلاتا اور مارتا ہے

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہین کہ اگر یہ مقتول لڑائی مین نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہون تو ٹال لین،

قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ، (آل عمران-۱۷)

اگر تم سچے ہو تو اپنی جانون سے موت ہٹا تو لو،

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کرکے اُن کی تشفی کی گئی،

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ

پھر جب اُن کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہان ان مین سے ایک گروہ لوگون سے ایسے ڈرنے لگے، جیسے خدا سے ڈرتے ہو، یا اس سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیون فرض کی ہم پر لڑائی، کیون نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی، (اے پیغمبر)

لِمَنِ اتَّقٰی وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا، اَیْنَ مَا	جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگار
تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ	کے لئے بہتر ہے، اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا
بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ،	جہان تم ہوگے، موت تم کو پالے گی، اگرچہ تم مضبوط
(نساء - ۱۱)	قلعون مین ہو،

غرض کہین بھی تم جاکر رہو موت سے چھٹکارا نہین، پھر میدانِ جنگ سے تم کیون گھبراؤ، بلکہ اُن مجاہدون کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سنکر اور تازہ ہو جاتا ہے،

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ	وہ جن سے لوگون نے کہا کہ تم سے لڑنے کیلئے لوگون نے
قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ	بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو، تو اس نے
اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ	ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا، اور بول اٹھے کہ ہم کو
(آل عمران - ۱۸)	خدا کافی ہے، اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے،

شہادت اور غزا کا رتبہ میدانِ جہاد مین شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع و قمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدون کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ مین بکا ہوا ہے، اور وہان اُن کے لئے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہان کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے،

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ	اللہ نے مسلمانون سے اُن کی جانون کو اور مالون
وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ	کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ اُن کے لئے جنت
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ،	ہے، اللہ کی راہ مین لڑتے ہین، پھر مارتے ہین اور
(توبہ - ۱۴)	مارے جاتے ہین،

اس سے پہلے سورۂ نسا مین اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لئے دنیا کا سودا کر چکے ہین، اعلان ہے،

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ — تو جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہین وہ اللہ کی

الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ — راہ مین لڑین، اور جو اللہ کی راہ مین لڑے پھر مارا جائے

فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا (نساء) — یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دینگے،

اُن کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائین گے،

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَاُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ — تو جو لوگ، اپنے وطن سے چھوٹے، اور اپنے گھرون

وَاُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا — سے نکالے گئے، اور میری راہ مین ستائے گئے، اور

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ — لڑے اور مارے گئے، اتارون گا اُن سے ان کی

جَنّٰتٍ، الآیۃ (آل عمران-۲۰) — برائیان، اور داخل کرونگا اُن کو جنت مین،

شہیدون نے اس راہ مین اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ اُن کی زندگی تھی، وہ اُن کو از سرِ نو اسی وقت دے دی جائیگی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کا کہ شہید مرجاتے ہین ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور کہدیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہین،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ — اور جو خدا کی راہ مین مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ

اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ — زندہ ہین اپنے رب پاس روزی پاتے ہین، خدا نے

فَرِحِينَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران-۱۷) — اُن کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہین،

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہین سکتے پھر بھی اُن کو زبان سے بھی مردہ نہین کہنا چاہیئے،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ — اور جو خدا کی راہ مین مارے جائین اُن کو مردہ نہ کہو

اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ (بقرہ ۱۹) — بلکہ زندہ ہین لیکن تم کو اس کی خبر نہین،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات انھین کے لئے ہین، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ مین صرف خدا کی خوشنودی

کے لئے لڑتے ہون، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض وغایت کو اتنا اونچا کر دیا ہو کہ وہ ذاتی خود غرضیون اور نفسانی غیظ وغضب، اور بہادری کی نیکنامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کردی گئی ہو، اگر کوئی مال کے لئے کسی کو قتل کرے، تو یہ کافرون کی سی جاہلانہ بات ہوگی، فرمایا،

تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سو اللہ کے پاس بڑا
مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ، كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ	مالِ غنیمت ہے، تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا،	تو خدا نے تم پر فضل کیا، (یعنی اسلام بخشا) تو اب
(نساء - ۱۳)	تحقیق کر لیا کرو،

رسول اللہ صلعم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کیلئے لڑتا ہو، ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ مین اس کی پامردی کی نمایش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمایش کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ و انتقام کے لئے لڑتا ہو، تو آپ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا،

من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ اعلیٰ فھو فی	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لئے
سبیل اللّٰہ[1]	لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ مین ہو،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک شخص سے قیامت کے دن اُس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا، تو وہ کہیگا کہ اے خدا مین نے تیری راہ مین جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہیگا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لئے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ، سو تم اپنا اجر پا چکے، اور دنیا مین تم کو بہادر کہا جا چکا[2]، غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمایش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد مین اعلاء کلمۃ اللہ کیساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اسکو

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ، [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار، و جامع ترمذی،

برا نہین کہا ہے[1]، کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے،

یہی وجہ ہو کہ اسلام نے جہاد کے میدان مین کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤن کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث مین ہے کہ بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے[2]، کیونکہ اس سے دشمنون پر رعب و داب قائم ہوتا ہے، اور دوستون مین مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے، ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ مین کہا "لو مین ابن اکوع ہون" حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح مین لکھتے ہین،

"یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہی جس کی ممانعت کیگئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی مین جائز ہے، اور دوسرے موقعون پر جائز نہین[3]"

غزوۂ حنین مین جب مشرکین نے رسول اللہ صلعم کو گھیر لیا تو آپنے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ مین فرمایا

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب، — مین پیغمبر ہون، جھوٹ نہین، مین عبد المطلب کا بیٹا ہون[4]

یعنی مین سچا پیغمبر ہون اس لئے میدان سے نہ بھاگون گا نہ ہٹونگا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیرون کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلعم نے اپنی جگہ سے جنبش نہین فرمائی،

صحابہ کہتے ہین کہ ہم مین سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلعم کے پاس کھڑا ہوتا تھا، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ[5]

رسول اللہ صلعم نہایت بہادر تھے، ایک بار اہل مدینہ کے دلون مین کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تھے، آپ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے، اور واپس آکر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہین[6]" ایک موقع پر جب بدویون نے آپکو عطیہ کیلئے گھیر لیا تو آپنے فرمایا کہ تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے[7]"۔ بزدلی اسلام مین ایسا سخت اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیئے

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور، [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب، [3] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۲۳، [4] صحیح بخاری غزوۂ حنین، و کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلعم، [5] صحیح مسلم باب غزوۂ حنین [6] صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الحمائل تعلیق السیف بالعنق،

رسول اللہ صلعم نے اپنی دعاؤن مین جن چیزون سے پناہ مانگی ہے اُن مین بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت مین ہو کہ رسول اللہ صلعم بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے، دوسری روایت مین ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد ان چیزون سے پناہ مانگتے تھے[1] ایک روایت مین ہے کہ انسان مین سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے[2]،

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا اُس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو[3] اسی خط مین آنحضرت صلعم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانون کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ[4] یقین کرو کہ بہشت تلوارون کی چھاؤن مین ہے،



[1] بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأۃ والجبن [3] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [4] ایضاً باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف وباب کان النبی صلعم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال،

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے" یا "سیدھا چلے چلنے" کے ہیں، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے، اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے،

آنحضرت صلعم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ	کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی طرف سیدھے
وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۔ (حٰمٓ السجدہ - ۱)	رہو، اور اس سے گناہ بخشواؤ،

یعنی ہماری عبادتیں، اُسی ایک کے لئے ہوں، اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھر اودھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جناب رسالت مآب صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے، کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بھکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو،

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور
وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	جس نے توبہ کی تیرے ساتھ، اور حد سے نہ بڑھو کہ
(ھود - ۱۰)	وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے،

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ہے، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے، اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی

ہے، اس موقع پر رسولِ اسلام علیہ السّلام اور آپ کے ساتھ مسلمانون کو اعلانِ حق، اور حق پر استقامت کی تاکید پر تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو، اور ثابت قدمی دکھاؤ، اور مخالفون کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو،

فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ	پس اسی کی طرف بلا، اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمایا
وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ، (شوریٰ-۲)	اور ان کی خواہشون کے پیچھے نہ چل،

ایسے ثابت قدمون کو جنھون نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمھارے ہی لئے ہے، وہ دن آئیگا جب نہ تمھین کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا،

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	بے شک جنھون نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے،
فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ،	پھر وہ (اس پر) جمے رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور
(احقاف-۲)	نہ وہ غم کھائین گے،

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہون گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہان حاصل تھا، وہان تسکین و تسلّی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدمون کے کانون مین انکی استقامت کی مزدوری مین فرشتون کی بشارت سنائی دیگی،

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	بے شک جنھون نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے
تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا	پھر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہین کہ خوف اور
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ	غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم
تُوْعَدُوْنَ، (حٰمٓ السجدہ-۴)	سے وعدہ تھا،

ان ہی آیتون کی شرح مین اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہین کہ یا رسول اللہ صلعم

مجھے کوئی ایسی بات بتائے کہ مین اُس سے چمٹ جاؤن، ارشاد ہوا کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ، صحابہؓ نے ان نصیحتون پر جس استقامت کیساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے، مگر اُن پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت اور آفرین کی صدائین بلند ہو رہی ہین، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ مین ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا،

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ	جب کفار کی متحدہ فوجین تمھارے اوپر سے اور
مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ	تمھارے نیچے سے آئین، اور جب ڈگنے لگین آنکھین
الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا	اور دل گلے کو آنے لگے، اور تم اللہ سے طرح طرح
هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا	کے گمان کرتے تھے، وہان ایمان والے جانچے گئے،
زِلْزَالًا شَدِيْدًا، (احزاب-۲)	اور خوب جھڑجھڑائے گئے،

اس کے بعد اس موقع پر منافقون نے جو کمزوری دکھائی، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا	اور جب ایمان والون نے کفار کی ان متحدہ فوجون
هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ	کو دیکھا، تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا
صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ	تھا، اللہ اور اس کے رسول نے، اور اللہ اور اُسکے
اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا،	رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین
(احزاب-۳)	اور اطاعت مین اور بڑھا دیا،

اس کے بعد جن مسلمانون نے اس قسم کے خطرون مین اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا	ایمان والون مین بعض وہ مرد ہین جنھون نے خدا
اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ	سے جس چیز کا عہد کیا، اس کو سچ کر دکھایا، تو ان مین

وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۔ (احزاب - ۳) | کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان مین وقت کی راہ دیکھ رہا ہے، اور انھون نے ذرا بھی نہین بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ مین جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے، اور بعض ابھی زندہ ہین، اور اوس دن کی راہ تک رہے ہین جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دینگے، اور ان تمام خطرون کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انھون نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا،

حق کی راہ مین مشکلات کا پیش آنا، اور اس مین مردان خدا کی استقامت کی آزمایش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہیگا، اور جب تک اس مین کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہین اترتی کامیابی کا منھ نہین دیکھتی، فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (بقرہ - ۲۶)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت مین چلے جاؤ گے، اور ابھی تم پر تم سے پہلون کے احوال نہین آئے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی، اور جھجھڑائے گئے، یہانتک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی، سُن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے،

پہلون کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہین ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا، اور آخر کامیاب ہوا، اور اس عالم مین اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (بقرہ - ۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم مین ڈالدے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤن اور اس کافر قوم کے مقابلہ مین ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث[1] و سیر مین ہے کہ یمن مین حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے یہودیون نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفین دین، اور آخراُن کو گڈھا کھود کر آگ مین جھونک دیا، مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے،

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ، النَّارِ ذَاتِ	مارے جائیو کھائیان کھودنے والے آگ بھری
الْوَقُوْدِ، اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ، وَّهُمْ	ایندھن سے، جب وہ اس (گڈھے کے منھ) پر بیٹھے
عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ،	تھے، اور جو کچھ وہ ایمان والون کے ساتھ کر رہے تھے
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	دیکھ رہے تھے، اور وہ ان سے بدلا نہین لیتے تھے
الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ،	مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیون والے خدا پر ایمان
(بروج - ۱)	لے آئے تھے،

اگلون کی استقامت کے اُن احوال مین سے جنکو محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح مین نقل کیا ہے، خبابؓ بن ارتّ صحابی کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلعم سے اپنی مصیبتون کا حال عرض کیا، اور درخواست کی کہ ہمارے لئے دعا کیجئے چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیتابی کا اظہار تھا، اس لئے آپنے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگون مین ایسا مرد بھی ہوا ہے، جس کو زمین مین گاڑ دیا جاتا تھا، اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگردان نہین کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیون سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچکر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا[2]

رسولِ اسلام علیہ السّلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپکے ساتھیون پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہین، ان ہی خبابؓ بن ارتّ کا جو اس روایت کے راوی ہین یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم مین اُن کو طرح طرح کی تکلیفین دی جاتی تھین، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا، اور ایک شخص اُنکی

[1] صحیح مسلم و سیرۃ ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود، [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام،

چھاتی پر پانوں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہانتک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہوگئے حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی، تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگدل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا،

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان اُن کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسی باندھکر زمین پر گھسیٹے جاتے، اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اُس وقت بھی ان کی زبان سے اَحد اَحد (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہین، مگر خدا کی راہ مین جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہین، خود آنحضرت صلعم کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا ابوطالب کے جواب مین کہا تھا، اوسکی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان مین سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا! چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ مین سورج اور بائین ہاتھ مین چاند بھی دیدین تب بھی مین اس دینِ حق سے باز نہ آؤنگا،

خود مسلمانون کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ مین مرجائے، یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو الٹے پاؤن پھر جاؤگے؟ نہین حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہین، اُس کا ساتھ تم اس لئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے،

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ	اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے
قَبْلِهِ الرُّسُلُ، أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ	رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مرگیا یا مارا گیا تو تم الٹے
انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	پاؤن پھر جاؤگے، اور جو الٹے پاؤن پھرے گا وہ
عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللهَ شَيْئًا، (آل عمران ۱۵)	اللہ کا کچھ نہین بگاڑے گا،

پھر اگلی امتون کا حال سنا کر تسلی دی جاتی، اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے،

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّوْنَ	اور کتنے پیغمبر ہین کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے
كَثِيْرٌ، فَمَا وَهَنُوْا لِمَا أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ	لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ مین کچھ دکھ پڑا تو

اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰہُ — ہمت نہین ہارے اور نہ کمزور ہوے، اور نہ دب گئے،

يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ . وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ — اور اللہ ثابت رہنے والون کو پیار کرتا ہے، اور نہ

اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ — تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے لیے

اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا — گناہ اور ہم سے اپنے کام مین جو زیادتی ہوئی اس کو

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ . (آل عمران ۱۵) — بخشدے، اور ہمارے قدم جمائے رکھ، اور ہم کو کافر قوم پر

سچے اور مخلص مسلمانون کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیئے،

اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال مین کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے، اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری، اور اُس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کامون مین سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف اُن مسلمانون کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہین، فرمایا،

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ — لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہین

دَآئِمُوْنَ ، (معارج-۱) — (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے ہوتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلعم نے بار بار اسکی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلعم کو کونسا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کیجائے[1]" خود آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو[2]

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل،

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے جس طرح میدانِ جنگ مین دونون طرف کی مسلّح فوجین ایک دوسرے کے مقابل مین ہاتھ پانون سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہین، بعینہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے، تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت مین جوآواز بلند کیجاتی ہے اُسی کا نام حق گوئی ہے،

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستایش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابلِ ستایش حقگوئی کی تعلیم دی ہے، اور خود رسول اللہ صلعم کو حکم دیا ہے

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ	پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنادو اور
إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ الَّذِيْنَ	مشرکین کی مطلق پروانہ کرو، ہم تم کو تمھاری ہنسی اڑانے
يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (الحجر - ۶)	والون کے مقابلہ مین جو خدا کے ساتھ دوسرے دوسرے
	معبود قرار دیتے ہین، کافی ہین،

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گذرگیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آگیا، اس لئے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو، اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائین تو اُن کے تمسخر و استہزار کی مطلق پروانہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ مین اللہ تعالیٰ بس ہے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمین ہین، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے، جس کو اس آیت مین بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت مین اسکو مسلمانون کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے،

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، (مائدہ-۸)	یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہین ڈرینگے،

یعنی اہلِ ایمان حق کے اظہار مین لوگون کے لعن وطعن کی پروا نہین کرتے،

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزون کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل مین ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث مین ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلعم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہئے کہ انسانون کا خوف مانع نہ ہو، ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم مین کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اُس کو خدا کے بارے مین ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہیگا، کہ تم کو میرے متعلق فلان فلان بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہیگا کہ انسانون کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا،

انسانون کے مختلف گروہون مین سب سے زیادہ ہیبتناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہون کی ہوتی ہے اس لئے اُن کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ	بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے،

دوسری روایت مین "کلمہ حق" کا لفظ ہے،

اسلام مین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہین اُن مین دوسرا درجہ اسی حقگوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہین نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہین دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا، رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد مین نے سنا ہے کہ "تم مین جو شخص برائی دیکھے اور اُس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹادے ورنہ زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"[1]

صحابہ مین حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حقگوئی مین بدرجہ کمال تھا، یہ وہی تھے، جنھون نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفارِ قریش کے بھرے مجمع مین حرم مین جاکر توحید کا نعرہ بلند کیا، اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوئے جبتک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہوگئے، لیکن اس پر بھی اُن کا نشہ نہین اترا، اور دوسرے دن پھر جاکر اعلانِ حق کیا، اور وہی سزا پائی، آنحضرت صلعم نے ان کی مدح مین فرمایا کہ "آسمان کے نیچے، اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہین"[2] چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین وہ جب شام مین تھے، تو وہان کے مسلمانون مین سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہورہی تھی، اس پر انھون نے بے محابا داروگیری، اور اس مین امیر معاویہ کی پروا انھون نے ذرا بھی نہین کی،

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس مین فرمایا "ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اُس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے"[3] یہ سنکر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہے ہم نے ایسی باتین دیکھین اور ہیبت مین آگئے"

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر مین یہ تمام حدیثین مذکور ہین، [2] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ،
[3] ترغیب وترہیب منذری ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالۂ ترمذی،

استغناء

استغناء کے معنی بے نیازی کے ہین، اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے،

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران - ۱۰) اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے،

اور اس بے نیازی مین خدا کا کوئی شریک نہین ہے، وہی ایک بے نیاز ہے، اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے،

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ (محمد - ۴) اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو،

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسرون سے بے نیاز ہو، اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئین اخلاق مین اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولون پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اُس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اُس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جسکو ہم ہر نماز مین اور نماز کی ہر رکعت مین دہراتے ہین اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے،

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، (فاتحہ) (اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہین اور تجھی سے مدد مانگتے ہین،

خدانے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کار فرما بتا کر اُن کے مضطرب دلون کو تسکین دی ہو فرمایا،

وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، (آل عمران ۱۸) اور کیسا اچھا کارساز،

وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا، (اسرائیل ۷) اور تیرا رب کارساز بس ہو،

لَا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا، (اسرائیل ۱) میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ،

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا، (نساء ۱۱) او اللہ کارساز بس ہے،

ایک آیت مین اللہ تعالیٰ اپنے بندون سے پوچھتا ہے، اَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ (زمر ۴) کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں، اس لئے کسی شاہ امیر اور دولتمند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہین،

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنار کی بنیاد ہے وہ قناعت ہے یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہو اس پر طمانیت حاصل کیجائے، اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ، (نساء ۵) اور جس چیز مین اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو،

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ (طٰہٰ ۸) اور اپنی آنکھین نہ پسار اسکی طرف جو ہم نے ان مین سے طرح طرح کے لوگون کو سامان دیا ہے،

بعض لوگ باوجود دولتمند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہین، مال و دولت سے اُن کی نیت نہین بھرتی، اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہین، اس لئے وہ باوجود دولتمند ہونے کے محتاج ہوتے ہین لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولتمند نہین ہوتا تاہم خدا نے جو کچھ اُس کو دیا ہے اُس پر قانع رہتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حرص نہین کرتا، اس لئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغنار و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہین ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے، اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ مین بیان فرمایا ہے،

لَيْسَ الغنیٰ عن کثرۃ العرض ولکن — دولتمندی مال واسباب کی کثرت کا نام نہین ہی،

الغنی غنی النفس۔ (بخاری ارقاق باب الغنی غنی النفس) — بلکہ اصلی دولتمندی دل کی بے نیازی ہی،

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظون مین ادا کیا ہے "تونگری بدل است نہ بہ مال"

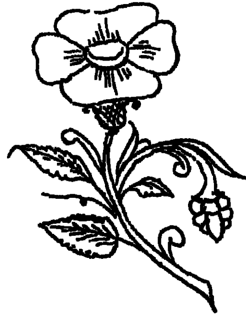
ایک اور حدیث مین اس نکتہ کو آپ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا، حضرت ابوذرؓ فرماتے ہین کہ مجھ سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ابوذر! تمھارے خیال مین مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ مین نے کہا "ہان" فرمایا تو تمھارے خیال مین مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ مین نے کہا "ہان" فرمایا "بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی[1]" اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا وتسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہین ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دیدے اگر وہ اُس پر دل سے راضی ہوجائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس مین پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی، اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمھاری قسمت مین ہے اگر تم اُس پر راضی ہوجاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہوجاؤگے[2]، ایک بار چند انصارؓ نے آپ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے اُن کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہین ہوئے، اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر اُن کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہوچکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا مین تم سے بچاکر جمع نہ کرونگا، جو شخص خودداری چاہتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے، اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کردیتا ہے[3]، اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ سے باربار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار اُن کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر مین فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے خدا اس مین برکت دیتا ہے، اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس مین برکت نہین ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہین بھرتا، اُن پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھون نے اس کے بعد

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دارالمصنفین باب الغنی غنی النفس، [2] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۴ [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف،

کسی کا عطیہ نہین قبول کیا[1]،

فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے، اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا[2] ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہین کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلعم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانون سے بے نیاز ہو جانا ہے[3]،



[1] ترمذی کتاب الزہد، [2] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ، [3] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۲۵ کتاب الرقاق،

رذائل

رذائل کے معنی رذائل (یعنی بری خصلتین) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہین جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اُس نے اپنے بندون کو دیا ہی جن کے کرنے والے اس کے حضور مین گنہگار ٹھہرتے ہین، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے، اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتون کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہین، اور اُن کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم مین عام ہو جاتے ہین تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بنجاتے ہین یعنی اُس کی دینی و دنیاوی ترقیون کی راہین مسدود، اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اُس پر بند ہو جاتا ہے،

رذائل کے قرآنی نام اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآنِ پاک مین آئے ہین، مثلاً اکثر انکو مُنکَر (ناشناسا) اور فحشاء (بیحیائی) اور کبھی فَاحِشَۃ (فحش) سَیِّئَۃٌ (برا) سُوۡٓء (برائی) مَکۡرُوۡہ (ناپسندیدہ) خَطأ (ناصواب یا بھول) اِثۡمٌ (گناہ) عُدۡوَان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظون سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہین جو عقل اور شرع دونون کی نگاہون مین بدنما ہین، فرمایا،

وَلَا تَقۡتُلُوۡٓا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ	اپنے بچون کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو، ہم ہین
نَحۡنُ نَرۡزُقُھُمۡ وَاِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَھُمۡ کَانَ	ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہہ اُن کا مار ڈالنا
خِطۡاً کَبِیۡرًا ، وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ	بڑی چوک ہے، اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہہ

كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا ۔ ۔ ۔ یہ بیحیائی، اور بری راہ ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، إِنَّكَ لَنْ — اور زمین مین اترا کر نہ چل، کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالیگا،

تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا، — اور نہ لمبائی مین پہاڑ کو پہنچ جائے گا، ان مین

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ — سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے

مَكْرُوْهًا، (بنی اسرائیل-۴) — نزدیک ناپسندیدہ ہے،

رذائل کے لئے قرآنِ پاک کا سب سے عام لفظ مُنکَر ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ مین جن برائیون کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے ان کو ایک ہی لفظ مُنکَر سے ادا کیا گیا ہے،

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط — وہ ایک دوسرے کو اُس منکر سے جو کرتے تھے روکتے

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ، (مائدہ-۱۱) — نہ تھے، کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے،

ایک بدکار قوم کی برائیان گنائی جارہی ہین، اس سلسلہ مین ہی،

وَتَأْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ، (عنکبوت-۳) — اور تم اپنی مجلس مین مُنکر کے مرتکب ہوتے ہو،

اچھے لوگون کی صفت یہ ہے،

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (توبہ-۱۴) — اور منکر سے منع کرنے والے،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (آل عمران-۱۲ و توبہ-۹) — اور منکر سے منع کرتے ہین،

اور کہین فحشاء اور مُنکر کا لفظ ساتھ آیا ہے،

فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (نور-۳) — وہ فحشاء اور منکر کرنے کو کہتا ہے،

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت-۵) — وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہی،

فحشاء، منکر اور بغی | کہین آیت مین تین لفظ جمع ہین، فحشاء، منکر اور بغی،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	(مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور
وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ	قرابت والون کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحشاء
وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ	اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے، تم لوگون کو نصیحتین
(النحل ۱۳)	کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو،

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ مین پہلے رسول اللہ صلعم کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل مین جگہ نہین پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل مین جگہ پکڑ لی[1]،

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآنِ مجید مین خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے[2]،

قتادہ کہتے ہین کہ زمانۂ جاہلیت مین جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کئے جاتے تھے، ان مین کوئی خلق ایسا نہین ہے جس کا خدا نے اس آیت مین حکم نہ دیا ہو، اور کوئی بداخلاقی ایسی نہین ہے، جس کی اس آیت مین ممانعت نہ کی ہو[3]،

اس آیت مین منہیات کے سلسلہ مین تین لفظ آئے ہین، فحشاء اور منکر اور بغی، ان مین سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے،

فحشاء کے معنی ان مین پہلا لفظ فَحْشَآء ہے جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہین[4]، اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہین، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے، قرآنِ پاک نے گناہ کے معنی مین حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہین، مثال سے یون سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباس [2] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [3] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [4] لسان العرب

حدین مقرر فرما دین، اب جوان حدون سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدّی حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا — اور جو اپنی شرمگاہون کی نگہبانی کرتے ہین لیکن

عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ — اپنی بیویون پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انھین ملامت

فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ — نہین کیجائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. (مؤمن-۱) — تو وہی حد سے بڑھنے والے ہین،

اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے، اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہوگئے ہین، قرآن نے کہا ہے،

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ — اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ "فاحشہ" (یعنی قبیح) ہے،

سَآءَ سَبِيْلًا. (اسرائیل-۴) — اور بری راہ ہے،

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جسکی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے،

منکر کے معنی — دوسرا لفظ مُنکَر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہین، مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگون مین عام طور سے پسند کیا جاتا ہے، اور جس کا کرنے والا لوگون مین ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اسکو مَعْرُوف (شناسا) کہتے ہین، اور جو کام ہر طبقہ مین ناپسند کیا جاتا ہے، اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ مُنْکَر (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہین، تو وہ کہتے ہین، قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (حجر و ذاریات) یعنی لوگ اَن جانے اور اَن پہچانے ہین، حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب اُن کے بھائی آئے تو انھون نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے، اُس موقع پر قرآن مین ہے، فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف-۷) یعنی یوسف نے تو ان کو پہچان لیا، مگر وہ اُن کو پہچان نہ سکے،

ناگواری کی حالت مین انسان کا چہرہ شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے، اور اس کے طور و انداز سے بدرجۂ ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی مُنکَر ہے، فرمایا،

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج - ۹)

اور جب ان (کافرون) کو ہماری کھلی ہوئی آیتین سنائی جائین، تو کافرون کے چہرون مین تو منکر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہین کہ وہ ان پر جو ہماری آیتین سناتے ہین، حملہ کر بیٹھین،

اس آیت مین ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ مین جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے، اس کو مُنکَر کہا گیا ہے، ان آیتون سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہین جن کو ہر شخص فطرۃً اور بداہتہً ناپسند کرتا ہے، اور اُن کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اُس پر کسی دلیل کی ضرورت نہین ہوتی، اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب مین وہ یکسان برے سمجھے جاتے ہین،

بغی کے معنی | تیسرا لفظ بَغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہین،

خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ، (ص - ۲)

ہم دو جھگڑنے والے ہین، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے،

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگون کو بے انتہا دولت دیدیجائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگین،

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِى الْاَرْضِ، (شوریٰ - ۳)

اور اگر اللہ اپنے بندون کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین مین زیادتی کرین،

اسی سورہ مین ہے،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ، (شوریٰ - ۴)

راہ ان ہی پر ہے جو لوگون پر ظلم اور زمین مین زیادتی کرتے ہین،

ان آیتون سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسرون پر زیادتی اور تعدی کے ہین،

اخلاق ذمیمہ برے کیون ہین | اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء، منکر اور بغی مین منحصر ہین، صفات

ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہین، اور ایسی باتین ہین جنکو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہین،
اور اُن کے جائز کر دینے سے دوسرون کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے،

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، (اعراف - ۴)

اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کامون (فواحش) کو جو کھلے ہون یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے،

اس آیت مین بھی رذائل کو تین لفظون مین منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہون یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام، اور تیسرے ناحق زیادتی، اُن اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکسان برا کہا ہے، اگر تحلیل کیجائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بیحیائی کے کام ہین، اور دین و شرافت کی نگاہ مین گناہ اور ناپسندیدہ ہین، اور اگر اُن کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے، اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے[1]،

رذائل کی ترتیب ان رذائل کی ترتیب دو نظریون کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت مین ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانون مین گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشاء، پھر منکر، پھر بغی،

فحشاء مین جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری مین مبتلا ہونا وغیرہ، منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی، اور بغی جماعت سے آگے بڑھکر پورے ملک و ملت کو چھالیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ،

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی، دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے وہ صفات ذمیمہ ہین جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیان ہین، جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہین، اور پھر وہ ہین جو رضائے الٰہی سے خالی ہین،

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ مین سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہون، اور جھوٹ ٹھیک اس کے ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیون کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہین جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کرسکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے، کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے، اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہین ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کررہا ہے، تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص مین دنیا کی جو برائیان بھی نہ ہون وہ کم ہی، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے، جس مین حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے،

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبرون کیلئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ	اور اس کتاب مین ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا
صِدِّيقًا نَّبِيًّا، (مریم - ۴)	سچا نبی تھا،

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہین ہوسکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا، اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا، تو اس کے ایک درباری نے جو دل مین مسلمان تھا، فرعونیون کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوت پر انکی

عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی، اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہین ہوسکتا،

اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ وَاِنۡ یَّکُ صَادِقًا — اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑیگا، اور اگر سچا ہوگا تو

یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ، اِنَّ اللّٰہَ — تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ

لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ، (مؤمن-۴) — اس کو راہ نہین دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو،

اس مین یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گذرنے مین بیباک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہین، اور کفار کے طور وطریق پر چلتے ہین،

روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار مین ابوسفیان سے جو باتین پوچھی تھین ان مین ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، ابوسفیان نے جواب دیا نہین، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہین باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ یہ نہین ہوسکتا،[1]

قرآن پاک مین نبی کی صداقت کی دلیل مین ایک اور آیت ہے،

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ — شیطان اترتے ہین ہر جھوٹے گنہگار پر، لا ڈالتے ہین

وَاَکۡثَرُہُمۡ کٰذِبُوۡنَ، (شعراء-۱۱) — سنی بات، اور بہت اُن مین جھوٹے ہین،

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ — بے شک اللہ اس کو راہ نہین دکھاتا جو جھوٹا ہو

کَفَّارٌ، (زمر-۱) — احسان نہین مانتا،

آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لیجاتا ہے، اور گناہ دوزخ مین، اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہان جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[2]، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص

[1] صحیح بخاری بدء الوحی، [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالی وکونوا مع الصادقین، وجامع ترمذی باب ماجاء فی الصدق

ابوداؤد کتاب الادب باب فی الکذب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلعم جنت مین لے جانے والا کام کیا ہے ؟
فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے، اور جو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے
اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت مین داخل ہوا، اُس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ مین لیجانے والا کام
کیا ہے ؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا، اور جب گناہ کے کام کریگا
تو کفر کرے گا، اور جو کفر کرے گا دوزخ مین جائے گا"۔ (مسند احمد اول ص۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس مین آجاتا ہے جس سے زیادہ
بری چیز کوئی دوسری نہین، اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی
چھاؤن مین ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جسکا منہ جھوٹ
کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے،

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے، لعنت کے معنیٰ "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی"
کے ہین، قرآن پاک مین اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیون، کافرون اور منافقون کو اسکی
وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہین کیا گیا، جھوٹ بولنے
اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت مین اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کیجائے، مباہلہ
کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونون فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگین کہ جو ہم مین جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو،

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (آل عمران - ۶)

پھر دعا کرین، پھر جھوٹون پر اللہ کی لعنت بھیجین،

میان بیوی کے لعان کی صورت مین جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے، اور شوہر کے پاس اسکا کوئی
گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچوین دفعہ یہ کہنا پڑے گا،

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ (نور-۱) اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو!

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بد دعا کا مستحق ہوتا ہے،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بنجائے، حق کا علم رکھ کر بھی اُس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ	بیشک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم
وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ	اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں
فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ	اُن کو انسانوں کے لئے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر
اللّٰعِنُوْنَ، (بقرہ-۱۹)	اللہ لعنت بھیجتا ہے، اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لئے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں!

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا،

وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (منافقون) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں،

اسی لئے آنحضرت صلعم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ "منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے"[1] لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی، مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بنکر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے، کیونکہ جو امین بنتا ہے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قول تعالیٰ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ، وما ینہی عن الکذب،

وہ معنًی اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس مین خیانت نہ کرے گا، اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا،

جھوٹ اکیلی برائی نہین بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے مین بیسیون قسم کی دوسری برائیان بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بُری صفتین بھی ظاہر کی ہین، جیسے

اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ،	(شعراء-۱۱)	جھوٹ بولنے والا گنہگار،
کٰذِبٌ کَفَّارٌ،	(زمر-۱)	جھوٹ بولنے والا احسان کا حق نہ ماننے والا،
مُسْرِفٌ کَذَّابٌ،	(مومن-۴)	بیباک جھوٹا،

ان آیتون نے بتایا کہ جھوٹا گناہون مین لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہین، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر مین اس کو چھپا لون گا، اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہین مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت مین جھوٹا ہی سمجھیگا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ مین مانتا ہون تو کسی کو اسکی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے مین باک نہین ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے،

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل مین نہین، یا جو اُس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے، کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے،

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا		اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف
کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ،	(توبہ-۱۰)	کیا اور اس لئے کہ جھوٹ بولتے تھے،

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلون مین نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت

رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو ہلاکت ہے،

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ، (توبہ - ۶)

اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں، اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے اُن صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا، اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے اُن کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ، (احزاب - ۳)

تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو، (یعنی مسلمان ہوجائیں تو معاف ہوجائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہوسکتا ہے، فرمایا،

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ، (علق - ۱)

جھوٹی خطا کار پیشانی،

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے، جو مٹا نہیں سکتا،

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے،

قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَاتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ، (آل عمران - ۱۷)

انھوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں،

دل کے اُن بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانوں کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ (نساء ۹) یہ وہ ہین جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے،

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہین ہے، یا اپنے مین وہ باور کرانا چاہے جو اس مین نہین ہے جھوٹا ہے، ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر مین یہ ظاہر کرون کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا، اور واقعہ یہ نہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا: جو جتنا نہین دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے[۱]، حدیث کے شارح کہتے ہین کہ دو جامے یون کہ جو اس کے پاس نہین اُس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہین دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا، اسی طرح جو عالم نہین وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولتمند نہین وہ دولتمندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہین اسکو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسرون کو فریب دینے کی کوشش ہے، غالبًا اسی لئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہون، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالون کو لمبا بنائے آنحضرت صلعم نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے[۲]،

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہین، اچھے اچھے لوگون کا یہ حال ہو کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہین جانتے، جیسے اکثر لوگون کو دیکھا جاتا ہے کہ بچون کو بہلانے کے لئے اُن سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ وہ ان وعدون کو تھوڑی دیر مین بھول جائین گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہین دی ہے، ایک کمسن صحابی عبداللہ بن عامرؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا، اور حضور انور صلعم میرے گھر مین تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ یہان آ تجھے کچھ دونگی" حضور نے فرمایا تم کچھ دینا چاہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہین چاہتی ہو، ماں نے کہا اس کو کھجور دیدونگی، رسول اللہ صلعم نے فرمایا، ہان اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتین تو یہ جھوٹ بھی تمھارا لکھا جاتا[۳]،

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب، [۲] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر، [۳] ابوداؤد، کتاب الادب باب التشدید فی الکذب،

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال مین بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہین کرنا چاہئے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لئے بھی ہے کہ مان باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن مین جو کچھ دیکھے اور سنے گا اسی سانچے مین ڈھلے گا، اس لئے لوگون کو چاہئے کہ بچون سے بھی جھوٹ نہ بولین،

بعض لوگون کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب اُن کو کھانے کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہدیتے ہین کہ مجھے خواہش نہین، حالانکہ اُن کے دل مین اس کی خواہش موجود ہوتی ہے، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا، کہ ہم مین سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہدے کہ مجھے اس کی خواہش نہین تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا، ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے[۱]،

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہین پہنچتا بلکہ بعض موقعون پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہین دی ہے اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگون کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے، اُس پر افسوس ہے، اس پر افسوس ہے[۲]" کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے، اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے،

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتین ہین اُن کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہین، ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لئے اس کی ہر بات کا یقین کرلیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت سے سخت فریب و نقصان مین مبتلا کردیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے، کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درانحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو[۳]،

---

[۱] مسند احمد و طبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی جلد ۱۱ باب فی ذم الکذب) [۲] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [۳] ادب المفرد باب الکذب الجالی ص ۳ تک مصدق،

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہیں سے لوگون کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے، اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جن کے معنی منحرف ہونے اور اُلٹ پلٹ دینے کے ہیں، جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اور مسلمانون کو حکم دیا ہے،

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ، (حج ۴) — بتون کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو،

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگون کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا ہاں یا رسول اللہ، فرمایا کہ شرک اور باپ ماں کی نافرمانی، راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ "جھوٹی شہادت" یا "جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے، یہان تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے[1]،

اس آیتِ پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا،

اِفْك اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا، مشرک خدا پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ "اِفک" سے تعبیر کیا ہے، (نور ۱۰)

اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "افک" بڑے خبثِ طینت کا کام ہے، فرمایا،

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ، (الشعراء ۱۱) — اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر،

[1] ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی عقوق الوالدین،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلاتحقیق دوسرون سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے، اور سوسائیٹی مین اس کی بات کی قدر نہین ہوتی، اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا،

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ، (مقدمہ صحیح مسلم)	آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے،

ایسے لوگون کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہین اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والون) کا خطاب دیا ہے، یہودیون کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ، (مائدہ - ۷)	جھوٹ کے بڑے سننے والے ہین،



جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت مین شہادت یعنی گواہی ہے، جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل مین اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت مین خیال کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہین، اور سچائی سے دور ہین وہ بات بات پر قسم کھاتے ہین، انھین معلوم ہے کہ لوگ اُن کے بیان کو سچا نہین سمجھتے اس لئے وہ لوگون کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمین کھاتے ہین،

اوّل تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی برا ہے، پھر جھوٹی قسمین کھانا تو اور بھی برا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین اس قسم کے قسم کھانے، اور قسم کھانے والون کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس مین جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لئے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے، تو وہ گنہگار ہوتا ہے، اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینون کو کھانے کھلائے یا کپڑے پہنائے، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو تین روزے رکھے، اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کردے[1]،

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ — اللہ تم کو تمھاری بے فائدہ قسمون پر نہین پکڑتا، لیکن جس

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور،

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ — قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے
فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ — توڑنے کا کفارہ دس محتاجون کو کھلانا بیچ کا کھانا جو
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ — تم اپنے گھر والون کو دیتے ہو، یا اُن کو کپڑا دینا، یا
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ — ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دن
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ — کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمھاری قسمون کا اتار جب تم
اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ (مائدہ-۱۲) — قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسمون کو نگاہ رکھو،

قسمون کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلافِ شرع، یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کیجائے اور اسکو حتی المقدور پورا کیا جائے، اور اگر پوری نہ کیجا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے، یہ کفارہ اسی لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے، کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے، یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے، بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا،

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (تحریم-۱) — خدا نے تم کو اپنی قسمون کا کھول ڈالنا ٹھہرایا ہے،

اور احادیث مین اس کی جزئی تصریحات مذکور ہین،

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جاچکا حقیقت مین گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت مین جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لئے ایسا شخص جو بات بات پر قسمین کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار، اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ (قلم-۱) — اور بہت قسمین کھانے والے ذلیل کا کہنا مان،

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانین، اور اس کا اعتبار کرین، لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے

اس طرح کی قسمین کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت، اور اس کی بیقدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے،

چونکہ اس طرح کی قسمین کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہین اسی لئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے، اور

قرآنِ پاک مین اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقون کے تذکرہ مین ہے کہ جب اُن پر کوئی افتاد

پڑتی ہے تو قسمین کھا کھا کر کہتے ہین کہ ہمارا یہ نشانہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمھارے دل

کی بات خوب معلوم ہے،

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا	پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف
قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ	پہنچے، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمین کھاتے آئین
بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا	کہ ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ ہین جنکے

أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَعْلَمُ ٱللَّهُ مَا فِى قُلُوبِهِمْ (نساء ۹) دلون کا حال اللہ کو معلوم ہے،

یعنی اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دلون مین کچھ ہے، اور زبانون پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہین کہ قسمین

کھا کر سچ کو جھوٹ، اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دین، خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو

چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کرین،

يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَٱللَّهُ	تمھارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی قسمین کھاتے ہین
وَرَسُولُهُۥٓ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا۟	تاکہ وہ تم کو راضی کر لین، اور اللہ اور رسول کو راضی
مُؤْمِنِينَ ۝ (توبہ - ۸)	کرنا زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایمان دار ہین،

ایسے منافقون کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہین، اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی

ہے تو فوراً مکر جاتے ہین،

يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ مَا قَالُوا۟ وَلَقَدْ قَالُوا۟	خدا کی (جھوٹی) قسمین کھاتے ہین کہ انھون نے نہین کہا
كَلِمَةَ ٱلْكُفْرِ (توبہ - ۱۰)	حالانکہ انھون نے بیشک کفر کی بات کہی،

ایک موقع پر منافقون نے ایک نامعقول کام کیا، خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر اُن سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائین گے سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ (توبہ - ۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ - ۱۲)

تمھارے آگے قسمین کھاتے ہین، تاکہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگون سے راضی نہین،

اِس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہین اور زبان سے قسمین کھا کر کہتے ہین کہ مانتے ہین وہ فاسق اور نافرمان ہین،

اسی موقع پر کچھ منافقون نے مسلمانون مین تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھوٹ قسم کھائین گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا،

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى ۖ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، (توبہ - ۱۳)

اور قسمین کھائین گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہین،

اہلِ نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے،

وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ، (مجادلہ ۳) وہ جان بوجھکر جھوٹی باتون پر قسمین کھاتے ہین،

اِتَّخَذُوْا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً، (مجادلہ - ۳ و منافقون - ۱) انھون نے اپنی قسمون کو ڈھال بنایا ہے،

یعنی قسمین کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہین،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی،

وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ، وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ

اور قسمون کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو، اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے، بیشک اللہ تمھارے کامون کو جانتا ہے، اور اس عورت کے جیسے نہ ہو

نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ	جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر کڑے
اَیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ	کرتی، تم اپنی قسموں کو آپس مین پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو
هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ (نحل-۱۳)	کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو،

خدا کا نام لیکر کوئی معاہدہ کرنا، اور اُس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اسی لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا، اس لئے قسم کھا کر توڑا نہ کرو، اور لوگون کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کا تکر کھول دیتی، یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی،

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پاکر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے، تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے،

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے، اور یہ ایک کے بجائے دو گناہون کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ، اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ	بیشک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسمون پر دنیا
ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی	کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہین، آخرت مین اُن کا
الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ	کوئی حصہ نہین، نہ اللہ اُن سے بات کرے گا اور
اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ	نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت مین، اور نہ ان کو
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ، (آل عمران-۸)	پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیون کی بددیانتیون کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہرحال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبد اللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جو

کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا، تو خدا اس پر غضبناک ہوگا"۔
اشعث بن قیس صحابی نے کہا خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ مین اتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، مین نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلعم کے سامنے پیش کیا، حضور نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمھارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ مین نے کہا نہین، تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو مین نے عرض کی کہ یا رسول اللہ وہ تو اب قسم کھا جائے گا، اور میری چیز لے لیگا، اس وقت یہ آیت اتری[1]"
ابن جریر کی بعض روایتون مین ہے کہ یہ آیت اون سوداگرون کی شان مین ہے جو جھوٹی قسمین کھا کر اپنا سامان بیچتے ہین، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ نے تین دفعہ فرمایا "تین آدمی ہین جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھیگا، نہ اُن کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے" صحابی کہتے ہین مین نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے مین پڑے، وہ کون ہین یا رسول اللہ فرمایا جو اپنا لباس گھٹنون کے نیچے تک لٹکاتا ہے (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے، اور جو جھوٹی قسمین کھا کر اپنا مال بیچتا ہے، (مسلم و ابوداؤد، و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکسان جاری ہوگا،
صحیح مسلم مین ہے کہ آپ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا" صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو، فرمایا، درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیون نہ ہو[2]" حضرت انسؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہین، خدا کا شریک ٹھہرانا، مان باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا، اور جھوٹی قسم کھانا[3]" ایک اور حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لیکر دوزخ مین ٹھکانا پائے گا[4]" چہرہ کی خصوصیت شاید اسلئے ہو کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھیٹھائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایان ہوتا ہے،

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان و النذور و ابن جریر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین [3] سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر [4] سنن ابی داؤد کتاب الایمان

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لئے خاص طور سے رسول اللہ صلعم نے اُن کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا "جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے[1]"۔ روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہیں، فانہ ینفق ثم یمحق، (مسلم ونسائی وابن ماجہ)

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی، اسلامی شرافت کے خلاف ہے، قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے[2]"۔



---

[1] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی، منذری باب ترغیب التجار فی الصدق، [2] ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق،

وعدہ خلافی

وعدہ کرکے اُس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے، اور یہ بھی حقیقت مین جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدون کے کتنے سچے، اور اپنی بات کے کیسے پکے ہین، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کرلیتا ہے، تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا۔

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا، (بنی اسرائیل ۴) بیشک وعدہ کی بازپرس ہوگی،

اور جس کی بازپرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی،

قرآن پاک مین منافقون کے سلسلہ مین ہے کہ اُن کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے دل مین نفاق پیدا ہوگیا، فرمایا،

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ، (توبہ ۔ ۱۰)

پس اس کا اثر اُن کے دل مین خدا نے نفاق رکھا، اُس دن تک جب وہ اس سے ملین گے، اس لئے کہ انھون نے خدا سے وعدہ کرکے خلاف کیا، اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے،

صحیحین مین ہے کہ منافق کی نشانی تین ہے، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانتدار بنایا جائے تو خیانت کرے" صحیح مسلم مین اس کے بعد ہے" اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے" صحیحین کی ایک اور حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا، یہ چار باتین جس مین ہون

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اُس کے ادا کرنے مین ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اُس مین بیجا تصرف کرتا، یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو، تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو، یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کرکے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اسکو وہ دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہذا عام مسلمانون، ائمہ وقت، اور اپنے متفقہ قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میان کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل مین کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا، اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت مین یہ ساری خیانتین یکسان ممنوع ہین، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ	اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو
وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ‎(انفال)	اور نہ آپس کی امانتون مین جان کر بددیانتی کرو،

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کرکے پورا نہ کیا جائے، ایمانداری سے اُن کے حکمون کی تعمیل نہ کی جائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کیجائے، اور اللہ و رسول اور مسلمانون کے دشمنون کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانون کے چھپے راز اُن کو بتائے جائین، اسی طرح آپس کی امانتون مین خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس مین وہ ناجائز تصرف کرے، اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو،

اس کو دوسرون پر ظاہر کر دے،

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ منافق کی تین علامتون مین سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کیجائے، تو وہ اُس مین خیانت کرے[1]، ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انھون نے کہا کہ خدا کی راہ مین مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ خدا کی راہ مین شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائیگا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہیگا خداوندا! اب کیسے لاؤن، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ مین لے جاؤ، وہان امانت کی چیز مثال بنکر اصل صورت مین سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا، اور اس کے پیچھے گرے گا، یہانتک کہ اُس کو پکڑے گا، اور اس کو اپنے کندھون پر لاد کر لے چلیگا، جب وہ دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اُس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا، پھر انھون نے فرمایا نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے، اور بہت سی چیزین گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزون کا ہے، راوی کہتا ہے کہ مین نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب صحابی کو سنائی، انھون نے تصدیق کی، اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہین سنی، اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا، (نساء - ۸) یعنی بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہو کہ اپنی امانتین والون کو ادا کر دیا کرو[2]۔

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئیگا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دینگے، خیانت کرین گے، امانت داری نہین کرینگے، اور نذر مانین گے تو پوری نہ کرینگے[3]۔

آنحضرت صلعم جن بری باتون سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، اُن مین سے ایک خیانت بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے[4]،

خیانت کے ایک معنی یہ ہین کہ کسی جماعت مین شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر مین لگے

---

[1] صحیحین وغیرہ [2] مسند احمد و بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور [4] ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور،

رہنا، چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، مگر اُن کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی، اور ہمیشہ اُن کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ، (مائدہ ۳)	اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے اُن کی ایک خیانت کی،

یعنی اُن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی،

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسف ؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ	تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے
اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ،	اس سے خیانت نہیں کی، اور بے شک اللہ خیانت
(یوسف - ۷)	کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا،

حضرت نوح ؑ اور حضرت لوط ؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی، اُن کی بیوفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں، اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا،

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ	خدا نے کافروں کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی
نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ، كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ	کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک
مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ، فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ	بندوں کے گھر میں تھیں، تو ان دونوں نے اپنے
يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا،	شوہروں سے خیانت کی، تو یہ دونوں پیغمبر ہو کر
(تحریم - ۲)	بھی) اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے،

یہ دل کی خیانت تھی،

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہانتک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت

باخبر رہتی ہے، تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کرکے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا،

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (مومن-۲)

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں،

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کرسکتا ہے،



غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہین کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پاکر اس کے خلاف کیا جائے، قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی مین اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہین، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار مین سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کرکے بدل جاتے تھے، اور بار بار بدعہدی کرتے تھے اُن کے ذکر مین خدا فرماتا ہے،

اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ	جن سے تونے معاہدہ کیا پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے
عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا	ہین، اور وہ تقویٰ (خدا کا لحاظ) نہین رکھتے، سو اگر
يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ	ان کو تو کبھی لڑائی مین پاوے تو ان کو ایسی سزا دے
فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ	کہ اُن کے پچھلے دیکھ کر بھاگین، شاید وہ عبرت پکڑین
وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ	اور اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو برابر کا

اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (انفال) جواب دے، اللہ کو دغا باز خوش نہین آتے

اس آیت مین گو اُن کافرون کا ذکر ہے، جو ہر دفعہ عہد کرکے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتین اس مین عمومیت کیساتھ بیان ہوئی ہین، ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کردیتی ہے، اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیون کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہان دی گئی ہے وہان یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت

اور دغا کرین تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمھارے قابو مین لے آئیگا، فرمایا،

وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ	اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہین تو
مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ	وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہین
حَکِیْمٌ، (انفال - ۱۰)	تو خدا نے اُن پر قابو دے دیا، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے، اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے،

حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا[1]" یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی، آنحضرت صلعم اپنی فوج کے افسرون کو جو نصیحتین فرماتے تھے اُن مین سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا[2]" یعنی دشمنون سے معاہدہ کرکے پھر غداری نہ کیجائے، ظالم بادشاہون، حاکمون، افسرون، سپہ سالارون کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کا وعدہ کرکے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہین، اور جب وہ اُن کے قابو مین آجاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مروا دیتے ہین، رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو مین اُس سے الگ ہون، اگرچہ مقتول کافر ہی کیون نہ ہو[3]"

خدا فرماتا ہے،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ،	اے ایمان والو! اپنی گرہون (قول و قرار) کو
(مائدہ - ۱)	پورا کرو،

عقود کی تعمیم مین وہ تمام شرطین، وعدے اور معاہدے داخل ہین، جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہان تک کہ مسلمان اپنے دشمنون سے بھی جو معاہدہ کرین اس کا

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] ایضاً، [3] سنن ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد،

حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے، ایک دفعہ امیر معاویہ نے رومیون سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجین لے کر اُن کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کردین، یہ دیکھ کر عمرؓو بن عنبسہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر اللہ اکبر! بدعہدی نہین، امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "مین نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے، (یعنی نہ اس مین سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے"۔ یہ سنکر امیر معاویہ واپس چلے آئے[1]۔ غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ نے معاہدہ کے لفظون کی خلاف ورزی نہین کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتون نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا، اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا،



[1] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد،

بہتان

بُہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اُس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے،

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں، جنکا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن شرارت کی راہ سے کسی بیگناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے، کہ اُس کی بدنامی ہو، قرآن نے اس کا نام اِفک رکھا ہے، یہ دونون باتین جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہین، اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے مین شریک ہو جاتے ہین، وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہین،

آنحضرت صلعم کے زمانہ مین طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر مین چوری کی، مسلمانون کو اس پر شبہہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچکر کھڑا ہو گیا، یہ معاملہ آنحضرت صلعم تک پہنچا، پر اُس منافق کے گھر والون نے اس کا ساتھ دیا، اور اس کو بری ٹھہرایا، آنحضرت صلعم نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا[1]، دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا، اور زرہ دوسرے کے گھر مین پھینک دی، لوگون نے اس کو پکڑا، آخر معاملہ آنحضرت صلعم تک پہنچا، آپ نے ظاہرِ حال پر فیصلہ کرنا چاہا، اس وقت یہ وحی آئی[2]، بہرحال واقعہ جو کچھ ہو، امرِ مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء، [2] تفسیر طبری سورۂ نساء آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ،

یہ آیتین ہین،

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ	ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) سچی کتاب اتاری
بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ	ہے کہ تو لوگون کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے
لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ	تجھ کو سوجھایا انصاف کر، اور خیانت کارون کی
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ وَلَا تُجَادِلْ	طرف سے نہ جھگڑ، اور اللہ سے قصور معاف کرا،
عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے، اور ان کی
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ يَّسْتَخْفُوْنَ	طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی مین دغا رکھتے ہین،
مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ	بیشک اللہ خیانت کار گنہگار کو دوست نہین
هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ	رکھتا، وہ لوگون سے چھپنا چاہتے ہین، اور خدا
الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ	سے نہین چھپنا چاہتے، اور وہ اُن کے ساتھ ہی
مُحِيْطًا،	ہے جب رات کو وہ سازش کرتے ہین، جو خدا
(نساء - ۱۶)	کو پسند نہین، اور اللہ ان کے کامون کو گھیرے ہے،

آگے چل کر ہے،

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ	اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت
يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ	کسی بے گناہ پر دھرے، اُس نے طوفان اور کھلا
اِثْمًا مُّبِيْنًا ؕ (نساء-۱۶)	گناہ (اپنے سر) لادا،

ان آیتون مین خیانت کار اور تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کارون کی حمایت اور اُن کی طرف سے کوئی وکالت نہ کیجئے پھر فرمایا جو ایسے خائن ہین وہ بڑے گنہگار ہین، اور خدا کی محبت سے محروم ہین، یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے

انسانون سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہین، اور خدا سے نہین شرماتے، جو ہر جگہ اُن کے ساتھ ہے، اور اُن کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اُس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہو، اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہین کر سکتا، اس کے بعد یہ سرزنش اُس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا،

پہلے عرب مین دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردون سے ملتی تھی، وہ ان مین سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی، خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلعم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے، اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آیندہ اس جرم سے باز رہے گی،

وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ	اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھین گی اپنے ہاتھون اور
أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ، (ممتحنہ-۲)	پاؤن کے بیچ مین،

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بُری بات ہے، پھر بن کئے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے، خدا نے فرمایا،

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ	اور جو مسلمان مردون اور مسلمان عورتون کو بن کئے
بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّ	(تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہین، انھون نے بہتان
إِثْمًا مُّبِينًا ۔ (احزاب-۷)	اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا،

شریف بیویون پر بہتان باندھنا چونکہ اُن کی عزت پر حرف رکھنا ہے، اس لئے دنیا ہی مین اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اس کو کوڑے مارے جائین،

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ	اور جو لوگ شریف بی بیون کو عیب لگاتے ہین،
يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ	پھر نہ لائے چار گواہ، تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور
ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً	ان کی گواہی کبھی نہ مانو، اور وہ فاسق ہین، مگر

اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا (نور-۱) جنھوں نے توبہ کی،

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور مین فاسق ٹھہرایا گیا، اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہو گئی،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اُس نے وہ جرم نہین کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا،[1] یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثالی سزا ہو گی، ایک اور حدیث مین آپ نے فرمایا کہ جس مین جو برائی نہین، اسکی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان[2] ہے، یعنی اُس سے بچنا چاہئے،



[1] [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب،

چغلخوری

چغلخور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیون کے درمیان جھوٹی سچی باتین بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے، اور اپنا رسوخ جتائے، اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی اسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہین جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اُس سے نفرت پیدا ہو، اسی لئے قرآن نے ان لوگون کے اوصاف مین جن کی بات نہین ماننی چاہئے یہ لفظ کہے ہین،

مَشَّاءٍۭ بِنَمِيمٍ ۔ (قلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے،

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہین تو اُس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی مین کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (حجرات-۱)

اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، کہین کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو، پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو،

اس آیت مین غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبرین پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے، اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصون، بالخصوص، عزیز و اقارب اور دوست و احباب مین

نا اتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث مین آیا ہے، کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مین تمھین بتاؤن کہ سب سے برے لوگ کون ہین، پھر خود ہی فرمایا،

المشاؤن بالنمیمۃ المفسدون بین	جو چغلیان کھاتے پھرتے ہین اور دوستون کے آپس کے
الاحبۃ، (مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)	تعلقات خراب کرتے ہین،

صحیحین مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ ان مین سے ایک پر اسلئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا[1]

صحیح مسلم ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا،

الا انبئکم ما العضہ ھی النمیمۃ القالۃ	کیا مین تم کو بتاؤن کہ عضہ کیا ہے؟ وہ چغلخوری ہے
بین الناس[2]،	جو لوگون کے درمیان بیان کیجاتی ہے،

لغت مین عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہین، اس لئے اگر اس حدیث مین تفریق کے معنی لئے جائین تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصون مین علحدگی کرانا چغلخوری کی حقیقت مین داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائین تو اس صورت مین بھی سحر اور چغلخوری مین مشابہت و مناسبت ہے، کیونکہ سحر سے بھی دو شخصون بالخصوص میان بی بی مین علحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید مین ہے،

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ	اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتین
بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ، (بقرہ ۔ ۱۲)	سیکھتے ہین جن کی وجہ سے میان بیوی مین جدائی پیدا کرین

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہین جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لایستتر من بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول، [2] مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم النمیمۃ،

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا، اسی لئے رسول اللہ صلعم نے صحابۂ کرام کو یہ ہدایت کی تھی،

لایبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئا	میرے اصحاب مین سے کوئی مجھ تک کسی کی بات
فانی احب ان اخرج الیکم و انا سلیم	نہ پہنچائے، کیونکہ مین یہ چاہتا ہون کہ تمہارے
الصدر[1]،	پاس آؤن تو میرا دل صاف ہو،

لیکن اس قسم کی باتین عام طور پر وہ ہوتی ہین جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہین بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے، بعض حالتون مین جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے، بعض موقعون پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہین، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کیجاتی ہے، اور جو لوگ اس بداخلاقی مین مبتلا ہوتے ہین، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتون کی ٹوہ مین لگے رہتے ہین، تاکہ اُن کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائین، اسی بنا پر اہلِ عرب چغلخورون کو ہیزم بردار کہتے ہین یعنی جس طرح لکڑیان بیچنے والے لکڑیان چن چن کر لاتے ہین، اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازارون مین فروخت کرتے ہین، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتون کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پھیلاتے ہین، اور آتشِ فتنہ و فساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہین،

قرآن مجید مین ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق "حمالۃ الحطب" یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگون کی چغلیان کھاتی پھرتی تھی،

ان مین بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہین، یعنی چھپ چھپ کر لوگون کی باتین سنتے ہین اور پھر اُن کو دوسرون تک پہنچاتے ہین، اس قسم کے لوگون کو لغت مین قتّات کہتے ہین، اور اُن کی نسبت رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے،

لایدخل الجنۃ قتّات[2]،	جنت مین چغلخور داخل نہ ہوگا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث، [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات،

اس قسم کی باتین خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کیجاتی ہین، تاکہ اُن کا اثر پڑ جائے، اسی لئے عربی زبان مین چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہین جس کے معنی نقش ونگار کے ہین، اور ادھر کی اودھر لگانے کے لئے چغلخورون کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے، اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہین جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہین،

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ تحریر و کتابت اور رمز و اشارت سے بھی چغلخوری کیجا سکتی ہے، اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہین بلکہ اعمال بھی اس مین داخل ہین، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہین کہا جا سکتا کہ "فلان شخص یہ کہتا تھا" بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "فلان شخص یہ کام کرتا تھا"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا، چغلی کی مکمل تعریف نہین ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے، کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے،

اس بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگون کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے، اور رسول اللہ صلعم نے "ترک مالایعنی" کی جو ہدایت مسلمانون کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے،

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتون مین نہایت خطرناک صورت مین ظاہر ہوتے ہین، اور قتل و خونریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہون کا مجموعہ ہے، اور اس مین غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیون کے عناصر شامل ہوتے ہین، اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، اگر امراء کے دربارون مین تملق و خوشامد کے لئے چغلخوری کیجاتی ہے تو عام صحبتون مین اس سے تفریح خاطر و

لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بنگیا ہے، اور اُس کو لوگ گناہ کبیرہ نہین سمجھتے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث مین بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلعم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مُردون کی آواز سُنی جنپر اُن کی قبرون مین عذاب ہو رہا تھا فرمایا "اُن پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہین ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، ان مین ایک تو پیشاب آڑ مین نہین کرتا تھا، اور دوسرا لوگون کی چغلیان کھاتا پھرتا تھا"[1]

اس حدیث کی شرح مین محدثین نے بڑی بڑی موشگافیان کی ہین، یہانتک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ نے یہ فرما دیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہین، پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیان کی ہین، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونون بداخلاقیان اس قدر عام ہو گئی ہین کہ اُن کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہین، حالانکہ وہ معمولی چیز نہین بلکہ کبائر و موبقات مین داخل ہین،

قرآن مجید مین بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے،

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ	جب تم لگے اپنی زبانون سے اس کی نقل درنقل کرنے اور
مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ	اپنے منہ سے ایسی باتین کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہین
هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ	اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا حالانکہ وہ
(نور-۲)	اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتین کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہین، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کیجاتی ہین، حالانکہ وہ معمولی نہین ہوتین،

[1] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر،

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب مین جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، بتذل، اور ناقابلِ اعتبار اشخاص مین پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے، یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہان رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی مین شریک ہونے کیلئے اور کوئی ذریعہ نہین پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہین، اس لئے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اُن کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے، اور ان کا کہنا نہ مانا جائے، اور قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (قلم-۱)	اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمین کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے (لوگون پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیان لگاتا پھرتا ہے، اچھے کامون سے (لوگون کو) روکتا رہتا ہے، حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے،



غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانون کی عزت وآبرو محفوظ رہے، اور اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار رہین، اس بنا پر جن بداخلاقیون سے مسلمانون کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور اُن کے تعلقات مین ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے اُن کی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالی نے قرآنِ مجید مین مجموعی طور پران کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥	مسلمانو! مرد مردون پر نہ ہنسین، عجب نہین کہ جنپر ہنستے ہین) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہون، اور نہ عورتین عورتون پر ہنسین، عجب نہین کہ (جنپر ہنستی ہین) وہ اُن سے بہتر ہون، آپس مین ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئین تو وہی (خدا کے نزدیک) ظالم ہین،
يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ	مسلمانو! (لوگون کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخلِ گناہ ہین اور ایک دوسرے کی

مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ۔ (حجرات-۲۰)

ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے، اور اللہ سے تقویٰ کرو، بیشک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے وہ غیبت ہے، امام غزالیؒ نے لکھا ہے، کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارت، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جا سکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پرزور طریقہ سے اسکی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں،

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جو چیز اُس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے،

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں، اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مر جانے کے بعد اُس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رُو در رُو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی، لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اسکی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہ ایسا ہے، جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے

کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے،

۳- لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہین کرتے، اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اُس لطف و محبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانون مین پیدا کرنا چاہتا ہے،

۴- مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت مین جائز ہے، اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا، اس لئے غیبت اُس وقت تک جائز نہین ہو سکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے، اور اس حالت مین بھی جہان تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے، اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہئے،

اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ صلعم نے متعدد حدیثون مین نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ شبِ معراج مین میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ اُن سے اپنے چہرون اور سینون کو نوچ رہے تھے، مین نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہین؟ بولے یہ وہ لوگ ہین جو لوگون کا گوشت کھاتے تھے، اور اُن کی عزت و آبرو لیتے تھے[1]،

اعمال اور اعمال کی جزا و سزا مین مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چونکہ لوگون کا گوشت نوچ کھاتے تھے یعنی اُن کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالمِ برزخ مین اُن کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہین،

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلعم نے صحابہ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ اُن لوگون کی بدبو ہے جو مسلمانون کی غیبت کرتے ہین[2]،

اس حدیث مین بھی اعمال اور جزا و سزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے، اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اس لئے یہ بدبو اسی مردار خواری کا نتیجہ تھی،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ،

اس حدیث مین ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کیجائے، اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگون کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہین، اسی طرح اُن کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا مین پھیل کر لوگون کو اُن سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپنے دوسری حدیث مین بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن ایمان تمھارے دلون کے اندر، جاگزین نہین ہوا ہے، نہ مسلمانون کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش مین رہو، کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش مین رہیگا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا، اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اسکو رسوا کردیگا"[1]

لغت کے روسے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی مین اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہین، مگر مذہبی تعلیم مین شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہین، اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیان ظاہر کی جائین تو یہ غیبت نہین ہے، لیکن آنحضرت صلعم کے ایک ارشاد سے ان دونون باتون کی تردید ہوتی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ لوگون نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہین، آپنے فرمایا "تمھارا اپنے بھائی کی اُس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے"، کہا گیا کہ اگر میرے بھائی مین وہ عیب موجود ہو جس کو مین بیان کرتا ہون، تو فرمایا اگر وہ عیب اس مین موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہین ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی مین اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جزو نہین، بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کیجائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی مین کیجائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہین ہے، بلکہ سب و شتم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ، [2] ایضاً،

مین داخل ہے،

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہین ہے، بلکہ ہاتھ پانون، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایان کرنے کے لئے لنگڑا چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلعم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا[۱]،

اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے، اور قرآن مجید نے متعدد آیتون مین غیبت کے ان ہی مخفی طریقون کی برائی بیان کی ہے،

هَمَّازٍ مَّشَّاءٍۭ بِنَمِيمٍ، (قلم-۱)	(لوگون پر) آوازے کسا کرتا ہے (اُدھر کی اِدھر اِدھر کی اُدھر) چغلیان لگاتا پھرتا ہے،
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ، (همزه)	ہر شخص جو (لوگون کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے، اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے،

ان آیتون مین غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقون کی مذمت کی گئی ہے، اُن کی توضیح ترجمہ سے نہین ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر رکھنی چاہئین جو حسبِ ذیل ہین،

(۱) همز، سامنے، اور لمز، پیٹھ پیچھے برائی کرنا،

(۲) همز، خاص طور پر لوگون کے نسب کی برائی بیان کرنا،

(۳) همز، ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا،

(۴) همز، زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا،

(۵) همز، برے الفاظ سے ہمنشینون کی دل آزاری کرنا،

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

(۶) لمزہ آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہمنشینون کی برائی بیان کرنا،

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہان تک وسیع ہے،

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگون کی واقعی برائی بیان کیجائے تاکہ اُن کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر برون کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کردیا جائے تو اُن کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی، اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہین رہ سکتا تھا، قرآن پاک مین کافرون، مشرکون اور منافقون کی علانیہ برائیان کی گئی ہین، مگر کہین کسی کا نام نہین لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کیساتھ پردہ مین، یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کیساتھ یون کہا گیا ہو کہ جو جھوٹ بولتے ہین، یا کفر کرتے ہین، ان کا حال یہ ہے، اس طریقۂ تعبیر مین یہ فائدہ ہے کہ برون کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہین پہنچتا، اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہین وہ اس لئے کہ انکی یہ برائیان عالم آشکارا تھین، لیکن معاملات مین ایسے موقع بھی آتے ہین، جہان تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتون اور حدیثون سے ان موقعون کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ — اللہ کو بدگوئی پسند نہین آتی لیکن جس پر ظلم ہوا ہو، اور

اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (نساء) — اللہ سنتا اور جانتا ہے،

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہین کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگون سے بیان کرے، اور ظالم کے ظالمانہ کامون کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا،

حدیث مین ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم کی خدمت مین باریابی کی اجازت طلب کی آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان مین کس قدر برا شخص ہے لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگون کو آگاہ کرنے اور بچانے

کے لئے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار مین دوسرون کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو اس کو یا تو غیبت ہی نہین کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہین تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم مین ان مقاصد کو چھ صورتون مین محدود کر دیا ہے؛

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی مین فریاد کرنا، رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے لصاحب الحق مقالاً،

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیون کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقون کی برائیان قرآن نے طشت از بام کی ہین)

(۳) فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حضرت ابوسفیان کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ نے سنکر اس کا مناسب جواب دیا)

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگون کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اسی غرض سے ایک شخص کو بئس ابن العشیرۃ "قبیلہ کا برا آدمی" کہا تھا،

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایتِ شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھ نہ ہو، مثلاً اعمش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہین ہوتا، رسول اللہ صلعم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھون والے) کے لقب سے پکارا تھا،

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسرون کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا،

دُورُخاپن

اگر دو شخصوں مین اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص وصداقت کیساتھ دونون سے تعلقات رکھ سکتا ہے لیکن اس قسم کے تعلقات مین دورُخاپن نہین پایا جانا چاہئے یعنی دونون کا دوست بنکر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونون کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہین چاہئے، بلکہ یہ بداخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ چغلخور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورُخا آدمی دونون کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے،

دورُخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہین ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے، اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق مین جو خصوصیات پائی جاتی ہین ان مین سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے، ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ "ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہین تو کچھ کہتے ہین اور جب اُن کے یہان سے نکلتے ہین تو کچھ کہتے ہین" بولے ہم لوگ عہدِ رسالت مین اس کا شمار نفاق مین کرتے تھے[۱] اور قرآنِ مجید مین بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے،

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ — اور جب اُن لوگون سے ملتے ہین جو ایمان لاچکے تو

---

[۱] صحیح بخاری، باب ماقیل فی ذی الوجہین،

اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ	کہتے ہین ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہین اور جب تنہائی
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ،	مین اپنے شیطانون سے ملتے ہین تو کہتے ہین ہم تمھارے
(بقرہ ۲-۱)	ساتھ ہین، ہم تو صرف مسلمانون کو بناتے ہین،

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقون کو اردو مین دو رخا اور عربی مین ذوالوجہین کہتے ہین، اور احادیث مین اس قسم کے لوگون کے لئے وعید شدید آئی ہے، مثلاً فرمایا "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے برا دو رُخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگون کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے، اور دوسرون کے پاس جاتا ہے تو اور۔"[۱]

ایک اور حدیث مین فرمایا:-

"دنیا مین جس کے دو رخ ہونگے قیامت کے دن اس کے منہ مین آگ کی دو زبانین ہونگی۔"[۲] یہ گویا اس کی اس عادتِ نمیمہ کی تمثیل ہوگی، کہ وہ لوگون سے دو رنگ کی باتین کیا کرتا تھا،



[۱] بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم ومالک [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجہین،

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام مین بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام مین اسکو حسنِ نیت نظر نہین آتا، دوسرے کی طرف ان ہونی باتین منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اسکا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اُس سے کترانے لگتا ہے، اس سے آپس مین نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندون کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۔ (حجرات ۲) اے ایمان والو بہت بدگمانی سے بچا کرو، بیشک بعض بدگمانی گناہ ہے

آنحضرت صلعم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہین، فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسرون کے ٹوہ مین نہ رہا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی ہوس کیا کرو، اور نہ آپس مین حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو جیسا اللہ نے فرمایا ہے آپس مین بھائی بھائی ہوجاؤ"[۱]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت مین ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ مین نہ پڑے، اسکی مثال خود آنحضرت صلعم نے پیش فرمائی ہے، ایک دفعہ آپ اعتکاف مین بیٹھے تھے رات کو ازواجِ مطہرات مین سے کوئی آپ سے ملنے آئین آپ انکو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ مین دو انصاری آپڑے وہ آپ کو کسی عورت کیساتھ دیکھکر اپنے آنے کو بے موقع سمجھ اور واپس پھرنے لگے، آپنے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلان ہین، انھون نے عرض کی یا رسول اللہ اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔[۲]

(۱) صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک باب تحریم ظنون، (۲) صحیح مسلم باب بیان انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ و کانت زوجتہ او محرما لہ ان یقول ہذہ فلانۃ"

مدّاحی اور خوشامد

مدّاحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنارت اور ذلت کی علامت ہی، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے، اور یہ اُس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے، جس کی مدّاحی اور خوشامد کیجاتی ہے، خوشامد اور مدّاحی کرنے والا تین گناہون کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفین کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہین ہوتین یہ جھوٹ ہی، دوسرا یہ کہ وہ منھ سے جو تعریفین کرتا ہی اسکو اپنے دل مین خود درست نہین سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدون کے لئے اربابِ قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کرکے اُن کی اور لوگون کی نظرون مین اپنے کو ذلیل ورسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنارت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے،

بیجا تعریفون سے ممدوح مین بھی دو برائیان پیدا ہوجاتی ہین، ایک غرور، اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفین سنکر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہوکر دوسرے کو آنکھ نہین لگاتا ہے، اور پے درپے تعریفین سنکر اُس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہون، امیرون، دولتمندون اور بڑے لوگون مین اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیان پیدا ہوجاتی ہین، اور جس طرح وہ بر خود غلط ہوجاتے ہین اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور مین مل سکتی ہی،

قرآنِ پاک مین یہودیون اور منافقون کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[1]، اور انکے انجام کی یہ خبر انکو دی ہے،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا — جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہین، اور جو انھون نے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آل عمران،

وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا — نہین کیا اس پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتے ہین،

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ — تو اُن کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائین گے

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (اٰل عمران-۱۹) — اوران کے لئے دردناک سزا ہے،

ان آیتون کا شانِ نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام[1] ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کامون پر اترانا اور بن کئے کامون پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآنِ پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہین، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہین، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہین، اس گناہ مین کسی نہ کسی درجہ مین شریک ہین، جس کی تفصیل بہت سی حدیثون سے معلوم ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کردیا[2]، ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یون کہو کہ مین یہ گمان کرتا ہون بشرطیکہ اس کے علم مین وہ واقعی ایسا ہو، اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے[3]،

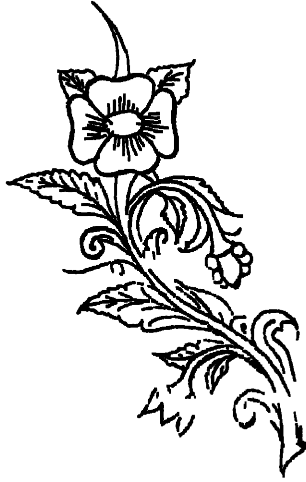
مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائیگی تو وہ اس کو سنکر مغرور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہین لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہین معلوم،

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفین جو لوگون کے منھ پر کی جاتی ہین انکو سنکر اُن کے نفس موٹے ہوجاتے ہین اوران کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھون کی روشنی زائل ہو جاتی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منھ پر اُن کی تعریفین کین، تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منھ مین خاک جھونک دی

---

[1] فتح القدیر شوکانی، [2] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح، [3] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد باب مذکور،

اور فرمایا رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ مداحی کرنے والون سے ملو تو اُن کے منھ مین خاک جھونک دو[1]۔
ادب المفرد مین ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد مین تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے، تو اس نے اس کی بڑی تعریفین شروع کین، آپ نے فرمایا "اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کردو[2]"۔



[1] صحیح مسلم و ابوداؤد باب کراہیۃ التمادح۔ [2] باب یحثی فی وجوہ المداحین۔

بُخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیون مین سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیون کی جڑ ہے، خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنارت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی، اور بہت سی برائیان اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلھاڑی ماری، اور بھوکون کو کھلانا، ننگون کو پہنانا، محتاجون کو دینا، یتیمون کی خبر گیری، اور مقروضون کی امداد مسلمانون کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہین، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے، آنحضرت صلعم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرئیلؑ کی آمد کا حال سنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلون کی بناپر دلایا وہ یہ ہین،

"یارسول اللہ! آپ قرابت والون کا حق اور مقروضون کا قرض ادا کرتے ہین، غریبون کو سرمایہ دیتے ہین، مہمانون کو کھلاتے ہین، اور حق کے مصیبت زدون کی مدد کرتے ہین" (صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتون کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہین ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے،

بخالت اُن بیماریون مین سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہین کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہین رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہین ہوسکتا، سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتون مین سے ہے، اس مین دوزخیون کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے،

اُن سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ مین کیون ڈالے گئے، تو کہین گے ہم نماز نہین پڑھتے تھے، اور مسکین کو کھانا نہین کھلاتے تھے، مخالفون کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہین رکھتے تھے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ	تم کو دوزخ مین کیا چیز نے گئی، کہین گے ہم نمازیون
الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝	مین سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے، اور بحث
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ	کرنے والون کے ساتھ ہوکر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے
بِيَوْمِ الدِّينِ، (مدثر-۲)	اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے،

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہین، وہ اخلاص سے دوسرون کے ساتھ فیاضی بھی نہین کرسکتا یہی نکتہ سورۂ ماعون مین جو مکہ کی پرانی سورتون مین سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا،

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے
الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ	پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور
طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (ماعون)	فقیر کے کھانے پر آمادہ نہین کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہین، کیونکہ یہ فیاضی اُس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہین ہوسکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا مین پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہان کہین اُسکو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہین ہوتی وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہین ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہین کہ اُس کے دل مین یہ یقین نہین کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور وہ کبھی ضائع نہین جاسکتی،

ایک اور مکی سورہ مین اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہین، اور اس لئے

اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، خدا فرماتا ہے،

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ	یہ خیال صحیح نہین، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے
عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ	بچہ کی توقیر نہین کرتے، اور فقیر کے کھانے پرایک
أَكْلًا لَمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝	دوسرے کو رغبت نہین دلاتے، اور مردہ کے ترکہ
(الفجر)	مال کو کھا جاتے ہو، اور مال و دولت سے بڑی
	محبت رکھتے ہو،

ان آیتون مین باتین کئی بیان کی گئی ہین، مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتون کی تشریح ہین، سورۂ ہمزہ مین اُس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیون کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا، اور یہ چیز اُس سے کبھی علٰحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ	جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن گیا اس کو، سمجھتا ہے
مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي	کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یون
الْحُطَمَةِ ۝ (ہمزہ)	نہین، وہ بالضرور دوزخ مین ڈالا جائے گا،

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر مین خرچ نہ کرنے والے کو اُس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے،

كَلَّا إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ۝ تَدْعُوا	ہرگز نہین وہ تپتی آگ ہے، کھینچ لینے والی کھال
مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۝	پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی، اور
(معارج - ۱)	پھر گیا، اور اکٹھا کیا اور سینتا،

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہین، بلکہ وہ صرف چیزون کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹین خود بخود روٹی، کپڑا اور مکان کی چار دیواری نہین بن سکتین، اس لئے

اُن کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہین، اُن کو ضروری اور اعلیٰ مقصودون کے حصول مین خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے، اور یہی اعلیٰ مقصود ہین جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ مین خرچ نہین کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہین جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہین
وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	اور خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے تو اُن کو
بِعَذَابٍ اَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي	دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے، جس دن
نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ	اُس کو دوزخ کی آگ مین گرم کیا جائے گا پھر
جُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا	اُس سے اُن کی پیشانیان، کروٹین اور پیٹھین
كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ	داغی جائین گی، (اور کہا جائیگا کہ) یہ ہے وہ جسکو
تَكْنِزُونَ ۝ (توبہ - ۵)	تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا، تو جس کو گاڑ کر رکھا
	کرتے تھے اس کا مزہ چکھو،

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہین کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہین جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہئے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہین،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا	اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے انکو دیا ہے
اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ	روکے رکھتے ہین، وہ اس کو اپنے حق مین بہتر نہ
بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا	سمجھین، بلکہ وہ ان کے حق مین بدتر ہے، جس مال
بَخِلُوا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ،	کا وہ بخل کرتے ہین اس کا طوق بنا کر ان کے گلے
(آل عمران - ۱۸)	مین قیامت کے دن پہنایا جائے گا،

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا مین اپنے گلے کا ہار بنا رکھا تھا، وہ قیامت کے عالمِ مثال مین واقعی اُن کے گلے کا ہار بنکر نظر آئے گا، حدیث مین ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت مین گلے مین پڑا ہوا نظر آئے گا[1]،

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کامون سے قطعاً محبت نہین ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے، اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہین گے،

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ، (حدید - ۳)	اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہین کرتا جو آپ بخل کرتے ہین، اور لوگون کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہین،

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اُس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے، اور عزیز و اقربا بھی محبت نہین کرتے، اور ایسے لوگون کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہو کہ اُن کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسرون کو ذلیل سمجھتے ہین، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندون کی نگاہون مین بھی ذلیل و خوار ہوتے ہین،

قرآنِ پاک مین بخل کی سب سے بڑی تمثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا قصہ سورۂ قصص مین ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ مین ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور مین جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہو گی) خزانے تو الگ رہے خزانون کی کنجیون کے گچھوں کو کئی آدمی ملکر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجاے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ،

ہنر کا نتیجہ ہے۔ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اُس سے بھی بڑے بڑے دولتمند گذر چکے ہیں، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا،

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے
قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ	اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولتمند
قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ (قصص-۸)	کو تباہ کر چکا ہے،

زمانۂ محمدی کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہدیا گیا،

مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ	ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا
(ابی لهب)	کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا،

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اُس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کیجائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بیکار ہو جاتا ہے، اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے،

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ	ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ	جا رہا ہے، تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے، اور جو کوئی
يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ	بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اور
الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ (محمد-۴)	اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو،

یعنی اُس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے،

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے، کہ سب کچھ پاس ہونے

کے باوجود بھی اُس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو، ہر شخص اُس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقراء اس کے لئے بددعا کرتے ہین، یہانتک کہ بیوی بچے جن کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اُس سے خوش نہین رہتے، ہر ایک اسکی دولت کا خواہان رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اُس پر قبضہ کرلے، چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہین، مگر ان تمام مصیبتون کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس مین سے کچھ خرچ نہین ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثون نے اللے تللے اس کو اوڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کے دم مین اوڑا دیتی ہے، اور ہزارون بری عادتون مین مبتلا اور آخر مین مفلس و قلاش ہو جاتی ہے،

خدا اپنے رسولؐ کی زبانی فرماتا ہے،

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ (لیل)	اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا، اور (خدا کی یا نیکی کی باتون کی) پروانہ کی، اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان بنائین گے، اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا،

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بطورِ سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بری عادت و خصلت اور برے کردار ہین جن مین وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے، اور اُن کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتین وہ جھیلتا ہے، راتون کو آرام سے سو نہین سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہین اٹھا سکتا، عزیز و اقارب

دوست واحباب سے اُس کو مسرت نہین ہوتی، وہ سب سے نالان اور اُس سے سب نالان رہتے ہین، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے مین گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ	اور ہمنے تم کو جو روزی دی ہے، اس مین سے اس سے
يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ	پہلے کہ تم مین سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ مین)
لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ	خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے
وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ،	کہ میرے پروردگار تونے مجھے تھوڑی دیر اور کہین
	مہلت نہ دی کہ مین خیر خیرات کرتا اور نیکوکارون
(منافقون - ۲)	مین سے ہو جاتا،

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہین ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہین سکتا، اس کے لئے سامان پہلے سے چاہئے تھا،

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہین کہ جب وہ غریب ہوتے ہین تو بڑی بڑی دعائین کرتے ہین، خوب خوب وعدہ کرتے ہین کہ اگر خدا نے ہمین اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کرین گے، وہ کرینگے، مگر جب اللہ تعالیٰ اُن کو دولت دیدیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہین، اور نیکی کے ہر راستہ سے منھ موڑ لیتے ہین، ایسے ہی لوگون کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظون مین کھینچا ہے،

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا	اور اُن مین کوئی ایسا ہی جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے
مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ	ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کرینگے اور نیکوکارون
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ	مین سے ہونگے، پھر جب خدا نے اُن کو اپنے فضل سے
بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ، (توبہ)	دیا تو اسمین بخالت کرنے لگے، اور ٹل کر پھر گئے،

خدا فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے دل مین نفاق نے گھر کر لیا،

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ ۔(توبہ۔ ۱) تو اللہ نے اُن کے دلون مین اس کا نتیجہ نفاق رکھا،

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "دو خصلتین سچے مومنون مین جمع نہین ہوتین، بخل اور بد خلقی[1]" رسول اللہ صلعم جن برائیون سے بچنے کی خدا سے دعائین مانگا کرتے تھے، اُن مین سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا مین بخل، کسلمندی، کبر سنی، قبر کے عذاب، اور زندگی اور موت کی آزمایش سے تیری پناہ مانگتا ہون[2]"

اسلام مین زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدیؐ مین اسی لئے ہین کہ انسانون کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک صاف رہین،

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہین ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے تو جو لوگ خدا کی ان بخششون کا حق ادا نہین کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہین، اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤن کے مستحق ہین، جس کو علم ملا ہے اُس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسرون کو بتائے، جو ایسا نہین کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ (بقرہ۔ ۱۶) اور کون اُس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے،

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا[3]، اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھکر علم کے فرض کو انجام نہین دیا، اس کا شمار بخیلون مین ہوگا،

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصون مین منقسم کیا ہے، اللہ کے حق ادا

---

[1] جامع ترمذی، [2] صحیح مسلم [3] مشکوٰۃ کتاب العلم،

بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز، اور بندون کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگون کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتون مین ان ہی دونون کی عدم بجاآوری کو دوزخ مین جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ، قَالُوا لَمْ نَكُ	کیا چیز تم کو دوزخ مین لے گئی، کہیں گے کہ ہم نماز یون
مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ	مین سے نہ تھے، اور نہ محتاجون کو کھلاتے
الْمِسْكِينَ ۝ (مدثر۔ ۲)	تھے۔

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجاآوری سے انحراف، اور دوسرا بندون کے حق سے تغافل ہے یہی بات سورۂ ماعون کے آخر مین ہے،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ	پھر خرابی ہے اُن نمازیون کی جو اپنی نماز سے
صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ	بے پروا رہتے ہین، وہ جو دکھاوا کرتے ہین اور
يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۔ (ماعون-۱)	چھوٹی چھوٹی چیزون کو مانگے نہین دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہین ادا کرتے ہین اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہین، یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے، اور دوسری آپس مین مانگے کی معمولی معمولی چیزون مین جیسے نمک، آگ، پانی، اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزون مین بخل سے کام لینا ہے، یہ بندون کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصّہ کے عدمِ تعمیل کا سبب بنتا ہے، اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کیجائے کم ہے،

حرص و طمع

حرص و طمع یا لالچ وہ برائی ہے جس مین نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً وہ حرص و طمع جس مین بخالت کی بھی آمیزش ہو، عربی مین اس کو شُحّ کہتے ہین، جس کی برائی قرآن مین کئی موقعون پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہین چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہین، شوہرون کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ زیادہ خرچ نہین دیتے، اور بیویان لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہین، یا ایک شخص کے کئی بیویان ہون تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے، کہ شوہر پر میرا حق زیادہ ہے، اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملون مین کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف مین رہتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو، اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے، تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا، عشرتکدہ بنجائے گا، میان بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ مین قرآن کی تعلیم ہے،

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا	اور طبیعتون (نفوس) مین حرص دھری ہے، اور
وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا	اگر تم احسان کرو، اور تقویٰ اختیار کرو، تو اللہ کو
(نساء - ۱۹)	تمھارے کامون کی ساری خبر ہے،

یعنی میان بیوی دونون حرص اور لالچ چھوڑ دین، اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرین، تو اللہ تعالیٰ

جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو اُن کے کاموں کے مطابق جزا دے گا،

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی فرمایا،

وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (تغابن)	اور خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو، اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں،

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں،

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، (حشر-۱)	اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود اُن کو ضرورت ہو، اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں،

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے، اور یہ زینہ اُس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا جب تک حرص وطمع کا خاتمہ نہ ہو، اسی لئے خدا نے فرمایا، جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے،

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے، کیونکہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا	اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے، مردوں کے لئے اُن کی

مِمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ	کمائی ہے، اور عورتون کے لئے اُن کی، اور اللہ سے
وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	مانگو اس کے فضل مین سے حصّہ، بے شک اللہ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (نسآء - ۵)	ہر چیز کو جانتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز مین کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیون مل گئی، کاش خود اُسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم مین سے اپنا حصّہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہئے، اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت مین قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہیگا اسی لئے فرمایا،

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ	اور بیشک ہم نے تجھکو دین سات آیتین، اور قرآن
الْعَظِيْمَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا	جس کا درجہ بڑا ہے، تو اپنی آنکھین اُن چیزون
مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ،	پر مت پسار، جو ہم نے ان مین سے مختلف لوگون
(حجر - ۶)	کو فائدہ اٹھانے کو دی ہین،

یعنی جسکو قرآن جیسی دولت ملی، اس کی نظر مین دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے، آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو، کہ اسی نے تم سے پہلون کو برباد کیا، اسی نے اُن کو آمادہ کیا، کہ انھون نے خون بہایا، اور حرام کو حلال سمجھا،[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے صحیح ابن حبان اور حاکم مین اس سے زیادہ مفصل ہے، فرمایا حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلون کو اس کی دعوت دی کہ انھون نے (بےگناہون کا) خون بہایا، اسی نے اگلون کو دعوت دی کہ انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اور اسی نے

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم،

اگلون کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا[1]۔ آنحضرت صلعم نے اپنی ایک تقریر مین فرمایا حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومین اسی حرص سے تباہ ہوئین، اسی نے اُن کو کہا تو انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انھون نے بخل کیا، اسی نے اُن کو فسق و فجور کے لئے کہا تو انھون نے فسق و فجور کیا[2]۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا "انسان مین سب سے بری بات کڑھانے والی حرص، اور گھبرا دینے والی نامردی ہے[3]" حریص آدمی اس لئے ہمیشہ غم مین کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہین ملا، وہ نہین ملا، فلان کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہین، اسی لئے آنحضرت صلعم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن مین رکھنے والی فرمایا، نسائی مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل مین جمع نہین ہو سکتے[4]" سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر، توکّل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ مین فرمایا کہ "انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اُس کی دو چیزین جوان رہتی ہین، جینے کی خواہش اور مال کی حرص[5]"، کئی صحابیون کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ دو بھیڑیئے جو بکریون کے جھنڈ مین چھوڑ دیئے جائین، وہ ان کو اتنا برباد نہین کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے[6]،



---

[1] صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم، [2] ابو داؤد و حاکم، [3] صحیح ابن حبان و ابو داؤد کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن [4] نسائی، [5] ترمذی، [6] ترمذی، و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابو یعلیٰ و بزار، (منذری ۲ ص ۲۳۸)

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے، اور وہی اس مین تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہین کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتین محفوظ اور مامون ہین، اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت مین بیان کر دیا ہے

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ، (نساء - ۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ،

اس آیت نے اُن تمام طریقون کا جو ایمانداری کے خلاف ہین اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہین ہے چار لفظون مین خاتمہ کر دیا ہے، یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور وظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا امین خیانت کرے رشوت لے سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے،

آنحضرت صلعم نے فرمایا جس نے ہم (مسلمانون) پر ہتھیار اٹھایا، اور جس نے ہم (مسلمانون) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانون) سے نہین[1]، جان اور مال معاملات مین دو اہم چیزین ہین، آنحضرت صلعم کے اس مختصر سے فقرہ نے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا،

دونون کی حفاظت کی اہمیت بتادی، ایک دفعہ آنحضرت صلعم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا، آپ نے اس مین ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے، آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیون نہین رکھا کہ لوگ دیکھ لین، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہین[1]، یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہوجاتا ہے،

ارشاد ہوا "جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملیگا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا[2]" ایک دفعہ ایک معاملہ مین ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھائی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب وہ ملیگا تو خدا اس سے منھ پھیرے گا[3]

کسی کے مال وجائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو "غصب" کہتے ہین، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰؑ اور خضر علیہما السلام کے قصہ مین ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھوؤن کی کشتیان زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا،

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبون کی تھی، جو دریا مین
فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ	محنت کرتے تھے، تو مین نے چاہا کہ اس مین
وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ	کچھ عیب کر دون، اور ان کے پرے ایک
غَصْبًا ۔ (کہف - ۱۰)	بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا،

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی، کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا، اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی،

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا، طوّقه الله في سبع ارضين[4] تو اس کو زمین کے ساتون طبقون مین سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا، [2] و [3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من اقتطع حق مسلم،

[4] صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض، یہ عبارت کئی طرح سے ہے: فی سبع ارضین، من سبع ارضین، الی سبع ارضین،

اٹھانے کو کہا جائے گا؛ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے مین زمین کے یہ ساتون طبق ہار کی طرح ڈالے جائینگے[1]

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہین جو وکیلون کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلون کے زور سے غیرون کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہین، حالانکہ انھین اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہین، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین مین سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے، اور مین اس کے حق مین فیصلہ دیدیتا ہون، اگر مین نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی جو اس کی نہین تو وہ خود نہ لے، کیونکہ مین نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے"[2]

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہین جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہین، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جاکر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہین،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	اور آپس مین ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ
وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا	سے مت کھاؤ، اور نہ پہنچاؤ حاکمون تک اس کا
مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ	معاملہ، تاکہ کھا جاؤ لوگون کا کچھ مال گناہ سے،
تَعْلَمُوْنَ، (بقرہ - ۲۳)	اور تم جان رہے ہو،

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمھارا دعویٰ اور تمھارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزورون کو بے بس سمجھکر یا اپنے بس مین پاکر اُن کا مال خلافِ انصاف نہین کھانا چاہئے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ مین انگارے بھرتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا	بیشک جو یتیمون کا مال ظلم سے کھاجاتے ہین، وہ
اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ	اپنے پیٹ مین آگ کھاتے ہین، اور اب وہ آگ مین
سَعِيْرًا ۝ (نساء - ۱) -	بیٹھین گے،

---

[1] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور، [2] ابوداؤد کتاب الاقضیہ،

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے، اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہات کاٹ ڈالنا،

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا	اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ
جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ	کاٹ ڈالو، سزا اُن کی کمائی کی تنبیہ اللہ کی طرف سے
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ، (مائدہ ۵-۶)	اور اللہ ہے زور آور حکمت والا،

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے، اگر اس کی روک تھام نہ کیجائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے، اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا، مرتکب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس کے بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے، اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں، اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پا لیتا ہے، اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے، اور خود بھی اُس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفاے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے،

اہلِ عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "وہ چوری نہ کرینگی" فتحِ مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونیں اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ نے اُن سے بھی اس کا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ یارسول اللہ ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کیلئے پورا خرچ نہیں دیتے، مگر یہ کہ میں اُن کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں، فرمایا "تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو"۔ اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی، دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسبِ ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں،

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ نے لیا ہے، حضرت عبادہ بن صامت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلعم کے پاس بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا "ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کروگے، پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے، اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دیدی گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہوگیا، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا، تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے"[۲]۔

ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے،

[۱] صحیح بخاری کتاب النفقات، [۲] ایضاً کتاب الحدود،

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لئے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہین رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اُس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہین دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہین دیکھتا اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس مین ایمان نہین رہتا۔"[1]

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ "تم مین سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ"[2] یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ مین حاصل کرو، یہی بات قرآنِ پاک کی اس آیت مین فرمائی گئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ	اے ایمان والو! تم آپس مین ایک دوسرے کا
بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً	مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن کہ لین دین ہو
عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ، (نساء - ۵)	آپس کی خوشی سے،

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس مین ہر اُس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو،

عرب مین قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگون سے چیزین عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلعم کی خدمت مین پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگون نے اُس کی سفارش کی، تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے قومین اس لئے تباہ ہوئین کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو اُن کو سزا دیتین، اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتین، خدا کی قسم اگر محمد (صلعم) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو مین اس کا ہاتھ کاٹتا۔[3]

ایک صحابی ایک چادر سرھانے رکھکر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرھانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑ کر آیا تو صحابی موصوف نے آکر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود، [2] ایضاً، [3] ابوداؤد کتاب الحدود،

کیا تین درہم کے لئے اُس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، مین نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپنے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیون نہین کرلیا[1]،

ایک دفعہ آنحضرت صلعم نماز مین مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت مین آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہوکر آپنے فرمایا کہ مین نے دوزخ مین اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیون کا سامان چرالیتا تھا اور اگر مالک ہشیار ہوجاتا تو کہدیتا تھا کہ اتفاق سے اس مین پھنس کر چلا آیا، اور اگر وہ بیخبر رہتا تو لیجاتا تھا، آپنے فرمایا مین نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ مین اپنی آنتین گھسیٹتا پھرتا تھا[2]،



[1] ابوداؤد کتاب الحدود، [2] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف،

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہین، اور جس کی پاداش مین چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے، اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکسان کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے اُن نازک سے نازک ناجائز معاملون کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہین سمجھا جاتا، تشریح کی اور ان کی برائیون کی تشہیر کی ہے، اور رسول اللہ صلعم نے اپنی عملی تعلیمون سے اُن کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے،

اس سلسلہ مین سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے، جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے، اور جس مین خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہین، اور جس سے سب سے زیادہ غریبون کو نقصان پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین مین سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اسکو دیدیجائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے، جسے خدا نے دنیا مین قائم کیا ہے، اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہین دیتا یا دینے مین کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے کام نہین لیتا ہے، فرمایا،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ	اور آسمان کو اونچا کیا، اور ترازو رکھی، کہ مت زیادتی کرو ترازو مین، اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو

وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ○ (رحمان-۱) — تولو، اور مت گھٹاؤ تول،

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تُلتا ہے، اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے، ناپ تول مین کمی بیشی کرنا حقیقت مین دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے مین تول کو بڑھاتا اور دینے مین گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدین آئی ہین، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لئے ان کی دعوت مین ناپ تول مین ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہین،

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ — اور پورا بھرو ناپ، اور نہ ہو نقصان دینے والے
وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا — اور تولو سیدھی ترازو سے، اور مت گھٹا کر دو لوگون
النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ — کو اُن کی چیزین، اور مت پھرو ملک مین فساد
مُفْسِدِينَ ○ (شعراء-۱۰) — پھیلاتے،

یہی حضرت شعیبؑ مدین والون کو سمجھا کر کہتے ہین، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلون کے رہگذر مین آباد تھے

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ — اور ناپ اور تول مین کمی نہ کرو، مین تم کو آسودگی مین
بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ — دیکھتا ہون، اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت
مُحِيطٍ ○ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ — کو تم پر ڈرتا ہون اور اے میرے لوگو! ناپ اور
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ — تول کو انصاف سے پورا کرو، اور لوگون کی چیزین
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ○ — ان کو گھٹا کر مت دو، اور ملک مین فساد پھیلاتے
(ھود-۸) — مت پھرو،

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یون کہئے کہ بازار مین ایسے لوگون کی جو ناپ تول مین کمی بیشی کرتے ہین ساکھ جاتی رہتی ہے، اور یہ بالآخر

اُن کے بیوپار کی تباہی کا باعث بنجاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہین کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھاین گے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی اُن کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے،

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہی نصیحت پھر سورۂ اعراف مین دہرائی گئی ہے،

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا	تو ناپ اور تول پوری کرو، اور مت گھٹا دو لوگون
النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي	کو ان کی چیزین، اور زمین مین اس کی اصلاح کے
الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ	بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمھارے لئے بھلا ہے
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o (اعراف-۱۱)	اگر تم کو یقین ہو،

آنحضرت صلعم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام مین جن چیزون کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ، (انعام-۱۹)	اور ناپ اور تول کو پورا کرو،

سورۂ بنی اسرائیل مین جو اخلاقی نصیحتین فرمائی گئی ہین، اُن مین سے ایک یہ ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ	اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھردو، اور سیدھی
الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا	ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے، اور اس کا انجام
(اسرائیل-۴)	اچھا ہے۔

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع مین کتنا ہی فائدہ پہنچائے، مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے،

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگون کے دلون سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ اُن کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھین ہر وقت کھلی ہین اور ایک دن آئیگا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین مین جہان

اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے، اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا ہے، فرمایا،

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا	خرابی ہے اُن گھٹا کر دینے والوں کی، جو اوروں
عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	سے جب ناپ کرلیں تو پورا لیں، اور جب ان کو
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ اَلَا يَظُنُّ	ناپ یا تول کردیں تو گھٹا دیں، کیا اُن کو یہ خیال
اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ	نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ،	کو اٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے
(مطففین-۱)	مالک کے لئے کھڑے ہوں گے،



چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیون مین ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علٰحدہ علٰحدہ نہ کیا گیا ہو اس مین سے کوئی چیز دوسرے ساجھیون سے چھپا کرلے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مالِ غنیمت مین جو بدیانتی اور چوری کیجائے اُس کو کہتے ہین، غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیون کا حصہ ہے جبتک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کردے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دیدے اس مین سے کچھ چھپا کرلے لینا غلول ہے، اور یہ ایسی برائی ہے جس مین بددیانتی اور چوری دونون ملی ہوئی ہین اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز مین ہر ایک کا حصہ ہے تو اس مین سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہوجاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہین ہوا ہے اس مین ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہین ہوسکتا دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس مین سے کوئی چیز چھپا کرلیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہین، اسی لئے وہ دوسرون سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کرلے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے،

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا اور چونکہ انبیا علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہین، اور وہ گناہون سے مبرا ہوتے ہین، اس لئے ان کی نسبت تو

کسی کو یہ وہم بھی نہین ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کرینگے، فرمایا،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ، اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہین کہ وہ غلیمت مین سے
(آل عمران - ۱۷) چھپا کر لے،

پھر فرمایا

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور جو کوئی غلیمت کا مال چھپا کرے گا تو قیامت
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ کے دن اپنا چھپایا مال لیکر آئے گا، پھر ہر کوئی
لَا يُظْلَمُوْنَ ه (آل عمران - ۱۷) اپنا کمایا پورا پورا پائے گا، اور اُن پر ظلم نہین کیا جائیگا

غزوۂ خیبر کے مالِ غلیمت مین سے مِدعَم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اُس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہوگیا، مسلمانون نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سنکر آنحضرت صلعم نے فرمایا، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر مین تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے، لوگون نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لاکر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے، آگ کا،[1]

خیبر مین ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اسکا جنازہ تیار ہوا تو آپ سے عرض کیا گیا، آپنے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سنکر لوگون کے چہرون کا رنگ بدل گیا، اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپنے فرمایا تمھارے بھائی نے مالِ غلیمت کی ایک چیز چھپا کرلی ہے، صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیون کا ایک ہار نکلا جو چند آنون سے زیادہ کا نہ تھا،[2] قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مالِ غلیمت

---

[1] و [2] ابوداؤد کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول،

لے کر آتے، پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا، اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا، اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلعم یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کیا تم نے بلال ؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی، پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے۔ اس نے معذرت کی، فرمایا تم اس کو قیامت میں لیکر آنا، میں نہیں قبول کرتا۔[۱]

عمّال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لاکر پیش کریں، فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کرلے گا، تو وہ غلول ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لیکر آئیگا"[۲]



[۱] ابوداؤد و کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول، [۲] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ،

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہین کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دیکر اپنے موافق کرلے،

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدمون کے فیصلے کرتے تھے، اہلِ غرض انکو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے اس کو حُلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑگیا، اس پر بھی آنحضرت صلعم نے کاہن کے حُلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[1]، عرب مین یہودیون کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے، اور چونکہ دولت اور قوت نے ان مین اونچے نیچے طبقے قائم کردیئے تھے، اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوت دیتے تھے، اور اُن کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلادیتے تھے، اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے[2]، چنانچہ توراۃ کے قوانین مین تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی، قرآن مجید کی اس آیت مین اُن کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ — خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہین اور اسکے

---

[1] مجمع البحار علامہ فتنی، [2] ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ مہر البغی، [3] صحیح بخاری رجم زانی،

الْكِتَابِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا — ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں
اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ — میں آگ بھرتے ہیں، خدا ان سے قیامت کے
اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ — دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کریگا
الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (بقرہ) اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے،

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں رد و بدل، اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لئے یہی سزا ان کو ملیگی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلعم کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے رد و بدل کیا کرتے تھے، اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ — اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی
وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا — اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، کیوں
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ — درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے، اور
وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ — حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے
السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (مائدہ ۹-۱۰) — کام ہیں جو وہ کرتے ہیں،
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ — جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے
(مائدہ ۶-۷) — کھانے والے،

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ — اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا	مت کھاؤ، اور نہ مال کو حاکمون تک پہنچاؤ، تاکہ
مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ	لوگون کے مال کا کچھ حصّہ گناہ سے کھا جاؤ، اور
تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ-۲۳)	تم جان رہے ہو،

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسرون نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت مین صاف وصریح ہے،

آنحضرت صلعم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونون پر لعنت فرمائی ہے[1] رشوت دینے والے پر یون کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے، اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونون مین منع ہے؛ خیبر کے یہودیون سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلعم حضرت عبداللہؓ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصّے کر دیتے تھے اور کہدیتے تھے کہ ان دو مین سے جو چاہو لے لو، یہودیون نے اپنے دستور کے مطابق اُن کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس مین چندہ کرکے اپنی عورتون کے کچھ زیور اکٹھے کئے، اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلہ تقسیم مین ہمارا حصّہ بڑھادو، یہ سنکر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق مین مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہین کرسکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہین کھاتے" یہودیون نے ان کی یہ تقریر سنکر کہا کہ "یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہین[2]"

اسی لئے آنحضرت صلعم نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[3]، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سنکر آنحضرت صلعم نے منبر پر کھڑے ہوکر تقریر کی، حمد وثنا کے بعد فرمایا،

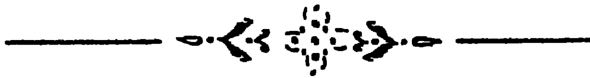
---

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ، [2] موطا امام مالک کتاب المساقاۃ [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ وکتاب الجہاد،

عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہین تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمھارا ہے، اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا مان کے گھر مین بیٹھ کر نہین دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہین یا نہین، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، وہ اس مین سے جو لے جائے گا وہ قیامت مین اپنی گردن پر لاد کر لائیگا، اونٹ گائے بکری جو کچھ

پھر آپنے اپنے دونون ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا، "خداوندا مین نے پہنچا دیا"[1]

اس تقریر مین آپنے جو کچھ فرمایا، وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے،



[1] صحیح بخاری باب ہدایا العمال،

سُود خواری

سود خواری، حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص وطمع تو یون کہ سُود خوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اُس کے پاس آجائے، بخل یون کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہین چاہتا، اور نہ کسی کارِ خیر مین دے کر اپنے سرمایہ مین کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ مین کیا ہے، اور ظلم یون کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگون کو اُن کی محنتون کے پھل سے محروم کر دیتا ہے، اور رحم نہین کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا،

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ۔ ۲۸۰) نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اُس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے، اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خوری کی عادت بھی عرب مین یہودیون کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیون پر نعمتون کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ مین ہے،

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۔ (نساء ۔ ۲۲)

اور اُن کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے، اور لوگون کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے،

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی، ہمیشہ کے لئے دور کر دیا۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا	جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے جیسے وہ
كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ	اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس
مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا	کھو دیئے ہوں، یہ اس لئے کہ انھوں نے کہا
الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ	کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے
وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ	اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال
مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ	اور سود کو حرام کیا ہے، تو جس کے پاس اس کے
وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ	پروردگار کی نصیحت پہنچی، اور وہ باز رہا، تو اس کا
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○	جو پہلے دیا گیا، اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے
يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ	اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں وہ دوزخ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۔	میں رہیں گے، خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات
(بقرہ - ۳۸)	کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیار نہیں کرتا۔

قیامت میں سود خوار کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انہیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے کیونکہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا، اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا، اور یہ نعمت کی ناشکری تھی،

یہودیون کی دیکھا دیکھی عربون مین بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباسؓ بن عبد المطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان مین سے قرضدارون نے مقروضون سے پہلے کا سود مانگا، تو اس پر یہ آیتین اترین، جو پہلی ہی آیتون کے سلسلہ مین ہین،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا	اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو، اور سود
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝	جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو تو
فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ	اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی
وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ	کے لئے ہشیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ تو تمھارے
أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝	لئے تمھارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ کوئی
وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ	تم پر ظلم کرے، اور اگر وہ (مقروض) تنگدست ہو
وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ	تو اس کو کشادگی تک مہلت دو، اور معاف کر دینا
تَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ	تمھارے لئے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو، اس
إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا	دن سے ڈرو جس مین تم خدا کی طرف لوٹائے
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝	جاؤ گے، پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائیگا جو اس نے
(بقرہ ۔ ۳۸)	کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائیگا،

ان آیتون مین یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئیگا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائین گے، اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اس کا حساب ہوگا، تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی، اور مقروضون کو معاف کیا ہوگا تو خدا کے یہان پورا پورا مل جائیگا،

جاہلیت مین ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے

پر مہاجنون سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کرسکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہین تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ مین دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے، اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہانتک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، خدا نے فرمایا،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا	اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت
اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ	کھاؤ، اور خدا سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ
تُفْلِحُوْنَ، وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ	اور اس آگ سے بچو جو منکرون کے لئے
لِلْكٰفِرِیْنَ ہ (آل عمران - ۱۴)	تیار کی گئی ہے،

اس آیت مین تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافرون کے لئے تیار کی گئی ہے، آنحضرت صلعم نے اپنے ایک رویاے صادقہ مین سود خوارون کو جس حال مین دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا مین نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس مین ایک آدمی تیر رہا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ مین پتھر لئے کنارہ کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہو کہ اسکا منھ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بنکر اس کے پیٹ مین چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیل نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر مین تیر رہا ہے، سود خوار ہے[۱]!

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہین سود خوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون مین تیرتا ہے، اور جو پتھر لقمہ تر بنکر اسکے منھ مین چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے،

گناہ کے شریک وہ بھی ہین جو کسی گناہ کی اعانت مین شریک ہون، اسی لئے آنحضرت صلعم نے سود کھانے والے سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے، اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی[۲]

شراب خواری

شرابخواری اُن عادات ذمیمہ مین سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومین اس مین مبتلا نظر آتی ہین، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے اُن مین بھی اسکی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے، اور اس کا پینا اچھا نہین سمجھا گیا ہے[1] لیکن اس کو حرام قطعی ٹھرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب عرب کی گھٹی مین پڑی تھی، شراب پینا، پلانا اچھے اچھے گھرانون مین لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بیبیان شوہرون[2] کو اور چھوٹے اپنے بزرگون[3] کو اپنے ہاتھون سے پلاتے تھے،

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگون نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت مین گرفتار رہتا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس مین لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلون مین آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ مین آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے، اور یہ نہین دیکھتے کہ یہ کس کا ہے[4]، اور ساتھیون کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا، اور اس مین مویشیون کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کئے جاتے ان کو سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبون کو بھی کھلاتے،

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہین،

---

[1] توراۃ [2] سبعۂ معلقہ مین قصیدۂ الاہبی بصحنک [3] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [4] سبعۂ معلقہ مین طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری مین حضرت حمزہؓ کا قصہ

خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بہت بڑی نعمت ہیں، لیکن تم اُن سے نشہ تیار کرتے ہو، اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا،

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ، (نحل - ۹)

اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے، تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کیلئے خدا کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں،

اس آیت میں نشہ کو "رزقِ حسن" کے مقابل میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ "رزقِ حسن" نہیں، ان آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں[۱]، اوپر دودھ اور گوبر اور خون، اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے، کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک، اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں،

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء - ۷)

تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو،

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی، اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا، کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ

(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوے کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہدے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے،

---

[۱] تفسیر کبیر امام رازی، [۲] مفسرین کی مختلف رائیں ہیں،

اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِہِمَا ۚ (بقرہ ۲۷-۲۷)

اور لوگون کے لئے کچھ فائدہ کی چیزین بھی ہین، اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے،

فائدہ یہ ہے کہ لوگون کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہین، دوسرون کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیان اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہین، اس آیت نے بہت سے لوگون کو ہشیار کردیا، اور وہ شراب سے تائب ہو گئے لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہین آیا تھا، اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھکر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ (مائدہ ۱۲-)

اے ایمان والو! شراب اور جوا، اور چڑھاوے کے بت اور پانسے، گندے کام ہین، شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، شاید تمھارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس مین شراب اور جوے سے دشمنی اور بیر ڈال دے، اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم باز آتے ہو،

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، خداوندا! ہم باز آگئے[1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیون مین خم لنڈھے جارہے تھے، اور شراب زمین پر بہائی جارہی تھی[2]

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہین، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس مین لڑتے جھگڑتے ہین، اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت

---

[1] ابوداؤد، اشربہ، [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ،

سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے

اوپر کی آیت میں شراب اور جوے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں

ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوے کو چڑھاوے کے بتوں، اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ

ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں سے شمار کیا ہے، اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست

میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی

برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے قصہ میں ہے کہ جب اُن کے گھونسہ سے اتفاق

ایک قبطی مر گیا تو فرمایا ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ. (قصص-۲) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی

برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بنی اسرائیل-۳) "بے شبہ فضول خرچ

کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں" کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوے، بتوں کے چڑھاوے

اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے اُن کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی

کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خواری

قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان، اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی

مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں،

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی، اور دوسری

مذہبی، معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں، اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش

کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش

آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد، اور نماز

سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے، غافل ہو جاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا

جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا، اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھالے وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے"[1] آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے"[2] فرمایا "جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہیگا"[3] آنحضرت صلعم جب معراج میں تشریف لیگئے تو آپ صلعم کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا، اور دوسرے میں شراب، سرور کائنات صلعم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا "اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی"[4] گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے"[5] یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائیگا"[6]

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِ ذرائع کے طور پر حرام کئے، یہانتک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا،[7]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ - ۱) "گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو"[8] کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لیجانا، سب حرام ٹھہرایا گیا، فرمایا "خدا نے شراب پر، اسکے پینے والے پلانے والے، بیچنے والے خریدنے والے، دوسرے کیلئے نچوڑنے والے اپنے لئے نچوڑنے والے، اسکے لیجانے والے اور جس کے پاس لیجائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے"[8] یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے، اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اُسکا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے"[9]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [2] صحیحین کتاب الاشربہ [3] ایضاً [4] [5] [6] [7] ایضاً [8] ابوداؤد کتاب الاشربہ [9] صحیحین ابوداؤد و ترمذی کتاب الاشربہ،

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ مین کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانون کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہین وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ، (آل عمران - ۱۴) اور دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا مَا غَضِبُوا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ (شوریٰ - ۴) "جب اُن کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہین"۔ انسان کا سکون کی حالت مین معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت مین جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہین ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اُس وقت بھی اپنے کو قابو مین رکھے، اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہین ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ مین اپنے کو قابو مین رکھے۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہؓ بن قدامہ، حضرت ابودرداؓ وغیرہ کئی صحابیون سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلعم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے،

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب،

ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کیا کرو" اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی، تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ "غصہ نہ کیا کرو"[1] مسند احمد میں ہے کہ اُن صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری برائیوں کی جڑ ہے،

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں، کہ ایک دفعہ آپ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں جنمیں سے ایک یہ تھی، فرمایا "آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے، اور سکون جلد ہو جاتا ہے، اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے، اور دور جلد ہو جائے، اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اسکی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے"[2]

ابو داؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے، اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہئے کہ وضو کرلے"[3] حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہئے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہئے کہ لیٹ جائے،[4]

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلعم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا، اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت صلعم نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا، مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ کہے،[5]

---

[1] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان وطبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب) [2] جامع ترمذی (منذری باب مذکور) [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظاً، [4] ایضاً [5] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب،

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ	معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی کی بات کہہ اور
عَنِ الْجٰهِلِيْنَ، وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ	نادانون سے درگذر کر، اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو
الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، اِنَّهٗ	ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہ سننے والا
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (اعراف-۲۴)	اور جاننے والا ہے،

اسی قسم کی آیت سورہ حٰم السجدہ (۵) مین بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے،

"نیکی اور بدی برابر نہین، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

آنحضرت صلعم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہین، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک مین ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ خداوندا! مین شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہون (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اوسکی سنیگا، اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہی تو خدا کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائیگا، دو ظاہری علاجون مین سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیلِ ہیئت سے طبیعت ہٹ جائیگی، اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصّہ کی حالت مین گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھین لال ہو جاتی ہین، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج مین ٹھنڈک آئیگی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی،

بغض و کینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف فرمائی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں
سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا	کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور
غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ	ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ،
رَّحِیْمٌ، (حشر - ۱)	اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے،

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہونگے، وہاں بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا،

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا،
عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ، (حجر - ۴)	بھائی بھائی ہوکر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے،
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا
مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ج (اعراف - ۵)	نہریں ان کے نیچے بہتی ہونگی،

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہیگا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئیگا،

آنحضرت صلعم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہئے فرمایا

"اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، اور اے اللہ

کے بندے بنکر آپس میں بھائی بھائی بنجاؤ، کسی بھائی کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے

زیادہ چھوڑ دے[1]"

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابو ایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منھ پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے[2]" ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے، تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ایک دوسرے سے آکر ملے، پھر سلام کرے، تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی، اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لیکر لوٹا[3]" کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں[4]" اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دیجاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہیں جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں[5]" یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشائش نہیں، ان میں سے ایک وہ جو اپنے سر

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و مالک، ابو داؤد و ترمذی، نسائی، [2] مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد [3] سنن ابی داؤد [4] مالک، مسلم، ابو داؤد، ترمذی و ادب المفرد بخاری [5] طبرانی فی الاوسط، (منذری ۲ ص ۱۴۴ مصر)

کینہ رکھتا ہے[1]،

ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق، جب تک شرک رہیگا اللہ کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کرسکے گا غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض وکینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور ان ہی دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے،

---

[1] ادب المفرد بخاری باب الشحناء،

ظلم

ظلم کا لفظ قرآنِ پاک مین کئی معنون مین آیا ہے، یہان تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنون مین بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہان مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندون پر کرتے ہین، قرآن مین اس کے لئے دو اور لفظ بَغی (سرکشی) اور عُدوان (تعدی) آئے ہین، یہ ظلم اسلام کی شریعت مین حرام ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ، (اعراف-۴)

کہدے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کامون کو جو کھلے ہون یا چھپے، اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ج (نحل-۱۳)

اور خدا بے حیائی، اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے،

ان دونون آیتون مین سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کیجائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ

انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی، تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہین، اور برائی کا عوض
وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ)	اسی طرح کی برائی ہے،

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اُس کے ساتھ کیجائے،

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہان پائے گا، اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہیگا،

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ	پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے، تو اس کی
لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○	مزدوری اللہ کے ذمہ ہے، بیشک اللہ ظالم لوگون کو
(شوریٰ - ۴)	پیار نہین کرتا،

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہین کیجا سکتی،

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے
مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ (شوریٰ - ۴)	تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہین،

ملامت اُس پر ہے، جو لوگون پر ظلم کرنے مین پہل کرے، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرے،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ	راہ ان پر ہے جو لوگون پر ظلم کرتے ہین، اور زمین مین
وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ	ناحق دھوم مچاتے ہین، ان کے لئے دکھ والی مار
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (شوریٰ - ۴)	ہے،

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلبِ قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی،

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ	اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے

سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ — زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے مین زیادتی نہ کرے

كَانَ مَنْصُوْرًا ○ (اسرائیل -۴) — بے شبہ اس کو مدد دیجائے،

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کیجائے، تاکہ دنیا مین عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثون کو بھی چاہیئے کہ انتقام کے جوش مین حد سے آگے بڑھ کر قاتل کیساتھ اس کے اور عزیزون اور دوستو کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگین، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام مین بھی کبھی ختم نہ ہوگا،

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیون کو علانیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہین، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے مین کچھ ہچکچا ئین گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگون کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا — اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہین آتا، مگر جس پر

مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ○ (نساء -۲۱) — ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا جانتا ہو،

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانون کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑین اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگون کرین،

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا — تو اگر ان مین سے ایک دوسرے پر چڑھ آوے تو

الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ○ — سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہانتک کہ

(حجرات -۱) — وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے،

یہ تو مسلمانون کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے، اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانون کو اس کا ساتھ نہین دینا چاہیئے، فرمایا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ — اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ تم کو مسجد حرام

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا — سے روکتی تھی اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم

عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى	زیادتی کر بیٹھو، اور نیکی اور تقویٰ کے کامون پر ایک
الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ	دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ٥	کی مدد نہ کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک
(مائدہ ۷-۱)	وہ سخت سزا والا ہے،

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا مین مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا مؤثر حربہ جس کا نام آجکل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے، اور صاف و صریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کامون مین ظالمون کا ساتھ نہ دیا جائے، اور اُن کے ظلم کے کامون مین شریک نہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتین زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہین،

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانون کو فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کیجا سکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کیجائے، فرمایا "اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے"[1] اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالئے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والون کے دلون مین توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہوگئے، تو اس کمالِ التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے،

آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز مین سنائی، فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندون سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! مین نے اپنے لئے اور تمھارے لئے آپس مین ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"[2]

---

[1] صحیح بخاری ابواب المظالم، و صحیح مسلم باب نصر الاخ ظالماً او مظلوماً، [2] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۵۴ و صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۵۴ و ادب المفرد بخاری باب الظلم،

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بنجائے گا[1]، ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یون ہو سکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسرون پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھاپن قیامت کے ہولناک دن مین اندھیرا بنکر نمودار ہوگا،

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے[2]، براءؓ بن عازب کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے ہم کو سات باتون کا حکم دیا، اور سات باتون سے روکا ہے، اُن مین ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کیجائے[3]، حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ نے یمن بھیجا، تو ان کو نصیحت فرمائی کہ مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ مین کوئی پردہ نہین[4]، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے، اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیان دلوائی جائینگی، اور نیکیان نہ ہونگی تو مظلوم کی بدیان ظالم پر لاد دیجائین گی[5]، فرمایا کہ ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہین[6]، فرمایا اہلِ ایمان جب دوزخ سے پاک ہو چکین گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائین گے، وہان دنیا مین ایک نے دوسرے پر جو ظلم کئے تھے، ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائیگا، جب اس سے بھی پاک ہو جائین گے تب اُن کو بہشت مین جانے کی اجازت ملیگی[7]۔



[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم [2] صحیح بخاری ابواب المظالم [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [7] صحیح بخاری ابواب المظالم،

فخر وغرور

انسان مین جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل مین اوس کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہین لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کرجاتا ہے کہ وہ اور لوگون کو جنمین یہ وصف نہین پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہی، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے، تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہین دنیا مین سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ مین اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف-۲) مین اس سے بہتر ہون، وہ مٹی سے بنا ہے، اور مین آگ سے بنا ہون، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ (اعراف-۲) یہان سے اتر جا یہان تجھے غرور کرنا زیبا نہین نکل جا تجھ بڑائی کے بدلہ یہان ذلت کی بائی کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہین، بلکہ اس تخیل کیساتھ دوسرے لوگون کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ مین ایک حسین شخص ہون، اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، مین یہ نہین پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن مین تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہین تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے، اور لوگون کو حقیر سمجھا جائے[1] تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اسکو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیون کا سرچشمہ بنادیا، پیغمبرون کی مزاحمت

---

[1] ابو داؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر

صرف وہی لوگ کرتے ہین، جو اپنے آپ کو اور لوگون سے بڑا سمجھتے ہین، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبرون کی ہدایت کو قبول کر لیتے،

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ابراهيم - ۳)

اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کھڑے ہونگے تو (جو لوگ دنیا مین) کمزور تھے (اس وقت) ان لوگون سے جو بڑی عزت رکھتے تھے کہین گے کہ ہم تو تمھارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب خدا مین سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو،

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو بڑی بڑی نشانیان دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھون نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے،

فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ، (مومنون - ۳)

تو وہ سب شیخی مین آگئے، اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ،

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانون کی طرح کھاتا پیتا اور بازارون مین چلتا پھرتا ہو اطاعت کرنا پسند نہین کرتے تھے، اُن کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے مین عام لوگ شامل ہوگئے ہین، انہین وہ بھی شامل ہو جائین،

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِينَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ

اس پر اون کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہین مانتے تھے، لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو، اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ

الرَّأْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ، (ھود-۳)

تمھارے پیرو ہو گئے ہین جو ہم مین رذالے ہین، (اور پیرو ہو بھی گئے ہین تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگون مین اپنے سے کوئی برتری نہین پاتے، بلکہ ہم تمکو جھوٹا سمجھتے ہین،

غرض پیغمبرون کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگون کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگون سے یا خود پیغمبرون سے بڑا سمجھتے تھے، اس لئے اللہ تعالٰی نے قرآن مجید مین نہایت شدت سے ان لوگون کی برائی بیان کی ہے، اور مختلف الفاظ مین بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیشِ نظر ہو جائین، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہین بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ، (ص-۱)

لیکن جو لوگ منکر ہین (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت مین (پڑے) ہین،

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبّار اختیار کیا ہے،

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ، (مومن ۴)

جتنے مغرور اور سرکش ہین، اللہ ان کے دلون پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے،

دو موقعون پر اس کے لئے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہین جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہین،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (نساء-۶)

اللہ اس کو پیار نہین کرتا جو مغرور اور فخار ہو،

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (نحل-۳)

اللہ غرور کرنے والون کو پسند نہین کرتا،

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہین دیدی گئی ہی،

اَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ، (زمر-۷) کیا جہنم مین مغرورون کا ٹھکانا نہین،

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ، (زمر-۸) تو دوزخ مغرورون کا ٹھکانا ہی،

مغرورون کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہی کہ انکا یہ غرور اُنکو حق کے قبول سے باز رکھتا ہی،

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہین، ان کا کوئی شمار ہی نہین کیا جاسکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگون کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہین، بلکہ بہت سے لوگون کو اس قابل بھی نہین سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگون سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کرین، راستے مین لوگون سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسون مین صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزارون صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اور اسی بنا پر رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل مین رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا[1]، اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ مسلمانون کے جو مخصوص اخلاق ہین وہی جنت کا دروازہ ہین، اور غرور ان تمام دروازون کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل مین ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا، یعنی دنیا کی طرح آخرت مین بھی مسلمانون سے الگ تھلگ رہیگا،

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگون مین پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج گوناگون صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اس لئے ان سب کا استقصار تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیئے ہین، مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہین، ان کے متعلق رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہین، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم مین بنا لینا چاہئے، ایک بار آپ خود

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر

عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابۂ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ عجمیون کی طرح تعظیم کیلئے کھڑے نہ ہوا کرو[۱]
بڑے آداب و القاب کا اپنے نامون کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلاف واقعہ ہون تو جھوٹ ہے اور
اگر واقعہ کے مطابق ہون تو فخر و غرور کا ذریعہ ہین عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے
تھے، آنحضرت صلعم نے فرمایا سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے[۲]

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتون کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید مین کیا ہے، مثلاً

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ	اور زمین مین اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس وضع کے
تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝	کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہین سکیگا
(بنی اسرائیل - ۴)	اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑون کی لمبائی کو پہنچ سکیگا
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ	اور لوگون سے بے رخی نہ کر اور زمین مین اترا کر نہ چل
فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ	بیشک اللہ اس کو پیار نہین کرتا جس کو گھمنڈ ہو
مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ (لقمان - ۲)	فخار ہو،

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے،

ثَانِيَ عِطْفِهِ، (حج - ۱)	اینٹھتا ہوا،

رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے،

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ	جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا، خدا اس کی
يَوْمَ الْقِيَامَةِ[۳]	طرف قیامت کے دن نہ دیکھیگا،

ایک حدیث مین ہے کہ گذشتہ لوگون مین ایک شخص ایک جوڑا پہنکر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس مین دھنسا چلا جارہا ہے[۴]، اس کے برعکس بہت سے افعال

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [۲] صحیح بخاری [۳] ابو داؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار [۴] ترمذی ابواب القیامۃ

ہین جو تواضع وخاکساری پر دلالت کرتے ہین، اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى	اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہین
الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلین اور جب جاہل ان
قَالُوْا سَلٰمًا،	سے (جہالت کی) باتین کرنے لگین تو (ان کو سلام
(فرقان-٦)	کرین (اور الگ ہو جائین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے، فرمایا "خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہین بنایا ہے"[۱]

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور ومتکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر وغرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہین کہ لوگون کا خیال ہے کہ مین مغرور ہون، حالانکہ مین گدہے پر سوار ہوتا ہون، کمل اوڑھتا ہون، اور بکری کا دودھ دوہتا ہون، اور رسول اللہ صلعم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس مین غرور نہین پایا جاتا[۲]،

کبر وغرور کے اسباب بہت سے ہین، لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزون پر غرور کرتے ہین وہ یہ ہین، حسب ونسب حسن وجمال، مال ودولت، قوت اور اعوان وانصار کی کثرت، اسلام نے ان مین سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کردی اور بتا دیا ہے کہ ان مین سے کوئی چیز فخر وغرور کا ذریعہ نہین،

عربون کے فخر وغرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب ونسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہکر مٹا دیا،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى	لوگو ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	(حوا) سے پیدا کیا، اور (پھر) تمھاری ذاتین اور برادریان

---

[۱] ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئا [۲] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الکبر،

(حجرات - ۲) ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو،

اس کے بعد بتایا کہ شرافت وعظمت کی بنیاد نسب وحسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے،

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ، اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں

(حجرات - ۲) بڑا پرہیزگار ہے،

اور رسول اللہ صلعم نے اس کی مزید تشریح کی، اور فرمایا کہ خداوند تعالی نے تمھارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار، اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منھ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے[1]

جہانتک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن وجمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتہ عمدہ ہو، تو فرمایا کہ "خدا حسن کو پسند کرتا ہے"[2] یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن وجمال، غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بنجاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جنھیں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے، اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا،[3]

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا، اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر وغرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار،

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ،	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد
(حدید۔۳)	کا خواستگار ہونا، (بس یہی کچھ ہے)

احادیث مین مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کیگئی ہے، ان مین ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بنجاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہین کہ اس سے اپنی اور دوسرون کی ضروریات پوری کیجائین ایک حدیث مین ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب مین باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ مین دے ڈالا، کھاپی ڈالا، اور پہنکر پھاڑ ڈالا[1]

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جا سکتے ہین، اس لئے اس قسم کے موقعون پر وہ ایک قابلِ ستایش وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید مین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "قوی امین" کہا ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے،

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ،	(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھکو تمھارے مقابلے کی طاقت ہوتی، یا مین کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا،
(ھود۔۷)	

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت مین تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے،

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ	اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگون

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا،

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً، (روم - ۶)

کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا، پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی،

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے،

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، (انفال - ۸)

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہوسکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے

قرآنِ مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[1] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابلِ ستائش وصف ہے، اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ

الا اخبرکم باھل الجنۃ کل ضعیف متضعف الا اخبرکم باھل النار کل

کیا میں تمکو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں

[1] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز،

عتل، جواظ متکبر[1]، | کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص،

دوسری حدیث میں ہے،

احتجت النار والجنۃ فقالت ھذہ | دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ نے
یدخلنی الجبارون المتکبرون وقالت | کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوئے، اور جنت
ھذہ یدخلنی الضعفاء والمساکین[2] | نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ،

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اسکو صرف اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے، اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں، اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں، زمانۂ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہینگی اور قیامت کبھی نہ آئیگی، اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہیگی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے،

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۔ | میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا بھی
(کہف - ۵) | بڑا زبردست (جتھا) ہے،

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لئے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں،

اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ | کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے، جس نے تجھ کو
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۔ | (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا
(کہف - ۵) | آدمی بنایا،

[1] بخاری کتاب الادب باب الکبر [2] مسلم کتاب صفات المنافقین واحکامہم باب النار یدخلہا الجبارون،

نتیجہ یہ ہوا کہ عذابِ الٰہی نے اس کی دولت کو ملیامیٹ کر دیا اور اس کا جتھا نوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر و غرور کے قابل نہین، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور زندون سے گذر کر مردون کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر و غرور مین باہم مقابلہ ہوتا تھا، اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ مین انسانون کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی،

اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ،	تم کو مال اور اولاد کی کثرت مین ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہانتک
(تکاثر - ۱)	کہ تم قبرون سے جا ملتے ہو،

لیکن اسی کے ساتھ اسلام مین یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہین، بلکہ اجتماعی و تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے اسی لئے رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے

تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم[1]،	محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرتِ تعداد مین مین تم پر دوسری قومون کے مقابل مین فخر کرونگا،

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قومون اور ملکون کی سیاست کا رُخ بدل دیا ہے، اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا،

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار،

ریا

ریا، کے لغوی معنی دکھاوا اور نمایش کے ہین، انسانی اعمال کی اصل حقیقت اُن کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثون مین ہے کہ اِنّما الاعمال بالنیات عمل نیت سے ہی، اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کردیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہوجاتی ہے، نمایش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کرکے لوگون مین اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے، اور اپنے کو بڑا کرکے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہی، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہین، اسی لئے قرآن نے ان دونون کو ایک ساتھ جگہ دی ہی اور انکی برائی بیان کی ہی، جہاد مین مسلمانون کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور، اور اپنی قوت کی نمایش تمھاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمھارا مقصد ہو، فرمایا،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم	اور ان کافرون) جیسے نہ ہو، جو مارے شیخی کے
بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ،	اور لوگون کے دکھانے کے لئے اپنے گھرون سے
(انفال-۹)	نکل کھڑے ہوئے،

یہ ریا اور نمایش انسان کے ہر اس عمل مین ظاہر ہوتی ہے، جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے

کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال مین خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لئے خدا فرماتا ہے:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ، — کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

(فرقان - ۴)

ایک حدیث مین ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین شرک سے بے نیاز ہون تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس مین کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہین وہ اسی کے لئے ہے جسکو اس مین شریک کر لیا گیا ہے۔"

ایک صحابی روایت کرتے ہین کہ قیامت کے دن جب خدا اگلون اور پچھلون کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل مین جو خدا کے لئے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن مین یہ نہین کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتون کی پرستش کرنے لگیگی، بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگون کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی[۱]

اسلام کے لغت مین کفر کے بعد برائی مین نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل مین کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا، اور نمائش کے سوا کچھ نہین رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف و خطر یا دوسرے دنیوی فائدون کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجا لاتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال مین ریاکاری پائی جاتی ہے، اسی بنا پر قرآنِ مجید مین جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے،

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو)
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ	طعن دے کر اُس شخص کی طرح اکارت مت کرو
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	جو اپنا مال لوگون کے دکھاوے کے لئے خرچ
الْاٰخِرِ (بقرہ - ۳۶)	کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہین رکھتا

منافقون کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتین ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ اُن کا مقصد ایک جماعت مین شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہین ہوتا، دوسرے یہ کہ اُن کے ذریعہ سے لوگون پر اثر ڈالنا، اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہین، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع، للٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے،

عہدِ رسالت مین منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانون کی جماعت مین شامل رہین، اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمایش سے اُن کو مسلمان سمجھتے رہین، اسی لئے ایسے شخص کے عمل مین للٰہیت اور خلوص نہین پیدا ہو سکتا،

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ	منافق، (مسلمانون کو دھوکا دے کر گویا) خدا کو دھوکا
خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ	دیتے ہین، حالانکہ (حقیقت مین) خدا اُن ہی کو دھوکے
قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا	مین ڈالے ہے، اور (یہ لوگ) جب نماز کے لئے
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا	کھڑے ہوتے ہین تو الکساتے ہوے کھڑے
	ہوتے ہین، (ظاہرداری کر کے) لوگون کو دکھاتے
(نساء - ۲۱)	ہین اور (دل سے) اللہ کو یاد نہین کرتے مگر کچھ یون ہی سا

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ، (ماعون)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں، اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں،

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلعم آنکلے اور فرمایا کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ صحابہ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرک خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے"۔

چونکہ ریا اور نمایش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلعم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخکنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، رسول اللہ صلعم نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لئے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے،

ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، (بقرہ ۔ ۳۷)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اسکو چھپاؤ اور حاجتمندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)

ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لیگا، جنمین ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائین ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا[1]،

عرب کے محاسنِ اخلاق مین سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی، اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانون کے لئے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہوسکتے تھے، اس لئے وہ ریاکاری کی نمایشگاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانون کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے، ایک شخص شہرت کے لئے، اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے، تو ان مین کس کا جہاد خدا کی راہ مین ہے، فرمایا اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد خدا کی راہ مین ہے، وہی پہلا جواب ملا[2]،

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہو اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی اس لئے اس مین ریاکاری کی جو آمیزش ہوسکتی تھی، اس کے نتائجِ بد رسول اللہ صلعم نے نہایت مؤثر طریقے سے بتائے، ایک حدیث مین ہو کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا، جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائیگا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہیگا کہ مین تیری راہ مین لڑا اور شہید ہوا، خدا کہیگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اسکو گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائیگا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگون کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا،

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین، [2] مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ،

اُس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائیگا اور وہ جواب مین کہیگا کہ مین نے علم سکھا، علم سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح وہ گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائیگا اس کے بعد ایک دولتمند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہیگا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھکو پسند تھے، مین نے سب مین اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہین، پھر اسی طرح اسکو گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائیگا[1]۔



[1] مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق بالنار،

خودبینی اور خودنمائی

خودبینی، خودنمائی اور خودرائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس مین اور کبر مین یہ فرق ہو، کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسرون سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن خودبینی کیلئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہان تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے،

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیان نظر آتی ہین وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہو کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے، اور یہ تمام کمالات اور خوبیان اس کو ایسی معلوم ہوتی ہین گویا وہ خود اس کی اختیاری ہین، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہین، اسی کا نام عُجب اور خودبینی ہے، اسی سے نفس مین خودنمائی اور خودرائی پیدا ہوتی ہے، اور اکثر حالتون مین وہ کبر و غرور کا سبب بنجاتی ہے،

حُنین کی لڑائی مین مسلمانون کی تعداد کافرون سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانون مین عُجب پیدا ہوا کہ آج کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے، خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانون کا یہ عُجب دور ہوا، تب نصرتِ الٰہی نے ان کے پاؤن تھام لئے، اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا،

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا، (توبہ - ۴)	اور حُنین کے دن جب تمہاری کثرتِ تعداد نے تم مین خودبینی پیدا کردی، تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا،

اسی لئے مسلمانون کو یہ تعلیم دیگئی کہ جب وہ جہاد کو نکلین تو اُن مین جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمایش نہ پیدا ہو بلکہ اُن مین سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم — اور ان لوگون کی طرح نہ ہو جو اپنے گھرون سے اتراتے

بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ، (انفال-۶) — اور لوگون کو دکھاتے نکلے،

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمایش کو نکلے تھے،

جب کسی قوم مین تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد مین خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندون کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ مین رہتا ہے، اور یہی اُن کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا،

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا — اور کتنی بستیان ہم نے برباد کر دین جب وہ اپنے

(قصص ۶) — گذران مین اترا چلین،

یہ تو چند بستیون کی تباہی کا حال تھا لیکن ایک وقت آئیگا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائیگی یعنی قیامت آئیگی، تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیان آنحضرت صلعم نے بتائی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی راے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کریگا، اور اترائیگا اور یہی وہ موقع ہے جس مین ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہئے[1]

مذہبی حیثیت سے جن لوگون کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے،

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ — تو (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو، پرہیزگارون

(نجم ۲) — کو وہی خوب جانتا ہے،

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ مین عُجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے

---

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم،

آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے،

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ، (مائدہ ۔۳) — اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں،

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ، (جمعہ) — (اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو،

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عُجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا،

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ صلعم نے سنا تو فرمایا کہ تم نے اس کو ہلاک کر دیا[1] ایک بار آپ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں[1]، مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہو کہ اس سے ممدوح میں عُجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا

لَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (حدید ۔۳) — خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التمادح،

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت، اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا، اور عربون کی فیاضی فضولخرچی کی حد تک تھی، اسلئے تمام مذہبون مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد مین رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہوکر فنا ہوجاتا ہے، اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہین پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور، اور نمایش کے پردہ مین ظاہر ہوتی ہے، اور ان بداخلاقیون کی برائی چھپی نہین،

اہل عرب جب جلسون مین شراب پیتے، اور جوا کھیلتے تو جوا مین جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ مین اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کرڈالتے، جاہلیت کی شاعری مین اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہین، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہانتک کہ دونون مین ایک کے تمام اونٹ ختم ہوجاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل مین مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس ریائی فیاضی کو روک[1] دیا،

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی، اور اس نے اُن کی فیاضی مین بے اعتدالی پیدا کردی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور

---

[1] ابوداؤد ۲ ذبائح،

دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اوڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہین ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمایش کے موقعون پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالی نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ	اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو انکا
ابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا،	حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ	(کیونکہ دولت کے) بیجا اڑانے والے شیطانون کے
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا، (بنی اسرائیل ۳)	بھائی ہین، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے، امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین،

"بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے۔"

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبون مین اس قسم کی فضول خرچیون کے مرتکب ہوتے ہین، وہ قرآن کی اصطلاح مین شیطان کے بھائی کہلائین گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہین ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے، اور اسی کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہیدست ہو کر کسی کام کے نہین رہو گے، بلکہ الٹے تمھین کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائین گے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ	اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑ رکھو (کہ گویا) گردن مین بندھا
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا	ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے تو تم
مَّحْسُوْرًا،	ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کرینگے
(بنی اسرائیل ۳)	(اور تم تہی دست بھی ہو گے،

چونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانون کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ	اور خرچ کرنے لگین تو فضول خرچی نہ کرین اور نہ
يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا،	بہت تنگی کرین بلکہ اُن کا خرچ افراط اور تفریط کے
(الفرقان)	درمیان بیچ کا ہو،

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے، اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے مین ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہئے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہین کرنا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف مین خدا فرماتا ہے،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ	اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بیشک اللہ
الْمُسْرِفِيْنَ، (اعراف - ۳)	فضول خرچی کرنے والون کو پیار نہین کرتا،

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہین، مگر اس مین بھی بعض مفسرون کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہین،

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ	درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ، اور اسکا
يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ	حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو،
الْمُسْرِفِيْنَ، (انعام - ۱۷)	اللہ حد سے آگے بڑھنے والون کو پسند نہین کرتا،



حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزون کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل مین ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہین اور یہ کوئی بداخلاقی نہین، بلکہ دینی امور مین پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزون کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتین اس سے چھین لیجائین، تو اسی کا نام حسد ہے، اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت مین خداتعالیٰ نے مسلمانون پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھکر مسلمانون کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے،

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ، (النساء - ۸)

یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگون کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے، اس پر جلے مرتے ہین،

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانون سے چھین لیجائے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ، (بقرہ - ۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہین کہ تمھارے ایمان لانے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دین،

حسد کی تین قسمین اور درجے ہین،

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کرلیجائے، گو وہ اوس کو نہ حاصل ہوسکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے، اور اسی بناپر منافقین کی خواہش تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہوجائین،

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً، (نساء - ۱۲)	ان منافقون کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہوگئے ہین، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہوجاؤ،

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہوجائے، اس صورت مین اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لیجائے، اس کو مل نہین سکتی، اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کرلیجائے،

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کرلیجائے،

ان مین پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہو، دوسری صورت مین چونکہ زوالِ نعمت بالذات مقصود نہین ہوتا اس لئے اس کو حقیقی معنون مین حسد تو نہین کہہ سکتے، تاہم قرآنِ مجید مین ہے،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، (النساء ۵)	اور خدا نے جو تم مین سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو،

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہین ہے، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہین، اسی لئے فرمایا،

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ، (نساء-۵) اور خدا سے اس کا فضل مانگو،

تیسری صورت بالکل مذموم نہین بلکہ دینی امور مین مستحسن ہی، اور شریعت مین اسی کو مسابقت کہتے ہین

حسد کے سات اسباب ہین،

(۱) بغض و عداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہی کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونون یکسان ہون، اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے، اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہین کرتا اور اسی کا نام حسد ہے،

کفار اور منافقین کو مسلمانون کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی،

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ، (آل عمران-۱۱)

چاہتے ہین کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتون سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلون مین (بھرے) ہین وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہین،

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا، (آل عمران-۱۲)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہین،

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہین بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہی،

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال و اقران مین جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہمچشمون کو گران گذرتا ہے، اور وہ اس کے اس

ترفع کو پسند نہین کرتے اور چاہتے ہین کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے،

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے، اس لئے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے، کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانون کی حقیر جماعت کو دیکھکر کہتے تھے۔

اَهٰۤؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا، (انعام ۶) | کیا یہی (ذلیل) لوگ ہین جن پر اللہ نے ہم مین سے (اسلام کی توفیق دیکر) اپنا فضل کیا ہے،

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسرون کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے،

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے بندا مین جسکو معمولی آدمی سمجھتے ہین اسکو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو اُن کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہین، کفار اسی وجہ سے پیغمبرون کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اور تعجب سے کہتے تھے،

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا، (بنواسرائیل ۱۱) | کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے،

(۵) حسد کا پانچوان سبب یہ ہے کہ جب دو شخصون کا مقصد ایک ہوتا ہے، تو دونون باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اور ان مین جب ایک کو اس مقصد مین کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویون، اور ایک باپ کے متعدد بیٹون مین جو رشک و حسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیون نے اُن کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اسکا سبب یہی تھا،

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ، | جب یوسف کے (بے مات) بھائیون نے (آپس مین) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیون کی بڑی جماعت

ہے تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (ابن
یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ
عزیز ہیں، (یوسف ۔ ۲)

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار رہنا چاہتے ہین جب اُن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس مین ان کا شریک و سہیم ہوگیا ہے تو یہ ان کو سخت گران گذرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت مین انکا شریک ہوگیا ہے وہ اس سے چھن جائے،

مسلمانون کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے اُن کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہلِ عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخکنی پر آمادہ ہوگئے، منافقین مین عبداللہ بن ابی کو اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کردیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع مین وہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا[1]

(۷) حسد کا ساتوان سبب خبثِ نفس اور بدطینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت مین دیکھتے ہین تو ان کو ناگوار ہوتا ہے، اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت مین حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہین،

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگون سے تعلق رکھتے ہین جنمین کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بیگانون مین یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا بلکہ صرف ان لوگون مین پیدا ہوتا ہے، جنمین باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے،

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین،

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان مین ایک چیز یعنی علم وعبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہین ہوتا، کیونکہ ان مین کوئی چیز مابہ الاشتراک نہین،

اسلام نے مسلمانون مین باہم اخوت کا رشتہ قائم کرکے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کردیا تھا اس لئے اُن مین حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوسکتا تھا، اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہین وہ سب کے سب اس وسیع برادری مین جمع ہوسکتے تھے، اس لئے اصولاً جو بداخلاقیان اس اخوت کا شیرازہ برہم کرسکتی تھین، رسول اللہ صلعم نے اُن سب سے مسلمانون کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا،

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث	بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات
ولاتحسسوا ولاتجسسوا ولاتحاسدوا	ہے نہ لوگون کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد
ولاتدابروا ولاتباغضوا وکونوا	کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ
عباد اللہ اخوانا،	باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے بندو، بھائی بھائی
(بخاری کتاب الادب باب ماینھی عن التحاسد والتدابر)	ہوجاؤ،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح مین قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے،

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقۃ	اس کے معنی یہ ہین کہ رحم وشفقت، غمخواری، محبت،
والرحمۃ والمحبۃ والمواساۃ والمعاونۃ	اعانت اور خیرخواہی مین نسبی بھائیون کی طرح
والنصیحۃ،	ہوجاؤ،

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیون سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہوجائے گی، اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہین یا اُن سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہوجائینگے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

كانه قال اذا تركتم هذه المنهيات كنتم اخوانا ومفهومه اذا لم تتركوها تصيروا اعداء ومعنى كونوا اخوانا اكتسبوا ما تصيرون به اخوانا مما سبق ذكره وغير ذلك من الامور المقتضية لذلك نفيا واثباتا،

(فتح الباری جلد دہم ص ۴۰۳)

گویا رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دوگے تو بھائی بھائی ہو جاؤگے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑوگے تو دشمن ہو جاؤگے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بنجاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں،

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا، شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اسکی وجہ سے اسکو مت چھوڑو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اسکو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ، لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دیگا، اسی بنا پر رسول اللہ صلعم نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا،

ابو داؤد ج ۲ کتاب ا باب فی

اياكم والحسد فان الحسد ياكل الحسنات كما تاكل النار الحطب،

تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے،

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ، (فلق)

اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے،

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمین ہین، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک، نوجوان اور بے تکلف دوست و احباب ہوتے ہین، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتین قائم ہوتی ہین تو عورتون کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلے مین اس قسم کے حالات و واقعات بیان کئے جاتے ہین، جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہین،

عربی زبان مین اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہین، اور قرآن مجید کی اس آیت مین،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، (بقرہ - ۲۵)	حج کے دنون مین نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی،

اسی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ مین مردون اور عورتون کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر مین پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جاسکتے ہین، حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکر الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہین، بلکہ اسلام مین عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد مین ہے، کہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے عورتون اور مردون کے ایک مجمع مین خطبہ دیا، اور حمد و ثنا کے بعد مردون

کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم مین کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردے مین چھپ جاتا ہے؟ لوگون نے کہا ہان" پھر فرمایا کہ اس کے بعد لوگون کی صحبتون مین بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ مین نے یہ کیا مین نے یہ کیا۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے، پھر عورتون کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟ اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھکر کہا کہ "ہان مرد اور عورت دونون اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہین" فرمایا "تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اُس چڑیل کی ہے جو گلی مین ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے"[1]

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونون کی بے شرمی کی صورت یکسان ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال مین برقرار رہے، ورنہ جب باتین زبانون پر آئینگی تو وہ اپنی اہمیت کھو دینگی، اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دیگا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتون کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتین پیش آتی ہین تو مجاز و استعارہ کی زبان مین ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید مین اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ مین بیان کئے گئے ہین، مثلاً،

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (نساء۔۳) حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی صحبت ہو چکے)

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ، (نساء۔۷) یا تم نے عورتون کو چھوا ہو (یعنی اُن سے صحبت کی)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لئے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہین، جو فقہی مسائل کی تشریح مین مجبوراً آتے ہین، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہین، لیکن حقیقت در

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اہلہ،

وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب، اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض، ... . . کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیئے، پاخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں "قضائے حاجت" کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اسکے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں،

اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (نساء ۔) یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہوکر) آیا ہو،

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لئے استعارۃً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا،

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پاخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائین خانہ ہے، چونکہ پاخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لئے استعارۃً اُن کو پائین خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پاخانہ ہوگیا، اور اب کثرتِ استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوء کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں،

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى، (طٰہٰ ۔ ۱)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں کر لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدون اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے،

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے، جس کا نام سبّ و شتم یا گالی گلوج ہے، اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانۂ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک عام لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ ۔ ۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیئے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی،

گالی گلوچ کی مختلف صورتین ہین بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب مین عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہان تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام مین مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتون مین اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے،

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتون کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ، (نساء-۲۱)	اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہین مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)

اور قرآن وحدیث مین جا بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہین،

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ مین لوگ عموماً تعدی کرتے ہین یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونون کو اس مین شامل کر لیتا ہے، اس لئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دیجائے، خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت مین یہی نکتہ بیان کیا ہے،

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ، (انعام-۱۳)	اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن معبودون کو یہ پکارتے ہین ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر خدا کو برا کہنے بیٹھین گے،

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث مین اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا کہ یا رسول اللہ کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا "اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہیگا، تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونون کو برا بھلا کہیگا"[۱]

[۱] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہوجاتا ہے، اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلعم سے ملنے آیا، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے" لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا "عائشہؓ تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں"[1]

(۳) بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ صلعم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے[2]، امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جاہلیت ہے۔

(۴) رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے، ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے "السام علیکم" (تم کو موت آئے) کہا، حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا "علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم" یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے، اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو، رسول اللہ صلعم نے سنا تو فرمایا کہ "اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو"[3]

(۵) گالی گلوج کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے، اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے، اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔ [2] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن [3] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔

یہی سبب ہے کہ حدیث مین آنحضرت صلعم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے، کہ "بدزبانی جس چیز مین شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز مین ہوتی ہے اس کو زینت دیدیتی ہے[1]" اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہی،

(۶) گالی گلوج سے لوگون کے دلون کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانون کو ایذارسانی سے احتراز کرنا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہین[2]، مُردون کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندون یعنی مردون کے عزیزو اقارب اور دوست و احباب کے دلون کو اذیت پہنچتی ہے[3]،

(۷) گالی گلوج لڑائی کا پیش خیمہ ہے، اور مسلمانون کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہین توکم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

سباب المسلم فسوق وقتاله کفر[4]، مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر،

ان تمام مراتب کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی مین مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا،

لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی[5]، جو مسلمان ہے وہ طعن وتشنیع نہین کرتا، لعنت نہین بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا،

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الفحش، [2] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل،
[3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الشتم، [4] بخاری کتاب الادب باب مانہی من السباب واللعن،
[5] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ،

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے[1]،

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مشیئتِ الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے، اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلعم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے کہ "خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں[2]" یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو برا بھلا کہنا ہے،

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اوڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے[3]"

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ صلعم نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا[4]، اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے،

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دلآزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرفِ عام میں گالی نہیں ہے لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی[5]،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا،

---

[1] بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [2] بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدہر [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ، [5] بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن و مسلم کتاب الایمان،

تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح وتشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہو گا، بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلعم نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے،

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، اُن کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کیگئی ہے، اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و رد میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے، اس لئے صرف اُن ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جنکو فلسفۂ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھکر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے،

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں، اور جس قدر رذائل ہیں ان میں اُن ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے،

سب سے پہلی اساسی برائی **عدم صدق** ہے، اس سے مقصود یہ ہے، کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغلخوری، دورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک

---

[1] فتح الباری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن،

جڑ کی مختلف شاخین ہین، دوسری اساسی برائی حبِ مال ہے، حبِ مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص وطمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول مین کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہین، تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عُجب، فخاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ، ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہین، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینون اساسی برائیون سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرے گا، یہ تینون اساسی برائیان ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بیجا خواہشین ہین، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت مین آرام پائے گا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ	اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے
عَنِ الْهَوٰى، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى،	سے ڈرا، اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا، تو
(نازعات - ۲)	جنت اس کی آرامگاہ ہے،



آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزو ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے، ان آداب میں خوبی ولطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے، اسکی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے، اور انسان مہذب، شایستہ اور باوقار بن جاتا ہے،

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں، کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجا لانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے، اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کیساتھ انجام پائے، پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے،

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی ہیئت کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اسکے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لیکر جاتا ہے اور انکو چند روز میں مہذب اور شایستہ بنا دیتا ہے،

ہمارے محدثینِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارمِ اخلاق سے الگ کر دیا ہے، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں جمع کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابو داؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کرکے ذیل میں لکھتے ہیں،

فطری آداب

اسلام دینِ فطرت ہے، اس لئے اُس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں، اور تمام انبیاء علیہم السّلام نے اُن کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شایستہ اور ناشایستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، سواک کرنا، اور نکاح کرنا،[1] ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے،

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی سترِ عورت، اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور اُن کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہانتک کہ توراۃ کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے،[2]

حضرت ابراہیم علیہ السّلام انسانیت کے سب سے پہلے معلّم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جبکہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں، امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں، اور ناخن کٹائے،[3] ایک حدیث ہے؛ ایک

[1] ترمذی ابواب ... ح،
[2] توراۃ پیدائش باب ۱۷
[3] ادب المفرد ... ختان ...

صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خصالِ فطرت پانچ ہین ختنہ کرنا، موئے زیرناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا، ایک دوسری حدیث مین یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہین، مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک مین پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیون کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال بنوانا، موئے زیرناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسوین بات مین بھول گیا، غالباً کلی کرنی ہوگی،

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بنگئے ہین، چنانچہ وضو مین مسواک کرنا مستحب اور انگلیون کا دھونا ناک مین پانی ڈالنا، اور کلی کرنا واجب قرار دیا گیا ہے،

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھین ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہین، جن کے ناخن بڑے اور مونچھین بڑی ہوتی ہین وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کرکے کھاتے پیتے ہین، جس سے نہ صرف دوسرون کو کراہت معلوم ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ مین ناخن بڑھانا، اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا، اور اسی طرح بعض لوگون مین بڑی بڑی مونچھین رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونون باتین صریحاً خلافِ فطرت ہین، اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہین،

مونچھون کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونون کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتین اسلامی شعار کے خلاف ہین، اور اس شعار کے مخالف ہین جو رسول نے اپنی امت کے لئے مقرر کیا تھا،

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آپ نے فرمایا مجوسیون کے برخلاف تم مونچھین ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین رسول اللہ صلعم نے فرمایا مشرکون کے برخلاف تم مونچھین باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ، ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانون کا مذہبی فرض ہے، اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے، دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی،

ؔ صحیح مسلم خصال الـ...
ؔ ایضاً
ؔ ایضاً
ؔ ایضاً

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں مین سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک مین ظاہر ہوا جہان پانی نسبتہً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات مین غسل کرنا فرض قرار دیا، زن و شو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونون غسل نہ کرلین نماز جو فرض ہے ادا نہین ہوسکتی، فرمایا،

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا (مائدہ - ۲) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو،

کپڑے شرعی طور سے پاک ہون، فرمایا،

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (مدثر - ۱) اور اپنے کپڑے کو پاک کر،

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہئے،

فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا، (مائدہ - ۲) تو پاک مٹی کا قصد کرو،

جب نماز پڑھنا چاہین تو پہلے ہاتھ، منھ اور پاؤن دھولین، اور بھیگے ہاتھون کو سر پر پھیرلین، اس کا نام وضو ہے،

إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منھ اور کہنیون تک

وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ اپنے ہاتھ دھولو، اور اپنے سرون کا مسح کرو اور

وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (مائدہ - ۲) اپنے پاؤن دھوؤ،

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت مین شریک ہون،

تاکہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیون کو تکلیف نہ ہو، اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضاے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھرایا گیا،

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے، بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے، فرمایا،

وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ (بقرہ - ۲۸) اور اللہ طہارت کرنے والون کو پیار کرتا ہے،

اسی طہارت کی پابندی، اور دلون مین طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً

۱- آپ نے فرمایا "جب کوئی شخص سوکر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھوے اس کو پانی کے برتن مین ہاتھ نہین ڈالنا چاہیئے، کیونکہ سونے مین معلوم نہین کہ اس کا ہاتھ کہان کہان پڑا ہو[۱]" اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت مین خیال رکھنا چاہیے، سونے مین کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا[۲]،

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے مین ناپاک ہاتھ پانی مین بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کردے، اس لئے خیال رکھنا چاہیئے کہ ہاتھ پانی کے برتن مین اس وقت تک نہ ڈبوئے جائین جب تک ہاتھون کی طہارت کا یقین نہ ہو،

۲- دانتون کی صفائی جو بہت سی گندگیون اور بیماریون کی جڑ ہے ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھرایا، فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو مین ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا[۳]، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے، تو فرمایا کہ تمھارے دانت زرد کیون دیکھ رہا ہون، مسواک کیا کرو، (مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۴)،

(۳) عام راستون اور درختون کے سایہ مین قضاے حاجت نہین کرنا چاہیئے[۴]، یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والون اور درخت کے سایہ مین بیٹھنے والے مسافرون کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو،

[۱] مسلم کتاب الطہارۃ
[۲] ابوداؤد کتاب الطہارۃ
[۳] ایضاً
[۴] ایضاً

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی مین پیشاب کر کے پھر اس مین غسل کرنا جائز نہین، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی مین غسل جنابت بھی نہین کرنا چاہئے، بلکہ مجنب کو چاہئے کہ اس سے پانی لے لیکر غسل کرے، کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسرون کے لئے ناپاک یا قابل کراہت، بلکہ عام حالت مین خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کریگا

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہین کرنا چاہئے، کیونکہ اس حالت مین یہ خوف ہے، کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑجائین، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے، اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہون، یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے،

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے، کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہین،

۷۔ غسل خانہ کی زمین مین پیشاب نہین کرنا چاہئے، خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹین گندی اور ناپاک ہو کر اوڑینگی اور بدن کو ناپاک کرینگی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل مین پیدا کرینگی

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے، استنجا بائین ہاتھ سے کیا جائے، اس مین داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے،

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے[1]،

۱۰۔ ہفتہ مین ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے، بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے،

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانون کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے، اور اس کی وجہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن مین رسول اللہ صلعم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے، تو لوگون کو اس پشمینہ مین پسینہ آیا، اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلعم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل

[1] یہ تمام مسائل کتب حدیث کی کتاب الطہارة مین دیکھئے ۱۲

کرلیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہتر سے بہتر تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے[1] جمعہ کے علاوہ عموماً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد مین آنے کی ممانعت بھی فرمائی،[2]

۱۱- جمعہ کے علاوہ عام حالات مین بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہئے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہین، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہین ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا،[3]

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم مین سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہین دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے، اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیون کو دور کیا ہے جو اس معاملہ مین اور مذاہب مین پائی جاتی تھین، مثلاً یہودیون کے مذہب کے رو سے ناپاکی کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ مین صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائین، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی مین پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے، کیونکہ مین نے رسول اللہ صلعم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے،[4]

یہودیون کے یہان یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے، صحابہؓ نے رسول اللہ صلعم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی،

[1] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [2] مسلم کتاب الصلوۃ،

[3] ابو داؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب و فی الخلقان، [4] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین،

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۤءَ فِى الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ (بقرہ ۲۸-۲۰)

اور (اے پیغمبر لوگ) تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو، جب تک پاک نہ ہو لیں، ان سے مقاربت نہ کرو، اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ،

اس کے مطابق آپ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ اُن سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے[1]،

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے، قرآنِ مجید کو نہیں چھو سکتے، اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ مسلمان نجس نہیں ہوتا[2]، یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے،

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں، اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں، یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو، بولیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے[3]، یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اُس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے، جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اُس سے

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الطہارۃ ایضاً

اچھا راستہ نہیں ہے؛ بولیں ہاں ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے، اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کر دی گئی ہے، اور اسی لیے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے،

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا[1] اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا،

سلہ بخاری باب پانی نہ ملنے کی صورت میں،

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھولئے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے، آنحضرت صلعم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے لیکن پاؤں نہیں دھوتے، پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے، (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے، اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہائے تو مباح ہے، آنحضرت صلعم پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازے پر نہر بہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے[2]،



سلہ صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہین ہے، لیکن اگر پیالہ مین ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن مین بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن مین ہاتھ ڈالنا اچھا نہین،[۱] اور ابوداؤد مین بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے،[۲] ایک حدیث مین ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ مین کھانے کی چکنائی لگی رہجائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس تکلیف پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لئے ہے جس کی انگلیان کھانے مین ملوث ہوتی ہون،

(۲) مسلمانون کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہئے جیسا کہ حدیثون مین مذکور ہے، اور دنیا کے سب کامون مین کھانا جو زندگی کی بقا، اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہئے، اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہئے، صحابہؓ کہتے ہین کہ جب ہم کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے مین ہاتھ نہین ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپنے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح

---

[۱] ابوداؤد کتاب الاطعمہ، [۲] ایضاً

ایک لونڈی آئی اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہین لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے[1]، اور اگر کوئی شروع مین بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ واٰخرہ کہہ لے[2]،

(۳) انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک وناپاک ہر قسم کے کامون اور چیزون مین ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونون ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کامون کے لئے خاص کر دیئے جائین، چنانچہ سب اچھے کامون کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائین ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے، اس تخصیص مین ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے، انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہین، اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہین، اس لئے زیادہ تر کامون کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے جدھر قلب نہین ہے، یعنی دایان پہلو تاکہ کام کے ہچکولون اور جھٹکون سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے، یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہین اور بایان ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہین، اور یہی وجہ ہے کہ داہنے مین زیادہ پھرتی، چستی، اور طاقت ہوتی ہے، اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے[3]، صرف کھانے ہی پینے ہی کی خصوصیت نہین بلکہ شریعت نے اکثر باتون مین اس کا لحاظ رکھا ہے، ایک بار آپ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس مین آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائین جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب مین داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے[4]،

ایک بار آپ کے دائین جانب ایک لڑکا اور بائین جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے آپ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو مین ان لوگون کو دون، اس نے کہا کہ مین آپ کا حصہ کسی کو نہین دے سکتا، مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا[5]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً [3] ایضاً، [4] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [5] ایضاً،

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے، بیچ سے نہین کھانا چاہئے، کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائیگی، گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا، اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہین ہوتا، اسی کو رسول اللہ صلعم نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ مین نازل ہوتی ہے[1]،

(۵) اپنے ساتھیون کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہین[2] کھانا چاہئے، کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ مین پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہوجائے، اور اگر وہ چند لوگون کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیون سے زیادہ کھا لے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دال ہے، اسی لئے آنحضرت صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکون سے پوچھ لینا چاہئے،

(۶) کھانے مین عیب نہین نکالنا چاہئے، کیونکہ اس سے گھر والون مین اور کام کرنے والون مین، بات بات مین عیب نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہئے، ورنہ چھوڑ دینا چاہئے[3]،

(۷) سب کا ملکر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلعم نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست واحباب، یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائین، جیسا کہ قرآن پاک مین ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے، اور ایک ساتھ بھی[4]، لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے مین آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہین ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ کھاتا ہے، سب مل کر

---

[1] ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام [2] سنن ترمذی ابواب الطعام [3] بخاری کتاب الاطعمہ [4] نور۔۔

برابر ہوجاتے ہین، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والون کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے، اس سے گھر والون اور عزیزون اور دوستون مین محبت ہوتی ہے، ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہین لیکن آسودہ نہین ہوتے، فرمایا غالبا تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہان، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کرلو تو برکت ہوگی،[1]

(۸) کھانا ٹیک لگاکر بیٹھ کر یا منھ کے بل سو کر نہین کھانا چاہئے،[2] کیونکہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ مین اچھی طرح سے بآرام نہین پہنچتی ہی، کھانے کیلئے بیٹھنے کی مسنون صورتین یہ ہین کہ یا تو ایک پاؤن کھڑا کرکے اور دوسرے پاؤن کو گراکر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دوزانو بیٹھ کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہون تو اکڑون بیٹھکر،[3] آنحضرت صلعم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگاکر نہین کھاتا، مین بندہ ہون، غلامون کی طرح کھاتا ہون، یعنی خاکساری سے،[4]

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر اودھر ہاتھ نہین بڑھانا چاہئے،[5] خصوصًا جب کئی آدمی ایک ہی برتن مین ساتھ ہون، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہین ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہوجاتا ہے، اور دوسری کے کھانے مین کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقًا پڑگیا ہے تو اس کے لئے لالچ سے بچتا ہے، اور ایثار سیکھتا ہے،

(۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیون سے اور انگلیون کو منھ سے اچھی طرح صاف کرلینا چاہئے، اور اسکے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہئے،[6]

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس مین پینا چاہئے،[7] اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی مین نہین لگنے پاتی،

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضًا [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادۃ فیروز آبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی [4] ابوداؤد و ابن ماجہ مع زرقانی علی المواہب ج ۴ ص ۳۹۵ [5] بخاری کتاب الاطعمہ [6] ایضًا [7] بخاری کتاب الاشربہ،

(۱۲) پانی کے برتن مین سانس نہین لینی چاہئے[1]، کیونکہ ممکن ہے کہ منھ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن مین پڑجائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتون کو لے کر باہر نکلتی ہے، اس لئے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہین کرنا چاہئے،

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہین پینا چاہئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ ہرج نہین، کیونکہ آنحضرت صلعم نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے[2]، مگر اس کی عادت نہین کرنی چاہئے، کیونکہ پانی پینے مین ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائین، اور یہ بات بیٹھکر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا، اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے،

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منھ یا پیالہ کے سوراخ سے نہین پینا چاہئے، کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہین ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہین جاسکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہین،

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنون کو ڈھانک کے رکھنا چاہئے[3]، تاکہ اس مین گرد وغبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے،

(۱۶) کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کی مختلف دعائین حدیثون مین آئی ہین، جن مین سے ایک مختصر دعا یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا[4]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الاشربہ [2] ایضاً و موطا امام محمد [3] صحیح مسلم کتاب الاشربہ [4] عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی باب ما یقول اذا اکل،

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس مین اصولی بات یہ ہے کہ مجلس مین تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو، اور شرکاے مجلس مین سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا، کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتون کو قائم رکھنے کیلئے آنحضرت صلعم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہین،

(۱) مجلس مین انسان کو جہان بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہانتک نشست کا دائرہ اُس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہین بیٹھ جانا چاہئے، یہ نہین کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والون اور بیٹھنے والون کو تکلیف ہوتی ہے، اور دوسرے ایسا کرنے والون مین غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے، اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابۂ کرام رسول اللہ صلعم کی مجلسون مین اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے[1]، انتہا یہ ہے کہ مسجدون مین بعد کے آنے والے نمازیون کے لئے یہ سزاوار نہین کہ وہ لوگون کو روندتے ہوے آگے کی صف مین بیٹھنے کی کوشش کرین، جمعہ کی نماز مین یہ خاص طور سے دیکھنے مین آتا ہے، اسی لئے تخطی رقاب یعنی دوسرون کی گردنون کو روندکر اور زیر قدم لاکر آگے بڑھنے کو جمعہ مین خاص طور سے منع کیا گیا ہے،

(۲) مجلس مین کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہین بیٹھنا چاہئے[2]، کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے، اور دوسرے کے دل مین کدورت پیدا ہوتی ہے،

---

[1] ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتہی، [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ،

(۳) اگر کوئی شخص مجلس مین ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق[1] ہے، دوسرا اس جگہ نہین بیٹھ سکتا، کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا، اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہین جاتا،

(۴) اگر مجلس مین دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہون تو ان کی اجازت کے بغیر دونون کو الگ الگ نہین کیا جا سکتا[2]، کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس مین بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہین، اور ان دونون مین موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے،

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس مین حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہون تو کسی کو اس حلقہ کے وسط مین نہین بیٹھنا چاہئے، ایسے شخص پر رسول اللہ صلعم نے لعنت بھیجی ہے[3]، کیونکہ اس حالت مین کچھ لوگون کی طرف اس کا منھ ہوگا اور کچھ لوگون کی طرف پیٹھ ہوگی جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہون تاکہ سب کو ہنسا سکین، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے،

(۶) مجلس مین کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہین رہنا چاہئے[4]، کیونکہ یہ عجمیون کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریون اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب مین اچھا نہین سمجھا جا سکتا،

(۷) راستہ مین نہین بیٹھنا چاہئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور ہر آیندہ و روند کو تکنا بد اخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتون کی پابندی کرنی چاہئے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا،

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع الیہ فھو احق بہ [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما [3] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل

ضرر رسان چیزون کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتون سے روکنا، راستہ بھولے ہوون کو راستہ دکھانا اور مصیبت مین مارے ہوون کی مدد کرنا[۱]

۸۔ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اپنے ہم نشینون کے انتخاب مین اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہون جنکی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلعم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحین ایک مخلوط فوج ہین، جنمین باہم آشنائی ہوتی ہے، ان مین الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے، اور جن مین بیگانگی ہوتی ہے اُن مین تفرقہ و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے[۲]، ایک مشہور مثل ہے کہ "اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستون کے اخلاق کا پتہ لگاؤ" اس نکتہ کو رسول اللہ صلعم نے ان لفظون مین ظاہر کیا ہے کہ "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے، پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور برے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہو، مشک بیچنے والے سے، تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچیگا، یا اس کو خریدو گے، یا اس کی خوشبو پاؤ گے، لیکن لوہار کی بھٹی تمھارا گھر یا کپڑا جلائے گی، یا تمھارے دماغ مین اس کی ناگوار بو پہنچیگی[۳]،

مجلس مین جو معزز جگہ ہو وہان بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کیجائے، کسی دوسرے کے یہان جائے تو بھی اسکی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے، فرمایا کہ اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے[۴]،

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس مین یہ کوشش کرتے ہین کہ اس معزز جگہ مین نہین، تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی مین بیٹھین، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگون کو وہان سے

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات [۲] ادب المفرد باب الارواح جنود مجندۃ [۳] بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک [۴] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی الاتکاء،

ذرا سر کنے، اور دوسرون کے لئے جگہ بنانے کے لئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہین، اسی لئے اللہ تعالی نے اس ادب کو خود سکھایا، فرمایا،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا	اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسون مین کشادگی
فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اِذَا	کرو، تو کشادگی کرو، اللہ تمھارے لئے کشادگی کریگا'
قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ	اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ، اللہ ان کے
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ	رتبے اونچے کرے گا، جو تم مین سے ایمان لائے'
وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (مجادلہ ۲)	اور جنکو علم دیا گیا، اور اللہ تمھارے کامون کی خبر رکھتا ہو'

اسی طرح مجلس مین بیٹھکر اس طرح آپس مین کانا پھوسی نہین کرنی چاہئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہین، منافقون کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہی،

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ	یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے، کہ دلگیر کرے
اٰمَنُوْا، (مجادلہ - ۲)	ایمان والون کو،

جہان چند آدمی بیٹھے ہون، وہان کوئی دو آدمی آپس مین ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہین تو دوسرون کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھون نے ہم کو اس راز کے قابل نہین سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہین، اسی لئے ارشاد ہوا کہ تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس مین سرگوشی نہ کرین کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا[1]

مجلس کی رازکی باتون کو برملا نہین بیان کرنا چاہئے، کہ المجالس بالامانۃ قول نبوی[2] ہے،



[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التناجی [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث،

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دیگا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنا لیا[1]،

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے، اسی لئے فرمایا کہ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے[2]، ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منھ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں،

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللہ بک عینا ؛ وانعم اللہ بک صباحا کہتے تھے یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں" "تمہاری صبح خوشگوار ہو" امراء و سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے ایرانی "ہزار سال بزی" ہزار برس جیو" کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو گڈ مارننگ" (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ" (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی زیارۃ الاخوان [2] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی صنائع المعروف،

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ ایجاد کیا اور اس مین حسب ذیل مصلحتین ملحوظ رکھین،

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک مین اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہین وَالسَّلَامُ عَلَیَّ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہین وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ (صٰفٰت) ظاہر ہوتا ہے،

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہین، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس مین دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے،

(۳) اس مین مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جسکی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندون پر نازل ہوتی ہے،

(۴) اس مین مبالغہ آمیز تعظیم نہین پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقون مین پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپ سے کہا کہ مین نے حیرہ والون کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسون کو سجدہ کرتے ہین، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہین کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کیا کرین تو آپ نے ان کو اس کی اجازت نہین دی[۱]، ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ جب ہم مین سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھک جائے، فرمایا "نہین" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا "نہین"[۲] اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا "ہان"[۳]

(۵) دنیا مین انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دیجا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے، کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے،

(۶) جب دو انسان آپس مین ملتے تھے، تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کہین غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونون اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہین تو اس کے یہ معنی ہین کہ دونون ایک

---

[۱] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ [۲] یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے جہان کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو یا ؟

دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہین اور دونون ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہین،

(۷) اسلام نے اپنے پیروون کے درمیان اس کو گویا آپسین پہچان کی علامت اور "واچ ورڈ" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانون سے یہ لفظ نکلتے ہین تو دونون اپنے سینون مین ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہین، اور آپس مین محبت کی کشش محسوس کرتے ہین، یہ بتاتا ہے کہ دونون ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہین،

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی؛

یا ایھا الناس افشوا السلام واطعموا	لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور جب تمام
الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا	لوگ سو رہے ہون تو نماز پڑھو، یہ سب کروگے
الجنۃ بسلام[1]	تو جنت مین سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤگے،

ایک دوسری حدیث مین سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی، اور فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک جنت مین داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لے آؤ، اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤگے جب تک آپس مین محبت نہ کرو، مین تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہون کہ جب تم اس پر عمل کروگے تو باہم محبت کرنے لگوگے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ،[2]

سلام کرنے کے لئے شناسا و غیر شناسا جانے اور انجان کی تخصیص نہین[3]، مرد اور عورت کی تفریق نہین[4] بڑے اور بچہ کی تمیز نہین[5]، البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے، جو تمام متمدن قومون مین رائج ہے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے، اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلعم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام

---

[1] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۹۰۴ [2] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام، [3] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ [4] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال [5] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان

کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیئے،[1]

ان مصالح کے لحاظ سے آپ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر مین جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اسکو موجب برکت قرار دیا،[2] مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگون کو سلام کرنا چاہیئے،[3] سلام مین رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہی، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ کی خدمت مین حاضر ہوا، اور کہا "السلام علیکم" آپ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملین"۔ دوسرا آدمی آیا تو کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپ نے فرمایا "اس کو بیس نیکیان ملین"۔ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیان ملین"[4]

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہین ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم ازکم وہی الفاظ دہرادے، چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہی،

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا،	اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب مین) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا
(نساء - ۱۱)	(کم سے کم) ویساہی جواب دو،

اس سے کم الفاظ مین سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے،

(۲) ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے، اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزء قرار دیا، اور رسول اللہ صلعم نے

[1] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [2] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما ذکر فی فضل السلام،

فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے[1]، مدینہ مین سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے تھے[2]، اور رسول اللہ صلعم نے اس کو قبول کر لیا، اور مسلمانون کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات مین ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہی، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپ کی خدمت مین حاضر ہوے تو آپ نے ان کو گلے لگا لیا، اور ان کا بوسہ لیا[3]،

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوے دیکھ کر جوش محبت اور جوش عقیدت مین کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہین، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلعم کی خدمت مین آتی تھین تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے، اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپ اُن کے یہان آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھین[4]، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھکر جائین اور ان کو لے آئین[5]،

دوسری قومون مین ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجاے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیرون اور بادشاہون کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہجاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس مین ایک دوسرے کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہین[6]،

اس قسم کے موقعون پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت مین موجود ہے[7]،

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر مین جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے، اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید مین دیا ہے،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقہ والقبلہ [4] یہ دونون واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام مین ہین [5] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ،

مسلمانو! اپنے گھرون کے سوا دوسرے گھرون مین گھروالون سے پوچھے اور اُن سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمھارے حق مین بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو تم اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر مین کوئی آدمی موجود نہین تو جب تک تمھین (خاص) اجازت نہ ہو ان مین نہ جاؤ اور اگر (گھر مین کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہین) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمھارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے،

(نور - ۴)

غیر محرم عورتون سے ملنے کیلئے ان کے شوہرون سے اجازت لینے کی ضرورت ہے[1]،

کسی کے گھر مین داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہوسکتے ہین لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت مین ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہین کرتا کہ دوسرون کی نگاہ اس پر پڑے یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازون پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[2] اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائین یا بائین کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہین کھڑے ہوتے تھے[3] تاکہ اندر کی چیزون پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن [2] ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث، [3] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب،

آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے[۱]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں[۲]، ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا، پھر فرمایا انّما جُعل الاذن من قبل البصر، یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر، یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں[۳]،

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آسکتا ہوں[۴]، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہئے[۵]، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں[۶]، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے[۷]، دوکانوں میں جانے کے لئے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں[۸]، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہئے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہونگی، یا گھر میں غیر محرم عورتیں آگئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں، یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لئے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں، اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لئے اگر ان کیلئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہو گی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقئوا عینیہ فلا دیۃ لہ [۳] اس کتاب کے صفحہ ۰ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھ گئے ہیں، انما الاذن لاجل الرؤیۃ مگر صحیح لفظ یہی ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان، باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم [۴] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [۵] ابو داؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان [۶] ادب المفرد باب اذا دعا الرجل اذن [۷] ادب المفرد باب ما لا یستاذن فیہ [۸] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق،

لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآنِ مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے، یعنی نمازِ عشاء کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے، اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لئے کوئی لیٹے، کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا،

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

(نور ۸-۰)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لئے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نمازِ عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر کچھ گناہ کیونکہ وہ اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حدِ بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھر والوں میں آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیئے،

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کرین، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتین کرو،

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ، (طٰہٰ - ۲) تو تم اُن سے نرم بات کہنا،

پھر جو بات کی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے مین اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لئے فرمایا،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ، (بقرہ - ۱۰) اور لوگون سے اچھی بات کہو،

مجلس مین بیٹھین تو ایسے فقرے نہ کہین جنمین کسی پر کوئی طعن چھپا ہو، یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت صلعم کی مجلس مین آتے تو اسی قسم کی باتین کہتے، اُنْظُرْنَا (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ راعنا کہتے جسمین تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو اس سے باز رکھا، فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (بقرہ ۱۳) اے ایمان والو! راعنا نہ کہو، اُنْظُرْنَا کہو،

اس کی پوری تفصیل سورہ نساء رکوع ۷ مین ہے،

باتین ایسی کرنی چاہئین جو منصفانہ اور درست ہون، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھین تو آپس مین لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگون کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو، اور بات سیدھی کہو، اللہ تمھارے کامون کو سنوارے گا اور تمھارے

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ، (احزاب-۹) گناہ معاف کرے گا،

عورتون کو جب نامحرم مردون سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات مین اور لہجہ مین ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل مین بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا،

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا، (احزاب-۴)

تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل مین کسی طرح کا کھوٹ ہو، خدا جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کرے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ،

مردون کو نرم معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتین کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا گیا، فرمایا

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا أَذًى، (بقرہ-۳۶)

نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو،

بات کیجائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتین کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا،

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ، (لقمان-۲)

اور کچھ اپنی آواز پست کر، کہ سب آوازون مین بری آواز گدہون کی ہے،

فضول باتون سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے مسلمانون کی صفت یہ ہو،

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ، (مؤمنون-۱) اور جو لغو باتون سے اعراض کرتے ہین،

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، خدا فرماتا ہے،

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ، (ق-۲)

آدمی کوئی لفظ نہین بولتا لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے،

اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے،

حدیث مین آتا ہی کہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے[۱]" اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کرین، کیونکہ جب ہم بری بات بولین گے تو اس کی جزا بھی پائین گے،

ایک اور حدیث مین ہی کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبیون مین سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو اُدھر توجہ نہ دے[۲]" یہ حدیث اُن جوامع الکلم مین سے ہے جو دیکھنے مین تو بہت مختصر ہین مگر درحقیقت اس کوزہ مین دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھین تو مسلمانون کے بہت سے کام بنجائین

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لئے ملی ہے، اس لئے ضروری ہی کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہون، پھر اُن کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو، اور یہ دونون باتین اعراض عن اللغو مین داخل ہین، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتون مین سے کسی ایک مین کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہی کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے،

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔ (فرقان - ۶)	اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کرین تو وہ جواب مین سلامتی کی بات کہین،

گفتگو بضرورت کرنی چاہئے، احادیث مین ایسے لوگون کی بہت برائی آئی ہے، جو فضول باتین کرتے ہون، اور بکواس مین مبتلا رہتے ہون، اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہین[۳]، یہ بھی فرمایا کہ کسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[۴]، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہی کہ دین اور دنیا کے بہت سے کامون کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے،

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار و الضیف [۲] موطا و شرح للباجی باب ما جاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد [۳] ادب المفرد باب فضول الکلام [۴] موطا امام مالک باب ما یومر بہ من التحفظ فی الکلام،

اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی، اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا، وہ جنت میں جائیگا۔[1]

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ صلعم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے،[2] اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں لا سکے، ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرے کے پہلو میں بیٹھکر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلعم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپکے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا،[3] حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں،

کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلعم کا کلام ایک دوسرے سے الگ
وسلم کلاما فصلا یفہمہ کل من سمعہ[4]	ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا،

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ آپنے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔[5]

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل

---

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی التحامت من اللسان [2] ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث [3] ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث [4] ابوداؤد کتاب الادب باب الہدی فی الکلام [5] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام،

کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع، مقفیٰ اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہین، گفتگو کو طول دیتے ہین، چبا چبا کے باتین کرتے ہین، رسول اللہ صلعم نے ان تمام باتون کی ممانعت کی اور فرمایا کہ "خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مڑوڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مڑوڑ کے گھاس کھاتا ہے" نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوبِ کلام مین اس لئے اول بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگون کو اپنا[1] گرویدہ بنائے، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا"[2]

جب چند لوگون کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منھ کیا جائے، تاکہ دوسرون کو عدمِ التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔[3]



[1] یعنی حق ... بلکہ اپنی توجہ ... مقصود

[2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام، [3] ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لا یقبل علی واحد،

باہر نکلنے
اور
چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ مین متانت سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانون کی تعریف مین فرماتا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى	اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہین جو چلتے
الْاَرْضِ هَوْنًا، (فرقان-۶)	ہین زمین پر دبے پاؤن،

اکڑ کر نہین چلنا چاہیے یعنی چال مین غرور اور تبختر کے انداز نہ ہون، فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا، اِنَّكَ لَنْ	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر)
تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ	نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہو اور نہ پہاڑون تک اونچائی
طُوْلًا ۔ (بنی اسرائیل-۴)	مین پہنچ جا سکتا ہو،

دوسری جگہ فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل، بیشک اللہ مغرور اور فخار
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، (لقمان-۲)	کو پسند نہین کرتا،

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہنکر چلنے مین زمین پر زور زور سے پاؤن نہین رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سننے والون کے دلون مین انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتین مردون کے سا

سے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لئے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا،

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ، (نور-۴)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو،

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپالے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں، اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منھ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ، ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ، (احزاب-۸)

اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہدے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی نہ ستائے،

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ، الآية (نور-۴)

اور (اے پیغمبر) ایمان والیوں کو کہدے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں، اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے، اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (اخیر تک پڑھئے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے، کیونکہ اس سے میلان طبع پیدا ہوتا ہے اور

۱؎ یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتونیں ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں ۲؎ سنن ترمذی باب ماجاء فی خروج المراۃ متعطرۃ

عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے،

راستہ مین مرد اور عورت کو مل جل کر نہین چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ صلعم نے مرد کو دو عورتون کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتون کو وسطِ راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے ایک بار راستہ مین مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتین راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگین[1]،

راستہ چلنے مین ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے یہانتک کہ اگر مسجد مین جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت مین ملنے کے لئے متانت کے خلاف دوڑنا نہین چاہیے، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر مسجد مین تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس مین شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آکر جماعت مین ملو[2]،

مقدور ہو تو پاؤن کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کیلئے جوتے پہنے جائین، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہنکر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[3]،

جوتے دونون پاؤن مین پہنکر چلنا چاہیے، یا دونون پاؤن ننگے رہین، یعنی یہ نہین کرنا چاہیے کہ ایک پاؤن مین جوتا ہو، اور دوسرا پاؤن ننگا ہو[4]، کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھینگے لیکن اگر گھر مین کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہین[5]،



[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطرق [2] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار [3] ابوداؤد باب الانتعال [4] ایضاً، [5] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ ،

آدابِ سفر

آنحضرت صلعم نے جس زمانہ مین سفر فرمایا، اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریون کے طریقے اور تھے، اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارتگری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھکر آنحضرت صلعم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتین کی ہین، جن مین سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ مین پابندی ضروری نہین، تاہم جہان اب بھی وہ حالات باقی ہین اُن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہوسکتے ہین، جنکو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستون مین ضروریاتِ زندگی کے وہ سازوسامان میسر نہین آتے جن کی اسٹیشنون اور ہوٹلون مین بہتات ہوتی ہے۔

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے، اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہوسکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ صلعم فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے[۱] اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَاَمَانَتَکُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ یعنی تمھارے دین، امانت، اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہون،

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے[۲]، اس سے انسان کا وقت ضائع نہین ہوتا، بلکہ پورا دن کام مین آجاتا ہے، اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے، اور ایک معتد بہ مسافت طے کرکے دوپہر

---

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر،

کے وقت آرام کرسکتا ہے،

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں[2]، اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے،

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو اُن میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہئیے[3]، اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں،

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیئے[4]،

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے، تو اس کا استقبال کرنا چاہئیے[5]،

(۷) سفر رات کو کرنا چاہیئے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے[6]، اور درحقیقت لُو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے وہ مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت،

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیئے،

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیئے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں، اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ[7] رہتا ہے،

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آجانا چاہیئے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے[8]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ، [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدہم [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعة السیر [6] مسلم کتاب الامارة باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق [7] مسلم کتاب الامارة باب السفر قطعة من العذاب،

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات مین شمار کیا ہے اور فرمایا ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ، (روم-۳) اور خدا کی نشانیون مین سے ایک تمھارا رات کو سونا ہے

سورۂ فرقان مین فرمایا،

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا، (فرقان-۵) اور اسی نے تمھارے لئے رات کو پردہ، اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا،

سورہ نبا مین ہے،

وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا (نبا-۱) اور ہم نے نیند کو تمھارے لئے آرام، اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا،

ان آیتون کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لئے ہے، یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام مین گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور ع ۸ مین ہے، حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ اور رات آرام مین گذاری جائے، اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصون مین خدا کی یاد کیجائے، جیسا کہ دوسری آیتون مین ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہین وہ دونون قدرت کے حکمون کی خلاف ورزی کرتے ہین، یہانتک کہ ساری رات عبادتون مین

جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[1]، یہ تو عام افراد کے لئے ہے، لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے،

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ، (ذاریات-۱) یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے،

(۱) سنتِ نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے[2] کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے[2]، یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو،

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشا کے بعد اس کے لئے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کی خدمت میں نمازِ عشا کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں، اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے[3]،

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہئے، پھر داہنی کروٹ لینا چاہئے[4]،

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہئے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو[5]، کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے،

(۴) پاکی کی حالت میں سونا چاہئے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے[6]،

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہئے، ایک بار رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں[7]،

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہئے[8]، کیونکہ عرب کے لوگ عموماً

[1] بخاری کتاب النکاح [2] ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء [3] صحیح مسلم باب اکرام الضیف [4] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر [6] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم و باب فی النوم علی الطہارۃ، [7] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ [8] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ فی ذلک ۱۲

تہ بند باندھتے تھے اس لئے اس مین کشفِ عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث مین ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ صلعم اس طریقہ سے لیٹے تھے[1]

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہئے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہئے، چراغ کو بجھا دینا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لیجاتے ہین، جس سے گھر مین آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ مین رات کو کسی کے گھر مین آگ لگ گئی، تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ آگ تمھاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو،[2]

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے اَللّٰھم باسمك احیی واموت (اے اللہ! مین تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہون) اور جاگے تو کہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور[3] (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا، اور جس کی طرف اٹھکر جانا ہے) حدیثون مین اس موقع کے لئے اور بہت سی مؤثر دعائین منقول ہین،



[1] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیا [2] بخاری کتاب الاستیذان باب لا تترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتین پست ہون اور تیل کا پرانا دیا جلایا جائے [3] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم،

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہین، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفون سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصون پر غیرون کی نظر نہین پڑنی چاہیے وہ چھپے رہین، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہین جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزو ٹھہرایا، یہانتک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہین ہو سکتی مردون کے لئے ناف سے لیکر گھٹنون تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتون کے لئے سر کے بالون سے لیکر ٹخنون اور گٹون تک اور لونڈیون کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنون تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے[1]، جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہین، یہانتک کہ تنہائی مین بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہین، ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی مین ہون یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیئے[2]، ایک اور حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمھارے ساتھ فرشتے رہتے ہین، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہین، تو ان سے شرم کرو، اور ان کا لحاظ رکھو[3]،

حضرت آدمؑ اور حوّاؑ کو بہشت مین جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ اُن کے بدن سے اتر گئے، تو وہ فوراً درخت کے پتون سے اپنی برہنگی چھپانے لگے،

---

[1] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیان ستر مین داخل نہین [2] سنن ترمذی ابواب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ [3] ایضاً باب ماجاء فی الاستتار،

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف-۲)

توجب ان دونون نے درخت کو چکھا، ان کے ستر اُن پر کھل گئے، تو اپنے اوپر درخت کے پتون کو جوڑنے لگے،

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا مین آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی جنگلی اور صحرائی قومین ستر کے حدود کو صرف شرمگاہون تک محدود کر لیتی ہین، عرب مین بھی یہی حال تھا، بلکہ حج مین انھون نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلون کے مرد اور عورت خانۂ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے، اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے[1]، ورنہ یون ہی ننگے پھیرا کرتے تھے، وحیِ الٰہی نے انسانون کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا،

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف-۳)

اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمھاری ستر اور زینت کا سامان، اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے،

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ، (اعراف-۳)

اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ، (اعراف-۴)

کہدے، کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندون کے لئے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، (اعراف-۴)

کہدے کہ میرے رب نے تو بیحیائی کی باتون کو خواہ وہ کھلی ہون یا چھپی منع کیا ہے،

ان آیتون مین جس بیحیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے، اور جس زینت کے اختیار کرنے کا

[1] صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل

حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر مین لباس کے باب مین اصولِ کلیہ کی صورت مین ایک بلیغ فقرہ ہے، جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ، (اعراف ۳) اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے،

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضون نے مجاز سمجھکر اس سے ایمان، دوسرون نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہئے، اسی لئے کچھ مفسرون نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے، مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباسِ تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد وورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہین[1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقوی سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہئے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہو، اور جو لباس تقوی اور پرہیزگاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت صلعم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبد القادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی مین لکھتے ہین،

"اب وہی لباس پہنو جس مین پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے، اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نکرے، اور عورت بہت باریک نہ پہنے، کہ لوگون کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے" (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام مین لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہین کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسبِ ذیل ہے،

۱- مردون کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہین پہننا چاہئے، کیونکہ اس سے

---

[1] روح المعانی تفسیر آیت مذکور،

زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردون کی جد و جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی مین زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہین تاکہ اسکی لوہے کی کڑیان بدن مین نہ چبھین، یا کسی کے بدن مین کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے ان دونون موقعون پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہین، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے مین لگائے تو اس کی بھی اجازت ہی،

۲- مردون کے لئے عورتون کی سی پوشاک، اور عورتون کے لئے مردون کی سی پوشاک پہننا جائز نہین کیونکہ اس سے دونون کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے، آنحضرت صلعم نے ان عورتون پر جو مردون کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کرین اور ان مردون پر جو عورتون کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کرین لعنت فرمائی ہے،

۳- عربون مین لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، اُن کے بڑے بڑے امرا، اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے، اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے، آنحضرت صلعم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹکر چلیگا، اللہ تعالیٰ اسکی طرف قیامت کے دن نظر نہین اٹھائے گا، اسی لئے مرد کو پائجامہ کی مہریون اور تہبند کو اتنا نیچا نہین کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائین، بلکہ آپنے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنون سے اونچا رہنا چاہیے فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہین فرماتا، البتہ عورتون کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے،

۴- ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگون کی انگلیان اٹھین، پہننا ٹھیک نہین، خواہ وہ امیرون کی زرق برق پوشاکین ہون، یا مولویون کا نمائشی عبا، جبہ، یا صوفیون کا گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑون کے پہننے والون کا اصل منشا اپنے کو دوسرون سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس

نفس کا کھلا غرور ہے،

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپنے یہ فرمایا ہے کہ[1] کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں"۔

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہنکر حضورؐ کے سامنے آئیں تو آپنے فرمایا، اے اسماؓ جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں،

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپنے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں، آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لئے منع ہے، سبز رنگ کی چادر بھی آپنے اوڑھی ہے، اور اس رنگ کا تہبند بھی آپنے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے،

۸۔ مردوں کے لئے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپنے پسند فرمائے ہیں،

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے،

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے،

الحمد للہ الذی کسانی ھذا ورزقنیہ	اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا، اور روزی کیا میری
من غیر حول منی وقوۃ،	قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)

[1] اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد، اور ترمذی ہیں، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملینگی،

آدابِ مسرّت

انسان کو جن چیزون پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہین، مال و دولت، علم و فضل، عہدۂ منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار غرض انسان کو اپنی زندگی مین اظہارِ مسرت کے سیکڑون موقع پیش آتے ہین لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخرآمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا،

اِذْ قَالَ لَہٗ قَوْمُہٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ	جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو
لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ، (قصص - ۸)	نہین بھاتے اترانے والے،

اسلام نے چونکہ تمام جذبات مین اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتون کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَۃً ثُمَّ	اور اگر ہم چکھا دین آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر
نَزَعْنٰھَا مِنْہُ اِنَّہٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ وَ	وہ چھین لین اس سے تو وہ ناامید ناشکر ہو اور
لَئِنْ اَذَقْنٰہُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْہُ	اگر ہم چکھا دین اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے
لَیَقُوْلَنَّ ذَھَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّہٗ	اس کو تو کہنے لگے گئین برائیان مجھ سے تو وہ
لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ، (ھود - ۲)	خوشیان کرتے بڑائیان کرتا،

اور اس کی ممانعت کی ہے،

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، (حدید ۳)

اور نہ اترا ؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہین چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو،

ساتھ ہی اس کے مسلمانون مین مردہ دلی نہین پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہین،

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہئے، تاکہ غایتِ مسرت کی حالت مین دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلعم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجالاتے، ایک بار مکہ سے مدینہ کو جا رہے تھے، جب غزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی پھر سجدہ مین گر پڑے، اس کے بعد دیر تک ٹھہرے رہے پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی پھر سجدہ مین گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ مین گر پڑے اور فرمایا کہ مین نے خدا سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی، تو اس نے میری ثلث امت کیلئے شفاعت قبول کر لی، اس لئے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ مین گر پڑا، پھر مین نے سر اٹھا کر اپنی امت کیلئے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی، اس لئے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ مین گر پڑا، پھر مین نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری التجا کو قبول کیا تو مین اپنے خدا کے لئے سجدہ مین گر پڑا[1]،

صحابۂ کرام کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعب بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اسکا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ مین گر پڑے، اس قسم کے مسرت آمیز موقعون پر دوسرے مسلمانون کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر اسکی مسرت مین شریک ہون، چنانچہ اس موقع پر صحابۂ کرام

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر،

بھی ان کے پاس جوق درجوق آئے اور ان کو مبارک باد دی[1]،

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن مین پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے، اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کیجا سکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت مین شریک ہون، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم سفر سے مدینہ مین آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کرکے لوگون کو کھلایا[2]، اس موقع پر دوسرون کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر کر واپس آنے والے کا استقبال کرین تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلعم جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگون نے ثنیۃ الوداع تک جاکر آپ کا استقبال کیا جس مین بچے بھی شامل تھے[3]،

اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کا عام موقع شادی بیاہ مین پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے،

فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت[4]،	حلال اور حرام مین دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے،

یعنی زنا اور نکاح مین فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گاکر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلان مرد اور فلان عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے، اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفرا رض کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلعم تشریف لاکر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیان دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذ کے ان بزرگون کی تعریف مین اشعار گانے لگین جو غزوۂ

[1] بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک [2] ابو داؤد کتاب الاطعمہ باب الاطعام عند القدوم من السفر،
[3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی [4] ترمذی کتاب النکاح باب ما جاء فی اعلان النکاح،

بدر مین شہید ہوئے تھے، اسی حالت مین ایک نے یہ مصرع گایا،

وفینا نبی یعلم ما فی غد، ہم مین ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے

تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھین اسی کو گاؤ۔[۱]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگون کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگون نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیون نہین بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی۔[۲]

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیون کا گانا سن رہے تھے، استنے مین عامر بن سعد ایک تابعی آگئے، انھون نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی مین، اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھون نے کہا تمھارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھکر سنو، رسول اللہ صلعم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب اللہو والغنا عند العرس)

عربون مین رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہکر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی،

بارك الله لك وبارك عليك وجمع تمھارے لئے اللہ مبارک کرے، تم پر برکت اتارے

بینکما فی خیر[۳] اور تم دونون مین بھلائی مین میل ملاپ رکھے،

شادی بیاہ مین دوستون اور عزیزون کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہین جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزون اور دوستون کو اس موقع پر کھلائے، آنحضرت صلعم نے فرمایا، اور کچھ نہین تو ایک بکری ذبح کر کے کھلادو[۴] اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہین[۵]، اسی طرح دوست اور عزیز کو اسکی شادی مین تحفہ کے طور پر

---

[۱] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ [۲] بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ التی یہدین المرأۃ الی زوجہا و دعائہن بالبرکۃ مع فتح الباری [۳] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یقال للزوج [۴] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ [۵] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر،

بھی کچھ بھیج سکتے ہین، (نسائی باب الہدیۃ لمن عرس)

مسلمانون کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہارِ مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانۂ جاہلیت مین اہلِ عرب نے سال مین دو دن مقرر کئے تھے جن مین وہ خوشیان مناتے تھے، رسول اللہ صلعم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنون مین خوشیان مناتے تھے اب خدا نے ان کو تمھارے لئے ان سے دو بہتر دنون سے بدل دیا یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن[1]، خوشی کے ان دو دنون کی تعیین مین دوسری مشرک قومون کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہین بنایا گیا، بلکہ دینی حیثیت کے دو عظیم الشان واقعون کو اظہارِ مسرت کیلئے پسند کیا گیا عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السّلام کی خوشیون اور خانہ کعبہ کی بنا اور فتح کی، اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآنِ پاک کے نزول کی یادگار ہے،

ان دونون دنون مین اظہارِ مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا، اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلون کو پسند فرمایا، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیان جو پیشہ ور گانے والیان نہ تھین، وہ اشعار گا رہی تھین جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت مین حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ "شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلعم کے گھر مین" لیکن رسول اللہ صلعم نے فرمایا اے ابوبکر! ہر قوم کے لئے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے[2] یعنی اس دن گانا مباح ہے[3]،

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ صلعم اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ صلعم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیون سے کہا کہ "ہان بنو ارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان مین مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہانتک کے

---

[1] نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین [2] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام [3] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہون

جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ بس انھوں نے کہا ہاں ارشاد ہوا تو جاؤ[1]،

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام "تقلیس" تھا جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کیلئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلعم کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے،

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھیں بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلعم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی[2]،

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جنمیں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کرے، اسی لئے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے، اور آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے اہل وعیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی کے ہیں[3]،

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو اسی لئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں، اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو، اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ ۲۳) کی تعمیل ہو،

---

[1] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید [2] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التقلیس یوم العید، [3] شرح معانی الآثار طحاوی صفحہ ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل وعیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے،

آداب ماتم

خوشی اور غم توام ہین جس طرح انسان خوشی مین بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت مین بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربون مین فخر و غرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمین قائم ہوگئی تھین، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہین جاتا تھا، اس لئے اظہارِ فخر کے بہت سے طریقے جاری ہوگئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے،

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

اذا مِتُّ فابکینی بما انا اھلہٗ ۔۔۔ وشقّی علیّ الجیْبَ یا ابنۃ معبد

جب مین مرجاؤن تو میرے لئے میرے درجہ کے موافق رونا ۔۔۔ اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی، اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے،

من کان مسرورًا بمقتل مالکٍ ۔۔۔ فلیأت نسوتنا بوجہ نہارِ

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا ۔۔۔ تو ہماری مستورات کو دن دہاڑے آکر دیکھے

یجد النساء حواسرًا یندبنہ ۔۔۔ یلطمن اوجھھن بالاسحار

وہ دیکھیگا کہ عورتین سر کھول کر نوحہ کررہی ہین ۔۔۔ اور صبح کے وقت اپنے گالون پر طمانچے مار رہی ہین

آنحضرت صلعم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ جو شخص گریبان پھاڑتا، اور

گالون پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت مین سے نہین[1]۔

یعنی یہ میری امت کے کام نہین،

حضرت جعفرؓ طیار سے آنحضرت صلعم کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو اُن کے خاندان کی عورتون نے نوحہ شروع کیا، آپنے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئین، دوبارہ منع فرمایا جب پھر نہ مانین تو آپنے حکم دیا کہ ان کے منھ مین خاک بھر دو[2]۔

یہ بھی فخر مین داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہون، اس بنا پر دُور دُور سے عورتین بلا کر لاتی تھین، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہوگئی تھی، یعنی کسی میت کیلئے کسی خاندان کی عورتون نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ وہ کونسی بات ہے جس مین ہم کو آپ کی نافرمانی نہین کرنی چاہئے؟ آپنے فرمایا یہ کہ نوحہ نہ کرو، وہ بولین کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلان خاندان کی عورتین آکر روئی تھین، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپنے منع فرمایا لیکن وہ کسی طرح نہ مانین، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت صلعم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھین، اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ مین شریک نہین ہوئین[3]،

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئین، اس کو عربی مین نعی کہتے ہین، آنحضرت صلعم نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، مین نے آنحضرت صلعم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان مین داخل ہو[4]۔

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے، اور بخور دان مین آگ جلا کر لیجاتے، آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لیجائے، راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے، تب یہ مطلب ہوگا کہ

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن ضرب الخدود، [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہا الحزن،

[3] ترمذی تفسیر ... ممتحنہ، [4] ترمذی کتاب الجنائز باب ... ہیۃ النعی، ... باب ۱۱۲، ... م ماقبلہ و ... ہد بو شیئہ ۱۹۹

"جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لیجائے"[1]

ایک دفعہ آنحضرت صلعم ایک جنازہ مین شریک تھے، ایک عورت انگیٹھی لے کر آئی، آپنے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی،[2]

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینکدیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپنے لوگون کو اس صورت مین دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ مین تمھارے حق مین ایسی بددعا کرون کہ تمھاری صورتین بدل جائین، لوگون نے فوراً چادرین اوڑھ لین، اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہین کیا،[3]

آنحضرت صلعم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کردی، اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے جائز نہین کہ تین دون سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس مین وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے، اور نہ کوئی اور آرایش وزیبایش کرے،[4]

کسی عزیز کی موت پر آنکھون سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہین لیکن زور زور سے چیخنا چلانا، بین کرنا منع ہے، اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت صلعم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلعم کی آنکھون سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے، اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہین لیکن زبان سے وہی نکلیگا جو رب کی مرضی ہے،[5]

آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مردہ پر اسکے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے؛ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب مین اختلافات ہین جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب مین جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا کہ لوگ فخر وغرور کے لئے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کرجاتے تھے، اسی وصیت کے مطابق اُس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے،[6]

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد [2] اسد الغابۃ جلد ۴ صفحہ ۳۹۵ مصر [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ [4] ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا [5] مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال [6] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۲۲،

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو، تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلے کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت صلعم نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر اُن کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملیگا،[1]

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا، دفعِ غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت صلعم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا، مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہئے،[2]

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائینگے، قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ ۱۹) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں، اور یہ دستور مستحسن ہے،

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارۂ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے،

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (حدید ۳) تاکہ تمھارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت [2] ایضاً باب الصبر عند الصدمۃ،

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتین ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہین، اُن کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمہائی لینے مین انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے، اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ مین بیان فرمایا ہے، "جمہائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت مین آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے"[1] بعض حدیثون مین ہے کہ جب تم مین کوئی جمہائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[2]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس مین حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہین کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اوڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[5] اسلئے اسلام نے مختلف طریقون سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے،

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمہائی روکنے کی چیز ہے، اس لئے جہانتک ممکن ہو اس کو روکنا چاہئے، اور ہاہ ہاہ نہین کہنا چاہئے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے[3]،

(۲) جمہائی کے برخلاف آپ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہین کی ہے، بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[4]، ہمارے شراحِ حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہین کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات

[5] حجۃ اللہ البالغہ آداب الصحبۃ،

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [4] ایضاً،

کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہین کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہین، اور اس طریقہ سے وہ شفاء کا ذریعہ بنجاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور "الحمد للہ" کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب مین "یرحمک اللہ" کہین[1]،

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے بعض اوقات اس حالت مین ناک سے بلغم نکل آتا ہی، اس لئے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے، اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے، رسول اللہ صلعم کا یہی طریقہ تھا[2]،

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپنے کوئی خاص حکم نہین دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ عام مجمع مین انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابون مین ہے کہ رسول اللہ صلعم جمائی اور انگڑائی نہین لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین ان حدیثون کو نقل کیا ہی اور انکی تضعیف و تردید نہین کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے[3]، بہرحال یہ حدیثین صحیح ہون یا نہ ہون لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے مین جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لئے مجمعِ عام مین اس سے احتراز کرنا چاہئے،

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی مین ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپنے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو کیونکہ جو لوگ دنیا مین بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہین وہ آخرت مین سب سے زیادہ بھوکے رہینگے[4]، اس حدیث سے پُرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہی،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس [3] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۶ [4] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹،

آداب کا فلسفہ | شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ مین ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے،

تمام متمدن ملکون کے باشندون نے خورد و نوش، نشست و برخاست، اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات مین فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے، اور اس مین مختلف طریقے اختیار کئے ہین،

(۱) بعض لوگون نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے، اور اُن آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کے روسے مفید ہین،

۲- بعض لوگون نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس مین اپنے مذہب کی پابندی کی ہے،

۳- بعض لوگون نے اس معاملہ مین اپنے بادشاہون، حکیمون اور راہبون کی تقلید کی ہے، ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہین جنمین بعض مفید اور بعض مضر ہین اور بعض مین نفع و نقصان کچھ بھی نہین ہے، اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے، اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے، اور جن مین نفع و نقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت مین قائم رکھے جائین، ان مصلحتون کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس مین امورِ ذیل کا لحاظ رکھا،

۱- ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے، اور دل کی صفائی باقی نہین رہتی، اس لئے شریعت نے ان سے پہلے، ان کے بعد اور اُن کے ساتھ چند دعائین مسنون کر دین جو خدا کو یاد دلاتی ہین،

۲- بعض افعال و اشکال شیطانون کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہین، مثلاً ایک جوتہ پہنکے چلنا اور بائین ہاتھ سے کھانا، اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، اس کے بخلاف بعض باتین ایسی ہین جو فرشتون سے قریب کر دیتی ہین، مثلاً گھر مین داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لئے شریعت نے

ان کی ترغیب دی ہے،

۳۔ بعض چیزین ایسی ہین جنسے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر مین آگ لگا دیتے ہین،

۴۔ بعض آداب ایسے ہین جن سے عجمیون کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑون اور چاندی سونے کے برتنون مین کھانے پینے کی ممانعت،

۵۔ بعض چیزین وقار و تمدن کے منافی ہین، اور انسان کو بالکل وحشیون اور بدؤن مین شامل کر دیتی ہین، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ان کی ممانعت فرمائی، تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے [1]،

اس تفصیل کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قومون کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولون پر قائم تھی، اسلام کے احکام مین اور رسول انام علیہ السّلام کے آداب مین وہ سب ملحوظ ہین، اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہین، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسولؐ کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگون کے آزمودہ اصولِ کار، اور طریقِ زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے؛

اسلام نے ان آداب مین بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان مین جو اصلی اور بنیادی باتین ہین ان کی تو قرآن پاک اور احادیثِ نبویہ مین پوری تاکید کر دی ہے، اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان مین بعض ایسے امور بھی ہین جو وقتی مصلحت یا عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۶۳،

کے بدلنے سے بدل سکتے ہین، اسی لئے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہین کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، اور اسی لئے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتادیئے گئے ہین، اس کے معنی یہ ہین کہ اگر ان مین کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہین جیسے جہان ہاتھ دھونے مین اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہان اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تو لیے کام مین لائے جائین، کھانے مین ہاتھ کے بجائے چمچون سے کھانا کھایا جائے، چھری سے گوشت[1] کاٹا جائے، پلیٹین بدلی جائین، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائین، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنین، حلال کھانا کھائین، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کرین تو اس کی پوری اجازت ہے لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ صلعم کی پیروی کا عزم رکھتے ہون، ان کے لئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر مین وہی ادائین محبوب ہین جو محبوب سے نسبت رکھتی ہین،



[1] ہمارے فقہائے اسی کو سنن الہدی اور سنن الزوائد کی اصطلاحون مین بیان کیا ہے۔ [2] آنحضرت صلعم نے چھری سے کاٹ کر گوشت کھایا ہے،

حکمتِ ربّانی کا چشمۂ نو

Checked
1987

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

ناظرین! آپنے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیمون اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتون کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپنے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اسکی تعلیم کتنی کامل، اُسکے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اسکی اخلاقی تربیت کے نظریئے کتنے بلند ہین اور یہ سب کچھ ایک نبی اُمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکماے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قومون کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، معلم اُمّی صلعم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہان تک پہنچ گئے،

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریئے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان مین ایسی جلا پیدا کردی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوون کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشینگوئی پوری ہوئی جو اسمٰعیلی نسل کے خاتم المرسلین کی آمد کے لئے کی گئی تھی، يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ "یعنی ایسا نبی جو ان امیون کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کرکے نکھارے" یہ نکھارنے والا آیا، اور نکھار کر دنیا کو بہار بنا گیا صلی اللہ علیہ وسلم،



امیدوارِ رحمت
سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۶ھ